

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_224972**

UNIVERSAL  
LIBRARY









سلسلہ مطبوعات ادارہ دارالاسلام (۴)

# تنقیح

اسلام اور مغربی تہذیب کا تصادم  
اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر مختصر تبصرے

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن - لاہور

مکتبہ اقصیٰ  
بین جہلی کی بنی تہذیب و تمدن

مضمون ڈاک ۳۱

قیمت بے جلد طر



سلسلہ مطبوعات ادارہ دارالاسلام (۴)

---

# تنقیح

اسلام اور مغربی تہذیب کا تضاد  
اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر مختصر تبصرے

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن - لاہور

کتاب خانہ دارالاسلام لاہور

محصول ڈاک ۳۸

قیمت بے جلد علم

# رسالہ دینیا

**رسالہ دینیات** | یہ رسالہ مانی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں و لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید سہرا اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان جوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا تہذیبی وری ہے۔ اس میں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانہ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خاصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس سالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ نیز علمائے اہل حق سے مستغنی ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو تباہیگا کہ اس میں اسلام کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔  
قیمت ۱۲ محنت و لڑاک ۲۰ خرچ وی پی ۳۲

## TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. The chief aim in view has been to present within a brief space the most systematic and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of human life on the basis of this conception and to give a comprehensive and lucid account of what this religion in reality is.

Price 1-8-0

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

- بک سرویس چان پریس ملی روڈ لاہور۔ میں طبع ہوا

سلسلہ مطبوعات ادارہ دارالاسلام (۳)

# تفہیم

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مدرسہ ترجمان القرآن

ناشر: دفتر ترجمان القرآن، ملتان روڈ لاہور

یَا هَتَمَہُ ملک محمد عارف پرنٹر  
دین محمدی پریس سرکلر روڈ لاہور طبع کرا کر  
سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ملتان روڈ لاہور سے  
شائع کی

# فہرست مضامین

|     |                                  |     |                                   |
|-----|----------------------------------|-----|-----------------------------------|
| ۱۲۴ | ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی نقض   | ۴   | دیباچہ                            |
| ۱۳۵ | ملت کی تعمیر نو کا صحیح طریقہ    | ۵   | ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب  |
| ۱۴۴ | بغاوت کا ظہور                    | ۱۷  | ہندوؤں میں اسلامی تہذیب کا انحطاط |
| ۱۵۵ | اجتماعی فساد                     | ۲۴  | دور جدید کی بیماریاں              |
| ۱۶۶ | ایمان اور اطاعت                  | ۳۴  | انسانی قانون اور الہی قانون       |
| ۱۷۲ | مسلمان "کا حقیقی مفہوم"          | ۴۷  | مغربی تہذیب کی خودکشی             |
| ۱۸۳ | مسلمان کی طاقت کا اعلیٰ منبع     | ۵۷  | لارڈ روتھین کا خطبہ               |
| ۱۹۶ | کیش مراداش کہ نہ سب گئے سفندار   | ۷۲  | ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش     |
| ۲۰۷ | مسلمان کیلئے جدیدی باپ اور لاکھل | ۸۴  | عقلیت کا فریب (۱)                 |
| ۲۲۶ | مرض اور اس کا علاج               | ۹۸  | عقلیت کا فریب (۲)                 |
|     |                                  | ۱۰۹ | تجدد کا پائے چوبیس                |

# بِسْمِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ دیباچہ

اس مجموعہ میں وہ چھوٹے چھوٹے مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں جو میں نے اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس تصادم سے پیدا شدہ مسائل پر مختلف پہلوؤں سے مختلف اوقات میں لکھے ہیں۔ ان میں غیر اسلامی اثرات اور عملوں کی کوتاہیوں پر تنقید بھی ہے، اور غلط فہمیوں میں الجھے ہوئے حقائق کی تضحیح بھی۔ جو علمی اور عملی مسائل آج کل شبہ و روز پیدا ہو رہے ہیں، ان کو حل کرنے کے لیے سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ لوگ ان کو صحیح روشنی میں دیکھیں اور خود ان کی اپنی بصیرت نگین نہ رہی اسی لیے ادارہ دار الاسلام کے علمی شعبہ کی جانب سے یہ مجموعہ ابتدا ہی میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ خیالات کے صاف کرنے میں اس کو مدد ملی جائے۔

اس مجموعہ کو ایک مسلسل اور مربوط کتاب کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اس کا ہر مضمون بجا خود مستقل ہے، البتہ ان مختلف مضامین میں ایک مقصدی ربط ضرور پایا جاتا ہے اور اسی ربط کے لحاظ سے انہیں ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔

ابوالاعلیٰ

۱۸ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ (۲۰ جون ۱۹۳۶ء)

## ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب

حکومت و فرمانروائی اور غلبہ ہندیا کی دو قسمیں ہیں ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ۔ دوسری سیاسی اور مادی غلبہ۔ پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فکری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اسی کے افکار پر ایمان لے آئیں، اسی کے تحولات، اسی کے معتقدات، اسی کے نظریات دماغوں پر چھا جائیں، ذہنیتیں اسی کے سانچے میں ڈھلیں، تہذیب اسی کی تہذیب ہو، علم اسی کا علم ہو، اسی کی تحقیق کو تحقیق سمجھا جائے اور ہر وہ چیز <sup>مطل</sup> ٹھیکرائی جائے جس کو وہ باطل ٹھیکرائے۔ دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی مادی طاقتوں کے اعتبار سے اتنی قوی بازو ہو جائے کہ دوسری قومیں اس کے مقابلہ میں اپنی سیاسی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکیں، اور کلی طور پر یا کبھی کسی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائل ثروت پر قابض اور ان کے نظم مملکت پر حاوی ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں مغلوبیت اور محکومیت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی مغلوبیت دوسری سیاسی مغلوبیت۔ ان دونوں قسموں کی صفات کو ان صفات کا عکس سمجھ لیجیے جو اوپر غلبہ کی دونوں قسموں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

یہ دونوں قسمیں ایک اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ جہاں ذہنی غلبہ ہو وہاں سیاسی غلبہ بھی ہو اور نہ یہ لازم ہے کہ جہاں سیاسی غلبہ ہو وہاں ذہنی غلبہ بھی ہو لیکن فطری قانون یہی ہے کہ جو قوم عقل و فکر سے کام لیتی اور تحقیق و اکتشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے، اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے اور جو قوم تفکر و تدبیر کے میدان میں سابقہ کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادی تنزل میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر چونکہ غلبہ نتیجہ ہے قوت کا، اور مغلوبیت نتیجہ ہے کمزوری کا، اس لیے ذہنی و مادی حیثیت سے درماندہ اور ضعیف قومیں اپنی درماندگی اور ضعف میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہیں،

اسی قدر وہ غلامی اور محکومیت کے لیے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں، اور طاقت ور ذہنی اور مادی دونوں حیثیتوں سے طاقت ور قومیں ان کے دماغ اور ان کے جسم دونوں پر حکمران ہو جاتی ہیں۔

مسلمان آج کل اسی دوسری غلامی میں مبتلا ہیں کہیں دونوں قسموں کی غلامیاں پوری طرح مسلط ہیں اور کہیں سیاسی غلامی کم اور ذہنی غلامی زیادہ ہے۔ قسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی استقلال اور خود مختاری حاصل بھی ہے، وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہیں۔ ان کے مدرسے، ان کے دفتران کے بازار، ان کی سوسائٹی اس کے گھر و حتیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبان حال سے شہادت دے لے ہیں کہ ان پر مغرب کی تہذیب و مغرب کے افکار و مغرب کے علوم و فنون حکمران ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوئے ہوئے ہیں۔ مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں۔ خواہ ان کو اس کا شعور بویا نہ ہو، بہر صورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے، اور باطل وہ ہے جس کو مغرب باطل قرار دیا ہے۔ حق، صدا، تہذیب، اخلاق، انسانیت، شائستگی، ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی، اپنے اخلاق و آداب، سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے، اسے درست سمجھتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں، فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر پوری اترائی۔ اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں کوئی علانیہ اس کو ٹھکرا دیتا، کوئی دل میں گھٹتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی کی طرح کھینچ کر ان کے مغربی معیار کے مطابق کرے۔ جب ہماری آزاد قوموں کا یہ حال ہے، تو جو مسلمان قومیں مغربی اقوام کی محکوم ہیں ان کی ذہنی غلامی کا کیا پوچھنا۔

اس غلامی کا سبب کیا ہے؟ اس کی تشریح کے لیے ایک کتاب کی وسعت و کار ہے مگر مختصر میں کو چند لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

ذہنی غلبہ تسلیم کی بنا پر مسلسل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے جو قوم اس راہ میں پیش قدمی کرتی ہے وہی دنیا کی رہنما اور قوموں کی امام بن جاتی ہے، اور اسی کے افکار دنیا پر چھا جاتے ہیں۔ اور جو قوم اس لیے پیچھے رہ جاتی ہے اسے مقلد و متبع بننا پڑتا ہے۔ اس کے افکار و عقائد میں یہ قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ ان کو پرانا تسلط قائم رکھ سکیں۔ مجتہد و محقق قوم کے طاقت و افکار و عقائد کا سیلابان کو بہا لے جاتا ہے اور ان میں امتثال ہوتا بھی نہیں رہتا کہ اپنی جگہ ہی پر ٹھہرے رہ جائیں۔ مسلمان جب تک تحقیق و اجتہاد کے میدان میں لگے بڑھتے ہیں، تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلد رہیں۔ اسلامی فکر ساری نوع انسانی کے افکار پر غالب ہی رہے۔ مسیحی نیکلی اور برہمنی غلط اور صحیح کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام دنیا کے نزدیک نیک قرار پایا، اور قہراً یا نظر اداً دنیا اپنے افکار و اعمال کو اسی معیار کے مطابق ڈھالتی رہی۔ مگر جب مسلمانوں میں ارباب فکر اور اصحاب تحقیق پیدا ہونے بند ہو گئے، جب انھوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا، تب آہستہ آہستہ اسلام اور اجتہاد فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انھوں نے خود دنیا کی بنیادی سے استعنا دیدیا۔ دوسری طرف مغربی قومیں اس راہ میں لگے بڑھیں۔ انھوں نے غور و فکر کی قوتوں سے کام لینا شروع کیا، کائنات کے راز ٹوٹے اور فطرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے خزانے تلاش کیے، اس کا لازمی نتیجہ وہی ہو جو ہون چاہیے تھا۔ مغربی قومیں دنیا کی رہنما بن گئیں، اور مسلمانوں کو اسی طرح ان کے اقتدار کے آگے تسلیم خم کرنا پڑا جس طرح کبھی دنیا نے خود ہمالیوں کے اقتدار کے آگے خم کیا تھا۔

چار پانچ سو سال تک مسلمان اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام سے سوتے رہے اور مغربی قومیں اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اس کے بعد دفعتاً مغربی اقتدار کا سیلاب اٹھا اور ایک صدی کے اندر اندر تمام سوائے زمین پر چھا گیا۔ انڈیا کے ماتے انھیں ملتے ہوئے اٹھے تو دیکھا کہ مسیحی یورپ قلم اور تلوار دونوں سے مسلح ہے، اور دونوں طاقتوں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت نے مداخلت کی کوشش کی مگر قلم کا زور تھا نہ تلوار کا۔ شکست پر شکست کھاتی چلی گئی۔ رہا قوم کا سوا داغ ظلم تو اس نے اسی سنت پر عمل کیا

جو ہمیشہ سے کمزوروں کی سنت رہی ہے۔ تلوار کے زور، استدلال کی قوت، علمی ثواب کی تائید اور نظر فریب حسن و جمال کے ساتھ جو خیالات، نظریات اور اصول مغرب کے آئے آرام طلبہ، مانگوں و مرغوب بنیادوں ان کو ایمان کا درجہ دیدیا۔ پہلے مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، اور تمدنی انہیں جو محض روایتی بنیادوں پر قائم ہو گئے تھے، اس نئے اور عاقبت وریلاب کی رو میں بہتے چلے گئے اور ایک غیر محسوس طریقے سے دونوں میں یہ مغرور وند جاگزیں ہو گیا کہ جو کچھ مغرب کا آداب وہی حق ہے اور وہی محنت و دوسخی کا معیار ہے۔

مغربی تہذیب کے ساتھ جن قوموں کا تصادم ہوا ان میں سے بعض تو وہ تھیں جن کی کوئی مستقل تہذیب نہ تھی بعض وہ تھیں جن کے پاس اپنی ایک تہذیب تو تھی مگر ایسی مضبوط نہ تھی کہ کسی دوسری تہذیب کے مقابلہ میں وہ اپنے خصائص کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتیں بعض وہ تھیں جن کی تہذیب اپنے اصول میں اس قدر دلی تہذیب کے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسی تمام قومیں تو بہت آسانی سے مغربی تہذیب کے رنگ میں لگ گئیں اور کسی شدید تصادم کی نوبت نہ آئے پائی لیکن مسلمانوں کا معاملہ ان میں سے مختلف ہے۔ یہ ایک مستقل و مکمل تہذیب کے مالک ہیں۔ ان کی تہذیب اپنا ایک مکمل مذاہب رکھتی ہے جو فکری اور علمی دونوں حیثیتوں سے زندگی کو تمام شعبوں پر حاوی ہے اور قیمتی سے مغربی تہذیب کے اسامی اصول کلیہ اس تہذیب کے مخالفت واقع ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر نہایت تباہ کن اثر پڑ رہا ہے۔

مغربی تہذیب جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی ہے وہ پانچ چھ سو سال سے دہشتہ الحاد، لامذہبی اور مادہ پرستی کی طرف جارہے ہیں۔ وہ جس تاریخ پیدا ہوئی اسی تاریخ سے مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی شروع ہو گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی ہی نے اس تہذیب کو پیدا کیا۔ اگرچہ کانائیکس آثار کا شاہدہ ان کے اسرار کی تحقیق، ان کے کلی قوانین کی دریافت، ان کے مظاہر پر غور و فکر اور ان کو ترتیب دے کر قیاس و برہان کے ذریعہ سے نتائج کا استنباط کوئی چیز بھی مذہب کی ضد نہیں ہے،

گرمسے اتفاق سے نشاۃِ جدیدہ (Renaissance) کے عہد میں جب یورپ کی نئی علمی تحریک نہما ہوئی تو اس تحریک کا مقابلہ ان عیسائی پادریوں سے ہوا جنہوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم یونانی فلسفہ و حکمت کی بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا اور جو یہ سمجھتے تھے کہ اگر جدید علمی حقیقت اور فکری اجتہاد سے ان بنیادوں میں ذرا سا بھی زلزلہ واقع ہوا تو اصل مذہب کی عمارت پویندغاںک ٹھ جائے گی اس غلط تخیل کے زیر اثر انہوں نے نئی علمی تحریک کی مخالفت کی اور اس کو روکنے کے لیے قوت سے کام لیا۔ مذہبی عدالتیں (Inquisitions) قائم کی گئیں جن میں اس تحریک کو علمبرداروں کو سخت وشیانہ اور موذناک سزائیں دی گئیں لیکن یہ تحریک ایک حقیقی بیداری کا نتیجہ تھی، اس لیے تشدد دہنے کے بجائے اور بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ حریت فکر کے سیلاب مذہبی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

ابتدائیں لڑائی حریت فکر کے علمبرازوں اور مذہبی بیٹنواؤں کے درمیان تھی مگر چونکہ مذہبی بیٹنواؤں کے نام پر آزاد خیالوں سے جنگ کر رہے تھے، اس لیے بہت جلدی اس لڑائی نے سمجھت اور آزاد خیالی کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بغیر مذہب (خواہ وہ کوئی مذہب ہو) اس تحریک کا مقابلہ قرار پا گیا۔ اس مفادک طریقہ پر سوچنے کے معنی یہ قرار پائے کہ یہ طریق فکر مذہبی طریق فکر کی عین ضد ہے۔ جو شخص اس غلط طریق سے کائنات کے مسائل پر غور کرے اس پر لازم ہے کہ مذہبی نظریہ سے ہٹ کر اپنی راہ نکالے۔ کائنات کے مذہبی نظریہ کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ عالمِ طبیعت (Physical World) کے تمام آثار اور جملہ مظاہر کی علت کسی ایسی قوت کو قرار دیا جائے جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ یہ نظریہ چونکہ جدید علمی تحریک کے دشمنوں کا نظریہ تھا، اس لیے جدید تحریک کے علمبرداروں نے لازم سمجھا کہ خدا، یا کسی مافوقِ طبیعت (Supernatural) ایسی کو فرض کیے بغیر کائنات کے معنی کو حل کرنے کی کوشش کریں اور ہر اس طریقہ کو خلافِ حکمت (Unscientific) قرار دیں جس میں خدا کا وجود فرض کر کے مسائل کائنات پر نظر کی گئی ہو۔ اس طرح نئے دور کے اہل حکمت و فلسفہ میں خدا اور روح بار و حاکمیت اور فوقِ طبیعت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہو گیا جو عقل و استدلال کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ سراسر جذبات کی برائگی کا نتیجہ تھا۔ وہ خدا سے اس لیے تبریٰ نہ کرتے تھے کہ دلائل و براہین

جو ہمیشہ سے کمزوروں کی سنت رہی ہے۔ تلوار کے زور، استدلال کی قوت، علمی شواہد کی تائید اور نظریہ فریب حسن و جمال کے ساتھ جو خیالات، نظریات اور اصول مغرب کے آئے آرام طلبہ، مانگوں و مرغوب ہندوؤں نے ان کو ایمان کا درجہ دیدیا۔ پہلے مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، اور تمدنی ائین جو محض روایتی بنیادوں پر قائم ہو گئے تھے، اس نئے اور طاقت ور سیلاب کی رو میں بہتے چلے گئے اور ایک غیر محسوس طریقے سے دونوں میں یہ مفرقہ بنا کر میں ہو گیا کہ جو کچھ مغرب آتا ہے وہی حق ہے اور وہی محنت و درستی کا معیار ہے۔

مغربی تہذیب کے ساتھ جن قوموں کا تصادم ہوا ان میں سے بعض تو وہ تھیں جن کی کوئی مستقل تہذیب نہ تھی بعض وہ تھیں جن کے پاس اپنی ایک تہذیب تو تھی مگر ایسی مضبوط نہ تھی کہ کسی دوسری تہذیب کے مقابلہ میں وہ اپنے خصائص کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتیں بعض وہ تھیں جن کی تہذیب اپنے اصول میں اس آگے والی تہذیب کے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسی تمام قومیں تو بہت آسانی سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ لگ گئیں اور کسی شدید تصادم کی نوبت نہ آنے پائی لیکن مسلمانوں کا معاملہ ان سے مختلف ہے۔ یہ ایک مستقل و مکمل تہذیب کے مالک ہیں۔ ان کی تہذیب اپنا ایک مکمل نمائندہ رکھتی ہے جو فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے زندگی کو تمام شعبوں پر حاوی ہے اور قیمتی سے مغربی تہذیب کے اس اسی اصول کلیہ اس تہذیب کے خلاف واقع ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہی ہیں اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر نہایت تباہ کن اثر پڑ رہا ہے۔

مغربی تہذیب جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی ہے وہ پانچ چھ سو سال سے دہشتہ اتحاد، لائسنسی اور مادہ پرستی کی طرف جارہے ہیں۔ وہ جس تاریخ پیدا ہوئی اسی تاریخ سے مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی شروع ہو گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی ہی نے اس تہذیب کو پیدا کیا۔ اگرچہ کانائٹس آثار کا شاہدہ ان کے اسرار کی تحقیق، ان کے کلی قوانین کی دریافت، ان کے مظاہر پر غور و فکر اور ان کو ترتیب دے کر قیاس و برہان کے ذریعہ سے نتائج کا تعینا ط کوئی چیز بھی مذہب کی ضد نہیں ہے،

مگر سچے اتفاق سے نشاۃِ جدیدہ (Renaissance) کے عہد میں جب یورپ کی نئی علمی تحریک نے مائوٹی تو اس تحریک کا مقابلہ ان عیسائی پادریوں سے ہوا جنہوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم یونانی فلسفہ و حکمت کی بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا اور جو یہ سمجھتے تھے کہ اگر عیسائی تحقیق اور فکری اجتہاد سے ان بنیادوں میں ذرا سا بھی زلزلہ واقع ہوا تو اس مذہب کی عمارت پویند خاک میں جاوے گی اس غلط خیال کے زیر اثر انہوں نے نئی علمی تحریک کی مخالفت کی اور اس کے روکنے کے لیے قوت سے کام لیا۔ مذہبی عدالتیں (Inquisitions) قائم کی گئیں جن میں اس تحریک کو علبرداروں کو سخت و خیانہ اور موہناک سزائیں دی گئیں لیکن یہ تحریک ایک حقیقی بیداری کا نتیجہ تھی، اس لیے تدریجاً دینے کے بجائے اور بڑھتی چلی گئی تھی کہ حریت فکر کے سیلاب نے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

ابتداء میں لڑائی حریت فکر کے علبرداروں اور مذہبی مینوٹوں کے درمیان تھی مگر چونکہ مذہبی مینوٹوں کا مذہب نام پر آزاد خیالوں سے جنگ کر رہے تھے، اس لیے بہت جلدی اس لڑائی نے سمیٹ اور آزاد خیالی کے دریا جنگ کی صورت اختیار کر لی اس کے بغیر مذہب (خواہ وہ کوئی مذہب ہے) اس تحریک کا مد مقابل قرار پا گیا۔ اس متفکر طریقہ پر سوچنے کے معنی یہ قرار پائے کہ یہ طریق فکر مذہبی طریق فکر کی عین ضد ہے جو شخص اس متفکر طریق سے کائنات کے مسائل پر غور کرے اس پر لازم ہے کہ مذہبی نظریہ سے ہٹ کر اپنی راہ نکالے۔ کائنات کے مذہبی نظریہ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ عالم طبیعت (Physical World) کے تمام آثار اور جملہ مظاہر کی علت کسی ایسی قوت کو قرار دیا جائے جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ یہ نظریہ چونکہ جدید علمی تحریک کے دشمنوں کا نظریہ تھا، اس لیے جدید تحریک کے علبرداروں نے لازم سمجھا کہ خدا، یا کسی مافوق طبیعت (Supernatural) ایسی کو فرض کیے بغیر کائنات کے معنی کو حل کرنے کی کوشش کریں اور ہر اس طریقہ کو خلاف حکمت (Unscientific) قرار دیں جس میں خدا کا وجود فرض کر کے مسائل کائنات پر نظر کی گئی ہو۔ اس طرح نئے دور کے اہل حکمت و فلسفہ میں خدا اور روح یا روحانیت اور فوق طبیعت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہو گیا جو عقل و استدلال کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ سراسر جذبات کی براہِ نگینگی کا نتیجہ تھا۔ وہ خدا سے اس لیے تبریٰ نہ کرتے تھے کہ دلائل و براہین

اس کا عدم وجود اور عدم وجوب ثابت ہو گیا تھا، بلکہ اس سے اس لیے ہزار تھے کہ وہ ان کے اور ان کی آزاد خیال کے دشمنوں کا معبود تھا۔ بعد کی پانچ صدیوں میں ان کی عقل و فکر اور ان کی علمی جدوجہد نے جتنا کام کیا اس کی بنیاد میں یہی غیر عقلی جذبہ تھا۔

مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس دونوں نے جب سفر شروع کیا تو اگرچہ ان کا رخ خدا پرستی کے بالکل مخالف سمت میں تھا تاہم چونکہ وہ مذہبی ماحول میں گھرے ہوئے تھے اس لیے وہ ابتداً نیچریت (Naturalism) کو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ نباتت رہے۔ مگر جوں جوں وہ اپنے سفر میں آگے بڑھتے گئے، نیچریت خدا پرستی پر غلبہ آتی چلی گئی حتیٰ کہ خدا کا تخیل، اور خدا کے ساتھ ہر اس چیز کا تخیل جو عالم طبیعت سے بالاتر ہو، ان سے بالکل غائب ہو گیا، اور وہ اس انتہا پر پہنچ گئے کہ مادہ و حرکت کے سوا کوئی شے ان کے نزدیک حقیقی نہ رہی، سائنس نیچریت کا ہم معنی قرار پایا اور اہل حکمت و فلسفہ کا ایمان اس نظریہ پر قائم ہو گیا کہ ہر چیز جو مادی اور فانی نہیں جاسکتی اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

مغربی فلسفہ و سائنس کی تاریخ اس بیان کی شاہد ہے۔ ڈی کارٹ (Descartes) موتنی ۱۶۵۷ء جو مغربی فلسفہ کا آدم سمجھا جاتا ہے ایک طرف تو خدا کا زبردست قائل ہے، اور مادہ کے ساتھ روح کا مستقل موجود بھی مانتا ہے، مگر دوسری طرف وہی ہے جس نے عالم طبیعت کے آثار کی توجیہ مکانیکی (Mechanical) طریق پر کرنے کی ابتدا کی اور اس طریق فکر کی بنا رکھی جو بعد میں سراسر مادہ پرستی (Materialism) بن گیا۔ ہابز (Hobbes) ۱۶۵۹ء اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کہ فوق الطبیعت (Supernatural) کی کلمہ کھلا مخالفت کرتا ہے، نظام عالم اور اس کی ہر شے کو میکانیکی توجیہ کے قابل قرار دیتا ہے، اور کی بنیادی باروجی یا عقلی قوت کے قائل نہیں ہے جو اس مادی دنیا میں تصرف کرنے والی ہو مگر اس کے ساتھ ہی وہ خدا کو بھی مانتا ہے، اس جہیز سے کہ ایسی ایک علت العلل کا ماننا ایک عقلی ضرورت ہے۔ اسی زمانہ میں اسپینوزا (Spinoza) ۱۶۷۷ء اٹھارہ سو تیرہویں صدی میں عقلیت (Rationalism) کا سب سے بڑا علمبردار تھا

اس نے مادہ اور روح اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا، خدا اور کائنات کو ملا کر ایک کل بنا دیا، اور اس کل میں خدا کے اختیار مطلق کو تسلیم نہ کیا۔ لائبنتز (Leibnitz) ہم مسئلہ اور لاک (Locke) ہم مسئلہ خدا کے قابل تھے، مگر دونوں کا میلان نیچریت کی جانب تھا۔

یہ سترہویں صدی کا فلسفہ تھا جس میں خدا پرستی اور نیچریت دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ یہی طرح سائنس نے بھی سترہویں صدی تک مکمل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ کوپرنیکس (Copernicus) کیلر (Kepler) گیلیلیو (Galileo) نیوٹن (Newton) اور سائنس کے دوسرے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا۔ مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الہی نظریہ سے قطع نظر کر کے اُن قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے جو اس نظام کو چلا رہی ہیں اور اُن قوانین کو معلوم کرنے کے خواہشمند تھے جن کے تحت یہ نظام چل رہا ہے۔ یہ الہی نظریہ سے قطع نظر کرنا ہی دراصل اُس دہریت اور نیچریت کا خم تھا جو بعد میں حریت فکر کے درخت سے پیدا ہوئی لیکن سترہویں صدی کے حکماء کو اس کا شعور نہ تھا۔ وہ نیچریت اور خدا پرستی میں کوئی خط امتیاز نہ کھینچ سکے اور یہی سمجھتے رہے کہ یہ دونوں ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں حقیقت نمایاں ہو گئی کہ جو طریق فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کر کے نظام کائنات کی جستجو کرے گا وہ مادیت، بے دینی اور الحاد تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا۔ جین جان لئیڈ (John Toland)

ڈیوڈ ہارٹلی (David Hartley) جوزف پرائیٹلی (Joseph Priestley) وولٹیئر (Voltaire)

لامیٹری (La Mettrie) ہولباخ (Holbach) کیبانیس (Cabanis) ڈنيس ڈائسٹریو

(Denis Diderot) مانٹسکیو (Montesquieu) روسو (Rousseau) اور ایسے ہی دوسرے

آزاد خیال فلاسفہ و حکماء پیدا ہوئے جنہوں نے یا تو علانیہ خدا کے وجود سے انکار کیا، یا اگر بعض نے اسے تسلیم

کیا بھی تو اس کی حیثیت ایک دستوری فرمانروا (Constitutional Monarch) سے زیادہ نہ سمجھی

جو نظام کائنات کو ایک مرتبہ حرکت میں لے آنے کے بعد گوشہ نشین ہو گیا ہے اور اب اس نظام کے چلائیں

اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ لوگ علم طبیعت، اور دنیا کے مادہ و حرکت کے باہر کسی چیز کے وجود کو ماننے کے لیے طیار نہ تھے اور ان کے نزدیک حقیقت صرف انہی چیزوں کی تھی جو ہمارے مشاہدہ و تجربہ میں آتی ہیں۔ ہوم (Hume) نے اپنی تجربیت (Empiricism) اور فلسفہ تشکیک (Scepticism) سے اس طریق فکر کی زبردست تائید کی، اور عقولات کی صحت کے لیے بھی تجربہ ہی کو معیار قرار دینے پر زور دیا۔ برکلی (Berkeley) نے مادیت کی اس بڑھتی ہوئی رو کا جان توڑ مقابلہ کیا مگر وہ اس کو نہ روک سکا۔ ہیگل (Hegel) نے مادیت کے مقابلہ میں تصوریت (Idealism) کو فروغ دینا چاہا مگر ٹھوس مادے کے مقابلہ میں لطیف تصور کی پریش نہ ہوئی۔ کانٹ (Kant) نے بیچ کی راہ یہ نکالی کہ خدا کی ہستی، روح کا بقاء، اور ارادہ کی آزادی ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جو ہمارے علم میں آسکیں۔ یہ چیزیں جانی نہیں جاسکتیں۔ تاہم ان پر ایمان لایا جاسکتا ہے اور حکمت عملی (Practical Wisdom) اس کی مقتضی ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے۔ یہ خدا پرستی اور نیچریت کے درمیان مصالحت کی آخری کوشش تھی لیکن ناکام ہوئی کیونکہ جب عقل و فکر کی گمراہی نے خدا کو محض وہم کی پیداوار یا حد سے حد ایک مہطل اور بے اختیارستی قرار دے لیا تو محض اخلاق کی حفاظت کے لیے اس کو ماننا، اس سے ڈرنا، اور اس کی خوشنودی چاہنا، ہر اس ایک غیر عاقلانہ فعل تھا۔

انیسویں صدی میں مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ فوگت (Vogt) بوخنر (Buchner) تسولے (Czölbe) کومت (Comte) مولشات (Moleschotte) اور دوسرے حکماء و فلاسفہ نے مادہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ مل (Mill) نے فلسفہ تجربیت، اور اخلاق میں افادیت (Utilitarianism) کو فروغ دیا۔ اسپنسر (Spencer) نے فلسفیانہ ارتقایت اور نظام کائنات کے خود بخود پیدا ہونے اور زندگی کے آپس آپ دینا ہو جانے کا نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ حیاتیات (Biology) عضویات (Physiology) زمینیات (Geology) اور حیوانیات (Zoology)

کے اکتشافات، عملی سائنس کی ترقی اور مادی وسائل کی کثرت نے یہ خیال پوری پختگی کے ساتھ دلوں میں راسخ کر دیا کہ کائنات آپسے آپ جوڑ میں آئی ہے کسی نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ آپسے آپ لگے بندھے قوانین کے تحت چل رہی، کوئی اس کو جلانے والا اور ان قوانین کا نفاذ کرنے والا نہیں ہے۔ آپسے آپ ترقی کے منازل طے کرتی رہی ہے، کسی فوق الطبیعت ہستی کا ہاتھ اس خود بخود حرکت کرنے والی مشین میں کام نہیں کر رہا ہے۔ بے جان مادے میں جان کسی کے امر سے نہیں پڑتی، بلکہ خود مادہ جب اپنے نظم میں ترقی کرتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ نو، حرکت ارادی، احساس، شعور، فکر، سبھی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں حیوان اور انسان سب کے مشتبہ نہیں ہیں جو طبیعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں پر جس طرح سے تربیت پاتے ہیں اسی طور کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں ان میں کوئی اختیار اور کوئی آزاد ارادہ (Free-will) نہیں ہے ان کے نظام کا درجہ ہم ہوجانا، ان کی انرجی کا خرچ ہوجانا ہی ان کی موت ہے جو فکائے محض کی ہم معنی ہے۔ جب مشین ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کے خواص بھی باطل ہو گئے۔ اب ان کے لیے حشر اور بار دیگر پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

دارون کے نظریہ ارتقائے انسان پر مبتدا وراثیت کو تو حکام بخشنے، اور لیکٹل اور عظیم علی نظریہ بنیت زمینے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) جو ۱۸۵۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی، سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے والی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس ایک ایسے طریق استدلال سے جو انیسویں صدی کے سائنٹفک دماغوں کے نزدیک استدلال کا حکم ترین طریقہ تھا، اس نظریہ پر ہر تصدیق ثبت کر دی کہ کائنات کا کاروبار خدا کے بغیر چل سکتا ہے، آثار و مظاہر فطرت کیلئے خود فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور علت کی حاجت نہیں، زندگی کے ادنیٰ مراتب سے کرا علیٰ مراتب تک موجودات کا ارتقاء ایک ایسی فطرت کے تدریجی عمل کا نتیجہ ہے جو عقل و حکمت کے جوہر سے عاری ہے، انسان اور دوسری انواع حیوانی کو پیدا کرنے والا کوئی صانع حکیم نہیں ہے، بلکہ وہی ایک جائز شین جو

کبھی کیڑے کی شکل میں رہیگا کرتی تھی، تنازع البقاء، بقا صالح، اور انتخاب طبعی کے نتیجہ کے طور پر بڑی شعور اور ناطق انسان کی شکل میں نمودار ہو گئی۔

یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ اس میں نہ کسی عظیم و قدیر خدا کے خوف کی گنجائش ہے، نہ نبوت اور وحی والہام کی ہدایت کا کوئی وزن، نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور، نہ حیاتِ نیا کے حساب کتاب کا کوئی کھٹکا، نہ انسان کی ذاتی ذمہ داری کا کوئی سوال، نہ زندگی کے حیوانی مقاصد بالاتر کسی مقصد اور کسی نصب العین کا کوئی امکان۔ یہ خالص مادی تہذیب ہے۔ اس کا پورا نظام خداترسی، راستی، صداقت پسندی، حق جوئی، حسن اخلاق، دیانت، امانت، نیکی، حیا، پرہیزگاری، اور پاکیزگی کے ان تصورات سے خالی ہے جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نظریہ اسلام کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ اس کا راستہ اُس راستہ کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے اُن کو یہ تہذیب بیخ و بن سے اکھاڑوینا چاہتی ہے، اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی عمارت قائم کرتی ہے، اُن پر اسلام کی عمارت ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی پر سوار ہو گا اسے لا محالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور جو بیک وقت ان دونوں پر سوار ہو گا اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔

اس کو بدقسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہی تہذیب اپنی ماؤہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لے کر مشرقِ اقصیٰ تک تمام اسلامی ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار اور حکمانہ استیلا سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور قلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا۔ جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبہ سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو چکے تھے اُن کے لیے شکل ہو گیا کہ مغرب کے فلسفہ و سائنس اور ان کی پروردہ تہذیب کے رعبِ دابے محفوظ رہتے خصوصیت کے ساتھ ان مسلمان قوموں

کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو براہِ راست کسی مغربی سلطنت کے زیرِ حکم آگئی تھیں ان کو اپنے ذہنی مفاد کی حفاظت کے لیے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے اور چونکہ تحصیلِ علم خاص تحصیلِ علم کی خاطر تھی اور مزید آج ایک مغربی ہنر کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا گیا تھا، اس لیے مسلمانوں کی نئی نسلیں نے تہذیب کے ساتھ مغربی افکار اور سائنسوں کی نظریات کا اثر قبول کیا۔ ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں جھڑتی چلی گئیں۔ ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا۔ ان میں وہ ناقضانہ نظر پیدا ہی نہیں ہوئی جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے اور صرف صحیح کو اختیار کرتے۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ پیدا ہوئی کہ آزادی اور استقلال کے ساتھ غور و فکر کرتے اور اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی رائے قائم کرتے۔ اسی کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لہائی تہذیب جن بنیادوں پر قائم ہے وہ متزلزل ہو گئی ہیں۔ ذہنیوں کا وہ سانچہ ہی بگڑ گیا ہے جس سے اسلامی طریق پر پوچھا اور سمجھا جاسکتا تھا مغربی طریق پر سوچنے اور مغربی تہذیب کے اصولوں پر اعتقاد رکھنے والے دماغوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں اسلام کے اصول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے اور جب اصول ہی اس میں نہیں سما سکتے تو فروغ میں طرح طرح کے شبہات اور نت نئے شکوک پیدا ہونا ہرگز قابلِ تعجب نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور سلمان رہنا چاہتا ہے لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سیاسی غلبہ و استیلا سے قطع نظر مغرب کا علمی اور فکری دُاف تسلط دنیا کی ذہنی فضا پر چھایا ہوا ہے اور اس نے نگاہوں کے زاویے اس طرح بدل دیے ہیں کہ دیکھنے والوں کے لیے مسلمان کی نظر سے دیکھنا اور سوچنے والوں کے لیے اسلامی طریق پر سوچنا مشکل ہو گیا ہے۔ ایشیال اس وقت تک دور نہ ہوگا جب تک مسلمانوں میں آزاد اہل فکر پیدا نہ ہوں گے۔ اسلام میں ایک نشاۃِ جدیدہ (Renaissance) کی ضرورت ہے۔ پرانے اسلامی مفکرین و متحققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا دنیا اب بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ اس کو اب ایسے پاؤں اُن منازل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں ہے

جن کو چھ سو برس پہلے گندہ بچی جو علم و عمل کے میدان میں مہمانی وہی کر سکتا، موجود دنیا کو لگے کی چٹا چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔  
 لہذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا، تو اس کی بس ہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں  
 جو فکر و نظر و تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھادیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی ہے قرآن  
 کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر ان کے شاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نیا نظام فلسفہ کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا  
 نتیجہ ہو۔ ایک نئی حکمتِ طبیعی (Natural Science) کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی دلی ہوتی دلغ بیل پر اٹھے۔  
 نظریہ کو توڑ کر الہی نظریہ پر فکر و تحقیق کی اساس قائم کریں اور اس جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں  
 کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور دنیا میں مغرب کی مادی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقیقی تہذیب جلوہ گر ہو۔  
 یہ کچھ کہا گیا، اس کے مقصد و معاونت کے لیے ہمیشہ اسی رخ پر سفر کرتی رہیں۔ یہ گامی ہمیشہ اسی رخ پر ڈرائیوئرس کو چلاتی ہیں۔ جو  
 لوگ اس میں بیٹھے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اسی طرف جائیں جس طرف گامی جاری ہو خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ چاہیں۔  
 اگر اس گامی میں کوئی ایسا مسافر بیٹھا ہے جو اس راہ پر نہیں جانا چاہتا تو وہ اس زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ چلتی ہوئی گامی ہی  
 میں بیٹھے بیٹھے اپنی نشست کا رخ تنگ کے بجائے پچھے یا دائیں یا بائیں پھیرے۔ مگر نشست کا رخ بدل دینے سے وہ اپنے سفر کا رخ  
 نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رخ بدلنے کی صورت اس کے مو اور کوئی نہیں کہ ان پر قبضہ کیا جاوے اس کی رفتار کو اس جانب پھیر دیا جائے جو  
 مطلوب ہے۔ اس وقت جو لوگ انجن پر قابض ہیں وہ سب خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور فکر اسلامی سے بے بہرہ ہیں اس لیے  
 گامی اپنے مسافروں کو یہ ہوئے اتحاد اور مادہ ہستی کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہو اور سب مسافروں کا کرنا اسلام کی منزل  
 مقصود دور اور دور تر گتے چلے جا رہی ہیں۔ اب اس رفتار کو بدلتے کے لیے ضرورت ہے کہ خدا پرستوں میں سے کچھ باہمت و  
 اٹھیں اور جدوجہد کر کے ان کو ان میں کی باتوں سے بچھین لیں۔ جب تک یہ نہ ہوگا، گامی کا رخ نہ بدلاگا اور ہمارے چھٹلانے  
 لگنے اور شور مچانے کے باوجود وہ اسی راہ پر سفر کرتی رہے گی جس پر خدا شناس ڈرائیوئرس کو چلا رہے ہیں۔

## ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط

دنیا سے اسلام کا بیشتر حصہ ان ممالک پر مشتمل ہے جو صدر راول کے مجاہدین کی کوششوں سے فتح ہوئے ہیں۔ ان کو جن لوگوں نے فتح کیا تھا وہ ملک گیری اور حصولِ غنائم کے لیے نہیں بلکہ خدا کے کلمہ کو دنیا میں بلند کرنے کے لیے سروں سے کفن باندھ کر نکلتے تھے۔ وہ طلبِ دنیا کے بجائے طلبِ آخرت کے نشہ میں سرشار تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مفوجین کو نطیع و باج گزار بنانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ انھیں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔ ان کی پوری آبادی یا اس کے سوا غلام کو ملتِ صفی میں جذب کر لیا۔ علم و عمل کی قوت سے ان میں اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کو اتنا راسخ کر دیا کہ وہ خود تہذیبِ اسلامی کے علمبردار اور علومِ اسلامی کے معلم بن گئے۔ ان کے بعد وہ ممالک ہیں جو اگرچہ صدر راول کے بعد اس عہد میں فتح ہوئے جبکہ اسلامی جوش سرد ہو چکا تھا اور فاضلین کے دلوں میں خالص جہاد فی سبیل اللہ کی روح سے زیادہ ملک گیری کی ہوس نے جگہ لے لی تھی، لیکن اس کے باوجود اسلام وہاں پھیلنے اور جڑ بکڑ لینے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے ان ممالک میں کلیئہً ایک قومی مذہب اور قومی تہذیب کی حیثیت حاصل کر لی۔

بقسمتی سے ہندوستان کا معاملہ ان دونوں قسم کے ممالک سے مختلف ہے۔ صدر راول میں اس ملک کا بہت تھوڑا سا حصہ فتح ہوا تھا اور اس تھوڑے سے حصہ پر بھی جو کچھ اسلامی تعلیم و تہذیب کے اثرات پڑے تھے ان کو باطنیت کے سیلاب نے ملیا میٹ کر دیا یا اس کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا اصلی سلسلہ شروع ہوا تو فاتحوں میں صدر راول کے مسلمانوں کی خصوصیت باقی نہیں رہی تھیں۔ انھوں نے یہاں اشاعتِ اسلام کے بجائے توسیعِ مملکت میں اپنی توتیں صرف کیں اور لوگوں سے اطاعتِ خدا و رسول کے

جائے اپنی اطاعت اور باج گزاری کا مطالبہ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی فرمانروائی کے بعد بھی ہندوستان کا سوادِ عظیم غیر مسلم رہا، یہاں اسلامی تہذیب جڑ نہ پکڑ سکی، یہاں کے باشندوں میں سے جنہوں نے اسلام قبول کیا ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی خاص انتظام نہ کیا گیا، نو مسلم جماعتوں میں قدیم ہندو مذہبی خیالات اور رسم و رواج کم و بیش باقی رہے، اور خود باہر کے آئے ہوئے قدیم الاسلام مسلمان بھی اہل ہند کے میل جول سے مشرکانہ طریقوں کے ساتھ رواداری برتنے اور بہت سی جاہلانہ رسوم کا اتباع کرنے لگے۔

اسلامی ہند کی تاریخ اور اس کے موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس زمانہ میں اس ملک پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پوری قوت سے چھایا ہوا تھا اس زمانہ میں بھی یہاں اسلام کے اثرات کمزور تھے اور یہاں کا ماحول خالص اسلامی ماحول نہ تھا اگرچہ ہندوؤں کا مذہب اور تمدن بالذات ضعیف تھا اور محکوم و مغلوب قوم کا مذہب و تمدن ہونے کی حیثیت سے اور بھی زیادہ ضعیف ہو گیا تھا، لیکن پھر بھی مسلمان حکمرانوں کی رواداری اور غفلت کی بدولت وہ ملک کے سوادِ عظیم پر چھایا ہوا رہا اور ہندوستان کی فضا پر اس کے مستولی ہونے اور خود مسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ طے عقائد اور اپنی تہذیب میں کبھی اصلاح اور بہتر اور کامل مسلمان نہ ہو سکا جتنا وہ خالص اسلامی ماحول میں ہو سکتا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھین گیا جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا سہارا تھا پہلے مسلمانوں کی سلطنت متفرق ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوئی پھر مرہٹوں اور سکھوں اور انگریزوں کے سیلانے ایک ایک کر کے ان ریاستوں میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا۔ اسکے بعد قضاۃ الہی نے انگریزوں کے حق میں اس ملک کی حکومت کا فیصلہ صادر کیا اور ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزرا تھا کہ مسلمان اس سرزمین میں مغلوب و محکوم ہو گئے جس پر انہوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔ انگریزی سلطنت جتنی جتنی پھیلی گئی مسلمانوں سے ان طاقتوں کو چھینتی چلی گئی جن کے بل پر ہندوستان میں اسلامی تہذیب کسی حد تک

قائم تھی۔ اس نے فارسی اور عربی کے بجائے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا، اسلامی قوانین کو منسوخ کیا، شرعی عدالتیں توڑ دیں، دیوانی اور فوجداری معاملات میں خود اپنے قوانین جاری کیے، اسلامی قانون کے نفاذ کو خود مسلمانوں کے حق میں صرف نکاح و طلاق وغیرہ تک محدود کر دیا اور اس محدود نفاذ کے اختیارات بھی مسلمان قاضیوں کے بجائے عام دیوانی عدالتوں کے سپرد کر دیے جن کے حکام عموماً غیر مسلم ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں ”ٹھن“ روز بروز سنخ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ابتدا سے انگریزی حکومت کی یہ پالیسی رہی کہ مسلمانوں کو ماباشی جینیت سے پامال کر کے ان کے اس قومی فخر و ناز کو کچل ڈالے جو ایک حاکم قوم کی حیثیت صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر اس پالیسی کی بدولت اس قوم کو مفلس و جاہل و پست خیال، فاسد الاخلاق، اور ذلیل و خوار کر کے چھوڑا گیا۔

اس گرتی ہوئی قوم پر آخری ضرب وہ تھی جو عہد کے ہنگامہ میں لگی۔ اس نے مسلمانوں کی صرف سیاسی قوت ہی کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ ان کی ہمتوں کو توڑ دیا، ان کے دلوں پر مایوسی اور احساسِ ذلت کی تاریکیاں مسلط کر دیں، ان کو انگریزی اقتدار سے اتنا مرعوب کیا کہ ان میں قومی خودداری کا شائبہ تک باقی نہ رہا، اور ذلت و خواری کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچ کر وہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ دنیا میں سلامتی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی اطاعت، عزت حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی خدمت، اور ترقی کرنے کا ذریعہ انگریز کی تقلید کے سوا اور کوئی نہیں ہے، اور ان کا اپنا سرمایہ علم و تہذیب جو کچھ بھی ہے ذلیل، سببِ ذلت اور موجبِ نکبت ہے۔

انیسویں صدی کے نصف دوم میں جب مسلمانوں نے سنبھل کر پھر اٹھنے کی کوشش کی تو وہ دو قسم کی کمزوریوں میں مبتلا تھے:-

ایک یہ کہ وہ فکر و عمل کے اعتبار سے پہلے ہی اسلامی عقائد اور تہذیب میں پختہ نہ تھے اور ایک غیر اسلامی ماحول اپنے جاہلی افکار اور تمدن کے ساتھ ان کو گھیرے ہوئے تھا۔

دوسرے یہ کہ غلامی اپنے تمام محائب کے ساتھ نہ صرف ان کے جسم پر بلکہ ان کے قلب و روح پر بھی مسلط ہو چکی تھی اور وہ ان تمام قوتوں سے محروم کر دیئے گئے تھے جن سے کوئی قوم اپنے تمدن و تہذیب کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ اس دوسری کمزوری کی حالت میں مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انھیں نظر آیا کہ انگریزی سلطنت نے اپنی ہوشیاری سے معاشی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں اور ان کی کبھی انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں رکھ دی ہے۔ اب مسلمانوں کیلئے اسکے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں جتنا پھر مروجہ سرسید حضرات کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک اٹھی جس کے اثر سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا۔ پرانے لوگوں کی مخالفت بے کار ثابت ہوئی۔ دولت، عزت اور اثر کے لحاظ سے قوم کی اصلی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی انھوں نے اس نئی تحریک کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کے مسلمان تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھے۔ قوم کا پلٹھٹ پرانے مذہبی مدرسوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تاکہ مسجدوں کی اہمیت اور مکتبوں کی عملی کے کام آئے، اور خوشحال طبقوں کے بہترین نوہنال انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیئے گئے تاکہ ان کے دل و دماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم و فنون کے نقوش ثبت کیے جائیں۔

یہ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی کا زمانہ تھا۔ یورپ میں اس وقت مادیت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اٹھارہویں صدی میں سائنس پوری طرح مذہب کو شکست دے چکا تھا۔ جدید فلسفہ اور نئے علوم حکمت کی رہنمائی میں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے پلنے نظریے پل ہو کر نئے نظریے قائم ہو چکے تھے۔ یورپ میں ایک خاص تہذیب پیدا ہو چکی تھی جس کی بنیاد کلیۃً انہی جدید نظریوں پر قائم تھی اس انقلاب عظیم نے زندگی کے عملی معاملات سے تو مذہب اور ان اصولوں کو جو مذہبی رہنمائی پر مبنی تھے کلی طور پر خارج کر ہی دیا تھا۔ البتہ تخیل کی دنیا میں مذہبی اعتقاد کی تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی تھی سو اس کے خلاف زبردست جنگا رہی تھی اگرچہ علوم حکمت میں کسی علم نے بھی کائنات کے الہی نظریہ کے خلاف کوئی ثبوت جس کو ثبوت کہا جاسکتا ہو، ہم نہیں پہنچایا تھا۔ مگر اہل حکمت بغیر کسی دلیل کے محض اپنے دجھان طبیعت کی بنا پر خدا ویز اور الہی نظریہ کے دشمن تھے اور جو کچھ انہی

اس وقت دنیا کی عقلی و عملی امامت کا منصب حاصل تھا اس لیے ان کے اثر سے خدا سے بیزاری (Theophobia) کا مرض ایک عام وبا کی طرح پھیل گیا۔ وجود باری کا انکار، کائنات کو آپ پیدا ہونے والی اور آپ آپ قوانین طبیعی کے تحت چلنے والی چیز سمجھنا، خدا پرستی کو توہم (Superstition) قرار دینا، مذہب کو لغو اور مذہبیت کو تنگ نظری و تاریک خیالی کہنا، اور نیچریت (Naturalism) کو روشن خیالی کا ہم معنی سمجھنا اس وقت فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔ شخص خواہ وہ فلسفہ و سائنس میں کچھ بھی دستگاہ نہ رکھتا ہو اور اس نے خود ان مسائل کی تحقیق میں ذہن برباد بھی کوشش نہ کی ہو، صرف اس بنا پر ان خیالات کا اظہار کرتا تھا کہ سوسائٹی میں وہ ایک روشن خیال آدمی سمجھا جائے۔ روحانیات (Spiritualism) یا فوق الطبیعیات (Supernatural) کی تائید میں کچھ کہنا اس وقت کفر کا درجہ رکھتا تھا۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا سائنس داں بھی اس قسم کے کسی خیال کا اظہار کرتا تو سنگسار حلقوں میں اس کی ساری وقعت جاتی رہتی، اس کے تمام کارناموں پر پانی پھر جاتا اور وہ اس قابل نہ رہتا کہ اسے کسی علمی جماعت کی رکنیت کا شرف بخشا جائے۔

۱۸۵۹ء میں ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) شائع ہوئی جس نے نیچریت اور دہریت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اگرچہ ڈارون کے دلائل جو اس نے اپنے مخصوص نظریہ ارتقا کی تائید میں پیش کیے تھے، کمزور اور محتاج ثبوت تھے۔ اس کے سلسلہ ارتقا میں ایک کڑی نہیں بلکہ ہر موجود کو اس کے آگے اوپر پیچھے بہت سی کڑیاں مغمود تھیں۔ اہل حکمت اس وقت بھی اس نظریے سے مطمئن نہ تھے حتیٰ کہ خود اس کا سب سے بڑا وکیل ہیکلے (Huxley) بھی اس پر ایمان نہ لایا تھا۔ مگر اس کے باوجود محض خدا سے بیزاری کی بنا پر ڈارونیت کو قبول کر دیا گیا، اس کی حد سے زیادہ تشہیر کی گئی اور مذہب کے خلاف ایک زبردست آواز کے طور پر اسے سہاوا لگایا گیا۔ کیونکہ اس نظریہ نے اہل حکمت کے زعم باطل میں اس دعویٰ کا ثبوت فراہم کیا تھا حالانکہ دراصل ایک دعویٰ کیا تھا جو محتاج ثبوت تھا کہ کائنات کا نظام کسی فوق الطبیعی قوت کے بغیر خود بخود طبیعی قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ اہل مذہب نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور بڑا سائنس دان ایسوی ایشن کے حل میں بشپ آف آکسفورڈ اور گلڈ سٹن نے

اپنی خطابت کا پورا زور اس خلاف صرف کیا، مگر شکست کھائی اور آخر کار اہل مذہب یا متشکک نہریت سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ۸۸۲ء میں جب ڈارون نے وفات پائی تو جرج آف انگلینڈ نے وہ سب بڑا اعزاز اس کو بخشا جو اس کے اختیار میں تھا یعنی لے ویٹ منسٹری میں دفن کرنے کی اجازت ہی حالانکہ وہ پوتہ میں مذہب کی قبر کھودنے والوں کا سرخیل تھا اور اس نے افکار کو اتحاد و زندہ اوبے دینی کی طرف چلانے اور وہ ذہنیت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا جس نے آخر کار بولشوزم اور فاشزم کو پھیلنے بھونکنے اور بار آور ہونے کا موقع دیا۔

یہ زمانہ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کے لیے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کوئے، اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رخ مذہب سے پھر گیا کیونکہ اس آف ہوا کی اولین تاثیر یہ تھی کہ پورے کئی صنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامل اُمتاً و صدقاً کہیں اور قرآن و حدیث یا ائمہ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان بانڈ ہے اور وہاں سر سے اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں۔ اسلام کا پورا نظام تہذیب جی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور وہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ اسلام میں آخرت کا اعتقاد پورے نظام اخلاق کا سنگ بنیاد ہے اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے، اسلام میں عبادت اور اعمال فرض ہیں وہاں وہ محض عہد جاہلیت کے روم ہیں جن کا اب کوئی عملی فائدہ نہیں اسی طرح

اسلام کے اصول تمدن تہذیب بھی مغربی تہذیب تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ خدا خود واضح قانون ہے، رسول خدا شارع قانون اور انسان صرف متبع قانون مگر وہاں خدا کو وضع قانون کا کسی سے کوئی حق ہی نہیں لیجلیچر واضح قانون ہے اور قوم لیجلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطلع نظر حکومت اچھی اور مغرب کا مطلع نظر حکومت قومی اسلام کا رخ بین الاقوامیت (Internationalism) کی طرف ہے اور مغرب کا کعبہ مقصود قومیت (Nationalism) معاشیات میں اسلام کل حلال اور زکوٰۃ و صدقہ و تحریم سود پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سا نظام معاشی ہی سود اور منافع پر چل رہا ہے اخلاقیات میں اسلام کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیش نظر دنیا کا فائدہ اجتماعی مسائل میں بھی اسلام کا راستہ قرین ہے ہر معاملہ میں مغرب کے راستے مختلف ہیں۔ سروسر و جاب، حدود وزن و مرد، تعدد ازواج، قوانین نکاح و طلاق، منہج و ملا حقوق ذوی الارحام، حقوق زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات ہیں جن میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مغرب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیر اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی، انھوں نے مغرب سے جو کچھ دیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا۔ پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کو اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس سلسلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو برسر غلط سمجھا اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیج کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا ہو مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہو سکتی۔

(ترجمان القرآن۔ رجب ۱۳۵۳ھ۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

## دورِ بید کی بیمار قومیں

شرق ہو یا مغرب، مسلمان ہوں یا غیر مسلم بلا استثناء سب ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ان پر ایک ایسی تہذیب مسلط ہو گئی ہے جس نے سراسر مادیت کی آغوش میں پرورش پائی ہے اس کی حکمت و حکمت علی، دونوں کی عمارت غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس کا فلسفہ، اس کا سنس، اس کا اخلاق، اس کی معیشت، اس کی معاشرت، اس کی ریاست، اس کا قانون، غرض اس کی ہر چیز ایک غلط نقطہ آغاز سے چل کر ایک غلط رخ پر ترقی کرتی چلی گئی ہے، اور اب اس مرحلہ پر پہنچ گئی ہے جہاں سے ہلاکت کی آخری منزل قریب نظر آرہی ہے۔

اس تہذیب کا آغاز ایک ایسی قوم میں ہوا جس کے پاس حقیقت حکمت الہی کا کوئی صاف اور پاکیزہ سرچشمہ نہ تھا۔ مذہب کے پیشوا ہاں ضرور موجود تھے، مگر ان کے پاس حکمت نہ تھی، ان کے پاس علم نہ تھا، ان کے پاس خدا کا قانون نہ تھا۔ محض ایک غلط مذہبی تخیل تھا جو فکر و عمل کی راہوں میں نوع انسانی کو سیدھے سے پار چلانا چاہتا ہی تو نہ چلا سکتا تھا۔ وہ بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ علم و حکمت کی ترقی میں سدا رہ بن جاتا چنانچہ اس ایسا ہی کیا اور اس کی مزاہمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ترقی کرنا چاہتے تھے وہ مذہب اور مذہبیت کو ٹھکڑا کر ایک دوسرے سے پرچل پڑے جس میں مشاہدہ، تجربہ اور قیاس و استقراء کے سوا کوئی اور چیز ان کی رہنما نہ تھی۔ یہی ناقابل اعتناء رہنما جو خود ہدایت اور نور کے محتاج ہیں، ان کے معتمد علیہ بن گئے۔ ان کی مدد سے انھوں نے فکر و نظر تھمتی اکتشاف، اور تعمیر و وسیم کی راہ میں بہت کچھ جدوجہد کی، مگر ان کو ہر میدان میں ایک غلط نقطہ آغاز نصیب ہوا اور ان کی تمام ترقیات کا رخ ایک غلط منزل مقصود کی طرف پھر گیا۔ وہ اتحاد اور مادیت کے نقطہ سے چلے۔

انہوں نے کائنات کو اس نظر سے دیکھا کہ اس کا کوئی خدا نہیں ہے۔ آفاق اور انفس میں سمجھ کر نظر کی حقیقت کو کچھ بھی ہے مشاہدات اور محسوسات کی ہے اور اس ظاہری پردے کے پیچھے کچھ بھی نہیں۔ تجربہ اور قیاس انہوں نے قانونِ فطرت کو جاننا اور سمجھنا، مگر اس کے فاطمہ تک نہ پہنچ سکے۔ انہوں نے موجودات کو منسخر پایا اور ان سے کام لینا شروع کیا، لیکن اس تخیل سے ان کے ذہن خالی تھے کہ وہ بالاصل ان اشیاء کے مالک اور حاکم نہیں ہیں، بلکہ اہلی مالک کے خلیفہ ہیں۔ اس جہالت و غفلت نے انہیں مذمہ داری اور جوابدہی کے بنیادی تصور سے بے گانہ کر دیا، اور اس کی وجہ سے ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی اساس ہی غلط ہو گئی۔ وہ خدا کو چھوڑ کر خودی کے پرستار بن گئے، اور خودی نے خدا بن کر ان کو فتنے میں ڈال دیا۔ اب یہ اسی جھوٹے خدا کی بندگی ہے جو فکر و عمل کے ہر میدان میں ان کو ایسے راستوں پر لے جا رہی ہے جن کی دمیانی منزلیں تو نہایت خوش آئند اور نظر فریب ہیں، مگر آخری منزل بخرِ ہلاکت کے اور کوئی نہیں۔ وہی ہے جس نے سائنس کو انسان کی تباہی کا آلہ بنا لیا۔ اخلاق کو فسادیت، ریا، خلاعت اور بے قیدی کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ عیثیت پر خود غرضی اور برا کوشی کا شیطان مسلط کر دیا معاشرت کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں نفس پرستی، تن آسانی اور خود کامی کا زہر اتار دیا سیاست کو قوم پرستی، وطنیت، رنگ و نسل کے امتیازات، اور خداوند طاقت کی پرستاری سے آلودہ کر کے انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت بنا دیا غرض یہ کہ وہ ختمِ خبیثت جو مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں بویا گیا تھا چند صدیوں کے اندر تمدن و تہذیب کا ایک عظیم الشان شجر خبیثت بن کر ٹھا ہے جس کے پھل میٹھے مگر زہر آلود ہیں، جس کے پھول خوشنما مگر خار دار ہیں جس کی تناسل بہار کا منظر پیش کرتی ہیں مگر ایسی زہریلی ہوا اگل رہی ہیں جو نظر نہیں آتی اور اندر ہی اندر نوعِ بشری کے خون کو سموم کیے جا رہی ہیں۔ اہل مغرب جنہوں نے اس شجر خبیثت کو اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا اب خود اس سے بیزار ہیں اس زندگی کے ہر شعبے میں ایسی الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کر دی ہیں جن کو حل کرنے کی ہر کوشش بہت سی ہی الجھنیں پیدا کر دیتی ہے جس شاخ کو کاٹتے ہیں، اس کی جگہ بہت سی خاردار شاخیں نکل آتی ہیں۔ سرمایہ داری پریشہ

چلایا تو انٹرکریٹ نمودار ہو گئی جمہوریت بد ضرب لگائی ٹوڈلٹیر شپ پھوٹ نکلی اجتماعی مشکلات کو حل کرنا چاہا تو نسوانیت (Feminism) اور برتھ کنٹرول کا ظہور ہوا۔ اخلاقی مفاسد کا علاج کرنے کے لیے نوین سے کام لینے کی کوشش کی تو قانون شکنی اور جرائم پیشگی نے سراٹھایا غرض فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ہندوستان و تمدن کے اس درخت سے نکل رہا ہے اور اس نے مغربی زندگی کو از سر نو یا مصلاب نام کا ایک پھوڑا بنا دیا جس کی ہر رگ میں ٹیس اور ہر ریشے میں دھن ہے۔ مغربی قومیں در سے بیتاب ہو رہی ہیں۔ ان کے دل بے قرار ہیں۔ ان کی روئیں کسی امرت رس کے لیے ٹرپ رہی ہیں مگر انھیں خبر نہیں کہ امرت رس کہاں ہے۔ ان کی اکثریت ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مصلاب کا سر چشمہ اس شجر خمیت کی محض شاخوں میں ہے اس لیے وہ شاخیں کاٹنے میں اپنا وقت اور اپنی محنتیں ضائع کر رہی ہے، مگر نہیں سمجھتی کہ مغربی جو کچھ بھی ہے اس درخت کی جڑ میں ہے اور اہل فساد سے فرع صانع نکلنے کی امید رکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری طرف ایک قلیل جماعت ایسے صحیح العقل لوگوں کی بھی ہے جنہوں نے اس حقیقت کو پایا ہے کہ ان کے شجر تہذیب کی جڑ خراب ہے، مگر چونکہ وہ صدیوں تک اسی درخت کے سایہ میں پرورش پاتے رہے ہیں اور اسی کے ثمرات سے ان کی بڑی بوٹی بنی ہے، اس لیے ان کے ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس اہل کے بجائے کوئی دوسری اہل ایسی ہو سکتی ہے جو صالح برگ و بار لانے کی قوت رکھتی ہو۔ نتیجہ میں دونوں جماعتوں کا حال ایک ہی ہے۔ وہ سب سب بتیابی کے ساتھ کسی چیز کے طالب ہیں جو ان کے درد کا دواں کرے، مگر انھیں خبر نہیں ہے کہ ان کا مطلوب کیا ہے اور کہاں ہے۔

یہ وقت ہے کہ مغربی قوموں کے سامنے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو پیش کیا جائے اور انھیں بتایا جائے کہ یہ ہے وہ مطلوب جس کی طلب میں تمھاری روئیں بے قرار ہیں، یہ ہے وہ امرت جس کے تم پیاسے ہو، یہ ہے وہ شجر طیب جس کی اہل بھی صالح ہے اور شاخیں بھی صالح، جس کے پھول خوشبودار بھی ہیں اور بے خار بھی، جس کے پھل میٹھے بھی ہیں اور جان بخش بھی، جس کی ہوا لطیف بھی ہے اور

روح پرور بھی یہاں تم کو حکمت ملے گی یہاں تم کو فکر و نظر کے لیے ایک صحیح نقطہ آغاز ملے گا۔ یہاں تم کو وہ علم ملے گا جو نظری اور عملی دونوں قسم کے علوم کو ایک تقیم و محکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہاں تم کو وہ ایمان ملے گا جو انسانیت کی بہترین تشکیل کرتا ہے۔ یہاں تم کو وہ روحانیت ملے گی جو راہبوں اور دنیاویوں کے لیے نہیں بلکہ کل کارزار دنیا میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے سکون قلب اور جمعیت خاطر کا سرچشمہ ہے۔ یہاں تم کو اخلاق اور قانون کے وہ بلند اور بابرآورد اعلیٰ گے جو انسانی فطرت کے علم حاوی پر مبنی ہیں اور خواہشات نفس کے تباہ میں بدل نہیں سکتے۔ یہاں تم کو تہذیب تمدن کے وہ صحیح اصول ملیں گے جو طبقات کے جعلی امتیازات و راقوم کی مصنوعی تفریقوں کو مٹا کر انسانی عقلی بنیادوں پر انسانی جمعیت کی تنظیم کرتے ہیں اور عدل مساوات، فیضی اور حسن معاملت کی ایک ایسی پُرامن اور مناسب فضا پیدا کر دیتے ہیں جس میں افراد و طبقات اور فرقوں کے درمیان حقوق کی کشمکش اور مفاد و مصالح کے تصادم اور غرض و مقاصد کی جنگ کے لیے کوئی موقع باقی ہی نہیں رہتا، بلکہ سب کے سب باہمی تعاون کے ساتھ شخصی و اجتماعی فلاح کے لیے خوش دلی اور اطمینان کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں اگر تم ہلاکت سے بچنا چاہتے ہو تو قبل اس کے کہ تمھاری تہذیب ایک ہولناک صدیہ پاش پاش ہو کر تاریخ کی برباد شدہ ہندیوں میں ایک اور مٹی ہوئی تہذیب کا اضافہ کرے، تم کو چاہیے کہ اسلام کے خلاف ان تمام نصابات کو جو تمھیں قرونِ وسطیٰ کے مذہبی دیوانوں سے دراشت میں ملے ہیں اور جن کو تم نے اُس تاریک دور کی تمام دوسری چیزوں سے قطع تعلق کرنے کے باوجود ابھی تک نہیں چھوڑا، اپنے دلوں سے نکال ڈالو اور کھلے دل کے ساتھ قرآن اور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سنو، سمجھو اور قبول کرو۔ مسلمان قوموں کا حال مغربی قوموں کے حال سے مختلف ہے۔ مرض اور ہے، اسباب مرض بھی دوسرے ہیں، مگر علاج ان کا بھی وہی ہے جو اہل مغرب کا ہے یعنی اُس علم و ہدایت کی طرف رجوع جس کو اللہ اپنی آخری کتاب اور اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔

اسلام کے ساتھ مغربی تہذیب کا تصادم جن حالات میں پیش آیا ہے وہ ان حالات کے بالکل مختلف

ہیں جن میں اس پہلے اسلام اور دوسری تہذیبوں کے درمیان تصادم ہوئے ہیں۔ رومی، فارسی، ہندی اور چینی تہذیبیں اس وقت اسلام سے ٹکرائیں جب اسلام اپنے متبعین کی فکری و علمی قوتوں پر پورے زور کے ساتھ سکھاتا تھا، قرآن کا علم ان کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا، طریقہ محمدی ان کی زندگی کا دستور بن گیا تھا، جہاد اور اجتہاد کی زبردست روح ان کے اندر کار فرما تھی، روحانی اور مادی دونوں حیثیتوں سے وہ دنیا میں ایک غائب قوم تھے اور تمام اقوام عالم کی بیوقوفی کا منصب ان کو حاصل تھا۔ اس وقت کوئی تہذیب ان کی تہذیب کے مقابلہ میں نہ ٹھیکر کی۔ انھوں نے جس طرف رخ کیا، قوموں کے خیالات، نظریات، علوم، اخلاق و عادات اور طرز تمدن میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ان میں تاثر کی قابلیت کم اور تاثر کی قوت بہت زیادہ تھی۔ بلاشبہ انھوں نے دوسروں کو بہت کچھ لیا، مگر ان کی تہذیب کا مزاج اس قدر طاقتور اور مضبوط تھا کہ باہر سے جو چیز بھی اس میں آئی وہ اس کی طبیعت کے مطابق ڈھل گئی اور کسی بیرونی اثر سے اس میں سو مزاج مختلف پیدا نہ ہو سکا۔ بخلاف اس کے انھوں نے جو اثرات دوسروں پر ڈالے وہ انقلاب انگیز ثابت ہوئے بعض غیر مسلم تہذیبیں تو اسلام میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت ہی کھو بیٹھیں، اور بعض جن میں زندگی کی طاقت زیادہ تھی، وہ اسلام سے اس قدر ڈر گئے کہ ان کے اہول میں بہت کچھ تغیر واقع ہو گیا۔ مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش حوال تھا۔

مسلمان صدیوں تک قلم اور تلوار کے ساتھ فرما زواری کرتے کرتے آخر کار تھک گئے۔ ان کی روح ہر سرد و گرمی، قوت اجتہاد شل ہو گئی۔ جس کتب نے ان کو علم کی روشنی اور عمل کی طاقت بخشی تھی اس کو انھوں نے محض ایک تبرک یا یادگار بنا کر غلافوں میں لپیٹ دیا۔ جس ہادی اعظم کی منہ بنے ان کی تہذیب کو ایک مکمل فکری و عملی نظام کی صورت میں شکل کیا تھا اس کی پیروی کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ نتیجہ ہوا کہ ان کی ترقی کی رفتار رُک گئی۔ بہتہ ہوا دریا کا ایک جمود کی وادی میں ٹھہر کر تالاب بن گیا۔ امارت کے منصب سے مسلمان معزول ہوئے دنیا کی قوموں پر ان کے افکار، ان کے علوم، ان کے تمدن اور ان کے سیاسی اقتدار نے جو قابو پالیا تھا اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ پھر اسلام کے بالمقابل ایک دوسری تہذیب نے جنم لیا۔ جہاد اور اجتہاد کا جھنڈا

جس کو مسلمانوں نے پھینک دیا تھا مغربی قوموں نے اٹھالیا۔ مسلمان سوتے رہے اور اہل مغرب اس جھنڈک کو لے کر علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھے۔ یہاں تک کہ امامت کا منصب جس مسلمان کو غفل ہو چکا تھے ان کو مل گیا۔ ان کی تلوار نے دنیا کے سوا دماغظم کو فتح کیا۔ ان کے افکار و نظریات، علوم و فنون اور اصول و تدبیر و تمدن دنیا پر چھا گئے۔ ان کی فرمانروائی نے صرف اجسام ہی کا نہیں، دلوں اور دماغوں کا بھی احاطہ کر لیا۔ آخر صدیوں کی نیند سے جب مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں تو انہوں نے دیکھا کہ میدان ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ دوسرے اس پر قابض ہو چکے ہیں۔ غلبہ ہے تو ان کا ہے۔ تہذیب ہے تو ان کی ہے۔ قانون ہے تو ان کا ہے حکومت ہے تو ان کی ہے۔ مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے۔ اب اسلام اور مغربی تہذیب کا تصادم ایک دوسرے ڈھنگ پر ہو رہا ہے یقیناً مغربی تہذیب کسی حیثیت سے بھی اسلام کے مقابلہ کی تہذیب نہیں۔ اگر تصادم اسلام سے ہو تو دنیا کی کوئی قوت اس کے مقابلہ میں نہیں طے کر سکتی مگر اسلام ہے کہ ان مسلمانوں میں نہ اسلامی سیرت و عہدہ اسلامی اخلاق، نہ اسلامی افکار و نہ اسلامی اپرٹھ۔ حقیقی اسلامی روح نہ ان کی مسجدوں میں ہے، نہ مدرسوں میں، نہ خانقاہوں میں۔ عملی زندگی سے اسلام کا رابطہ باقی نہیں رہا۔ اسلام کا قانون نہ ان کی شخصی زندگی میں نافذ ہے نہ اجتماعی زندگی میں۔ تمدن و تہذیب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا نظم صحیح اسلامی طرز پر باقی ہو ایسی حالت میں دراصل مقابلہ اسلام اور مغربی تہذیب کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی افرودہ، جامد اور پس ماندہ تہذیب کا مقابلہ ایک ایسی تہذیب سے ہے جس میں زندگی ہے، حرکت ہے، روشنی علم ہے، گرمی عمل ہے۔ ایسے نامساوی مقابلہ کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہی ظاہر ہو رہا ہے مسلمان پسا ہو رہے ہیں۔ ان کی تہذیب شکست کھا رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مغربی تہذیب میں جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے دلوں اور دماغوں پر مغربیت مسلط ہو رہی ہے۔ ان کے ذہن مغربی سانچوں میں ٹھل رہے ہیں۔ ان کی فکری و نظری قوتیں مغربی اصولوں کے مطابق تربیت پا رہی ہیں۔ ان کے تصور، ان کے اخلاق، ان کی معیشت، ان کی معاشرت، ان کی سیاست، ہر چیز مغربی رنگ میں رنگی جا رہی ہے اور ان کی نفسیں

اس تخیل کے ساتھ اٹھ رہی ہیں کہ زندگی کا حقیقی قانون وہی ہے جو مغرب کے ان کو مل رہا ہے۔ شکست و ناکامی مسلمانوں کی شکست ہے۔ مگر قیمتی سے اس کو اسلام کی شکست سمجھا جاتا ہے۔

ایک ملک نہیں جو اس مصیبت میں گرفتار ہو۔ ایک قوم نہیں جو اس خطرے میں مبتلا ہو۔ آج تمام دنیا اسلام اسی خوفناک انقلاب کے دور سے گزر رہی ہے۔ حقیقت یہ علماء کا کام تھا کہ جب اس انقلاب کی ابتداء ہوئی تھی اس وقت وہ بیدار ہوتے، آنے والی تہذیب کے اصول و مبادی کو سمجھتے، مغربی ممالک کا سفر کر کے ان علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ تہذیب اٹھی ہے، اجتہاد کی قوت کا کام لے کر ان کا آمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کر لیتے جن کے بل پر مغربی قوموں نے ترقی کی ہے، اور ان سے کل پرزوں کو اصول اسلام کے ماتحت مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور ان کی تمدنی زندگی کی نشین میں اس طرح نصب کر دیتے کہ کئی صدیوں کے جوہر سے جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی ہو جاتی اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنے لگتی بلکہ فرسوس کہ علماء (الامامنا، اللہ، خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے تھے۔ ان میں اجتہاد کی قوت نہ تھی۔ ان میں نفقہ نہ تھا۔ ان میں حکمت نہ تھی۔ ان میں عمل کی طاقت نہ تھی۔ ان میں بیصلاہت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسول خدا کی علمی و عملی ہدایت اسلام کے دائمی اور بچکار اصول اخذ کرتے اور زمانہ کے تغیر حالات میں ان سے کام لیتے۔ ان پر تو اسلاف کی انہی اور جا تقلید کا مرض پوری طرح مسلط ہو چکا تھا جس کی وجہ وہ ہر چیز کو ان کتابوں میں تلاش کرتے تھے جو خدا کی کتابیں تھیں کہ زمانے کی قیود سے بالاتر ہوں۔ وہ ہر معاملہ میں ان انسانوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو خدا کے نبی نہ تھے کہ ان کی بصیرت اوقات اور حالات کی بندشوں سے بالکل آزاد ہوتی۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایسے وقت میں مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کر سکتے جو زمانہ بالکل بدل چکا تھا اور علم و عمل کی دنیا میں ایسا عظیم تغیر واقع ہو چکا تھا جس کو خدا کی نظر تو دیکھ سکتی تھی، مگر کسی غیر نبی انسان کی نظر میں یہ طاقت نہ تھی کہ قرون اور صدیوں کے پرے اٹھا کر ان تک پہنچ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ علماء نے نئی تہذیب کا مقابلہ کرنے کی کوشش ضرور کی، مگر مقابلہ کے لیے جس سر و سامان کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس

نہ تھا۔ حرکت کا مقابلہ جو دوسرے نہیں ہو سکتا۔ رفتار زمانہ کو منتقلی کے زور سے نہیں بدلا جاسکتا۔ نئے اسلحہ کے سامنے  
 فرسودہ اور زنگ آلود ہتھیار کام نہیں لے سکتے۔ علمائے جن طریقوں سے امت کی رہنمائی کرنی چاہی  
 ان کا کامیاب ہونا کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ جو قوم مغربی تہذیب کے طوفان میں گھر چکی تھی وہ آنکھوں پر پٹیاں  
 باندھ کر اور جو اس کو محفل کر کے کب تک طوفان کے وجود سے انکار کرتی اور اس کے اثرات سے  
 محفوظ رہتی؟ جس قوم پر تمدن و تہذیب کا جدید نظام سیاسی طاقت کے ساتھ محیط ہو چکا تھا وہ اپنی عملی زندگی  
 کو مغربی و محکومی کی حالت میں اس کے نفوذ و اثر سے کس طرح بچا سکتی تھی؟ آخر کار وہی ہوا جیسے حالات  
 میں ہونا چاہیے تھا۔ سیاسی میدان میں شکست کھانے کے بعد مسلمانوں نے علم اور تہذیب و تمدن کے  
 میدان میں بھی شکست کھائی اور اب ہماری آنکھیں نہ کھل رہی ہیں کہ دنیا کے اسلام کے ہر خط میں مغربیت  
 کا طوفان بلا کی تیزی سے بڑھتا چلا جا رہا ہے جس کی رو میں بہتے بہتے مسلمانوں کی نئی نسلیں اسلام  
 کے مرکز سے دور ————— کو سوں دور نکل گئیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ علماء اسلام کو اب تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے۔ قریب قریب ہر اسلامی  
 ملک میں علماء کی جماعت اب بھی اسی روش پر قائم ہے اور اصرار و شدت کے ساتھ قائم ہے جس کی وجہ  
 ابتدا میں ان کو ناکامی ہوئی تھی۔ چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر علماء کی عام حالت یہ کہ وہ زمانے کے موجودہ  
 رجحانات اور ذہنیات کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلیں  
 کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں، ان پر انہماک و نفرت تو ان جتنا چاہیے کہ ایسے لیکن اس زہر کا تریاق ہم پہنچانے  
 کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لیے جو جدیدہ علمی و عملی مسائل پیدا کر دیے ہیں  
 ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن  
 نہیں، اور اجتہاد کو یہ لینے اور پر حرام کر چکے ہیں اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو  
 طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے

اٹل متفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر دل سے بے اختیار یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صد آجے ہنگام نہ پہنچی ہوا انھوں نے اپنے ارد گرد دوسو برس پرانی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اسی فضا میں سوچتے ہیں، اسی میں رہتے ہیں اور اسی کے مناسب حال بانیں کرتے ہیں۔ بلاشبہ علوم اسلامی کے جو اہر آج دنیا میں انہی بزرگوں کے دم سے قائم ہیں اور جو کچھ دینی تعلیم پھیل رہی ہے انہی کے ذریعہ سے پھیل رہی ہے لیکن دوسو برس کی جو وسیع سطح انھوں نے اپنے اور زمانہ حال کے درمیان حاصل کر رکھی ہے وہ اسلام اور جدید دنیا کے درمیان کوئی ربط قائم نہیں ہونے دیتی جو اسلامی تعلیم کی طرف جاتا ہے وہ دنیا کے کسی کام کا نہیں رہتا جو دنیا کے کام کا بننا چاہتا ہے وہ اسلامی تعلیم سے بالکل بیگانہ رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت دنیا کے اسلام میں ہر جگہ دو ایسے گروہ پائے جاتے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک گروہ اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت کا علمبرار ہے مگر زندگی کے کسی شعبے میں مسلمانوں کی رہنمائی کے قابل نہیں۔ دوسرا گروہ مسلمانوں کی علمی، ادبی و تمدنی اور سیاسی گاری کو چلا رہا ہے مگر اسلام کے اصول و مبادی سے ناواقف ہے، اسلامی تہذیب کی اسپرٹ سے بیگانہ ہے، اسلام کے اجتماعی نظام اور تمدنی قوانین سے نا آشنا ہے صرف دل کے ایک گوشہ میں ایمان کا تھوڑا بہت نور رکھتا ہے، باقی تمام حیثیتوں سے اس میں اور ایک غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں مگر چونکہ علمی و عملی طاقت جو کچھ بھی ہے اسی گروہ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کے دست و بازو ہیں جو گاری چلائی کی طاقت رکھتے ہیں، اس لیے وہ ملت کی گاری کو لے کر گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا چلا جا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کو سیدھا راستہ بتائے۔

میں اس حالت کو دیکھ رہا ہوں اور اس کا خوفناک انجام میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اگرچہ رہنمائی کے لیے علم و فضل اور جامعیت کی ضرورت ہو وہ مجھ کو حاصل نہیں۔ نہ اتنی قوت میرے لیے بگڑی ہوئے حالات میں اتنی بڑی قوم کی اصلاح کر سکوں لیکن اللہ نے دل میں ایک درد دیا ہے اور وہی درد مجھ کو رہا ہے

کہ جو تھوڑا سا علم اور نور بصیرت اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے، اس سے کام لے کر مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں کو اسلامی تعلیم کے اصل منبع اور اسلامی تہذیب کے حقیقی سرچشمہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دے اور کامیابی و ناکامی سے بے پروا ہو کر اپنی کسی کوشش کر دیکھوں کام کی بزرگی اور اپنی کمزوری کو دیکھ کر اپنی کوششیں خود مجھ کو پیچ میرے معلوم ہوتی ہیں مگر کامیابی اور ناکامی جو کچھ بھی ہے اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے میرا کام کوشش کرنا ہے اور اپنی حدود و سطح تک میں اپنی کوشش کے دائرے کو پھیلانا چاہتا ہوں

(ترجمان القرآن - رجب ۱۴۵۲ھ - اکتوبر ۱۹۳۵ء)

## انسانی قانون اور الہی قانون

گذشتہ ماہ دسمبر ۱۹۳۳ء کی ابتدا میں امریکہ کے قانون تحریم خمر (Prohibition Law) کی منسوخ کابالہ اعلان ہو گیا، اور تقریباً چودہ برس کے بعد نئی دنیا کے باشندوں نے پھر خشکی "سے تری" کے حدود میں قدم رکھا۔ جمہوریہ امریکہ کی صدارت پر شروز ولٹ کا فائز ہونا خشکی پر تری کی فوج کا پہلا اعلان تھا۔ اس کے بعد پہلے تو اپریل ۱۹۳۳ء میں ایک قانون کے ذریعہ سے ۳۰ فی صدی الکل کی شراب کو جائز کیا گیا پھر چند مہینے گزر گئے کہ دستور جمہوریہ امریکہ کی اٹھارویں ترمیم ہی منسوخ کر دی گئی جس کی رو سے ریاستہائے متحدہ کے حدود میں شراب کی خرید و فروخت درآمد و برآمد اور ساخت و پرداخت حرام قرار دی گئی تھی۔

قانون کے ذریعہ سے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا یہ سب سے بڑا تجربہ تھا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اٹھارویں ترمیم سے پہلے کئی سال تک انٹی سیلون لیگ (Anti-Saloon League) نے ملکی و جہاں خطبات، تصاویر، بیچک لینڈرن، سینما اور بہت سے دوسرے طریقوں سے شراب کی مضر تئیں اہل امریکہ کے دل میں کڑی کوشش کرتی رہی اور اس تبلیغ میں اس نے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تحریک کی ابتدا سے لے کر ۱۹۲۰ء تک نشر و اشاعت پر ساڑھے چھ کروڑ ڈالر صرف ہوئے، اور شراب کے خلاف جس قدر لٹریچر شائع کیا گیا وہ تقریباً ۹ ارب صفحہات پر مشتمل تھا۔

اس کے علاوہ قانون تحریم کی تنفیذ کے مصارف کا جس قدر باگذشتہ چودہ سال میں امریکی قوم کو برداشت کرنا پڑا ہے اس کی مجموعی مقدار ۴۸ کروڑ پونڈ بتائی جاتی ہے۔ اور حال میں ممالک متحدہ امریکہ کے محکمہ عدلیہ نے جنوری ۱۹۳۲ء کے اکتوبر ۱۹۳۳ء تک کے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قانون کی تنفیذ

سلسلہ میں دو سو اسی مارے گئے۔ ۳۵-۳۴-۳۳-۳۲-۳۱ تیرہ کیے گئے۔ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ کے بجائے مل کر لے گئے۔ چالیس کروڑ چالیس لاکھ پونڈ مالیت کی املاک ضبط کی گئیں۔

جان و مال کے ہونا کف قصاصات صرف اس لیے برداشت کیے گئے کہ بیسویں صدی کی اس ”مہذبہ ترین“ قوم کو جس کا آفتاب علم نصرت الہیہ پر پڑ چکا ہوا ہے، ام ایجابات کی بے شمار روحانی، اخلاقی، جسمانی، اور مالی مضرتوں سے آگاہ کیا جائے اور محفوظ رکھا جائے۔ لیکن تحریم سے پہلے کئی سال اور تحریم کو بعد کئی سال کی مسلسل کوشش جن میں حکومت کی طاقت بھی شریک تھی، امریکی قوم کے عزم سے خواری کے ننگے ناکام ہو گئیں اور تاریخ عالم کا سب سے بڑا اصلاحی جہاد آخر کار بے سود ثابت ہوا۔

تحریم خمر کی یہ ناکامی اور قانون تحریم کی یہ تیغ کچھ اس وجہ نہیں ہے کہ شراب کی وہ مضرتیں جن کو دور کرنے کے لیے پروپیگنڈا اور قانون کی طاقت استعمال کی گئی تھی، اب منفعتوں سے بدل گئی ہیں، یا کبھی علمی اکتشاف نے ان خیالات کو غلط ثابت کر دیا ہے جو پہلے قائم کیے گئے تھے۔ بلکہ اس کے آج پہلے سے بھی زیادہ وسیع و کثیر تحریکات کی بنا پر حقیقت تسلیم کی جاتی ہے کہ قہر گری، زنا، الوہات، چوری، قمار بازی، قتل و خون اور ایسے ہی دوسرے اخلاقی مفاسد اس ام ایجابات کے قریب ترین رشتہ دار ہیں، اور مغربی اقوام کے اخلاق، صحت، معیشت اور معاشرت کی تباہی میں اس کا بڑا حصہ ہے لیکن اس کے باوجود جس چیز نے آج حکومت امریکہ کو اپنا قانون واپس لینے اور حرام کو حلال کر دینے پر مجبور کر دیا وہ صرف یہ ہے کہ امت امریکہ کی عظیم اکثریت کسی طرح شراب چھوڑنے پر رضی نہ ہوئی، اور وہی پبلک ہس کے دوٹ نے اب چودہ برس پہلے چیز حرام کی تھی، اب اس کو حلال کرنے پر اصرار کرنے لگی۔

جہاں تک ہم کو معلوم ہے مے خواری کے نقصانات کسی بڑے سے بڑے عامی شراب سے بھی کبھی بچا نہیں کیا اور نہ کبھی مخالفین تحریم نے شراب کے محاسن کی کوئی ایسی فہرست پیش کی جو ان قبائح کے مقابلہ میں کچھ بھی وزن رکھتی ہو۔ جس وقت امریکن کانگریس میں عام کی تائید سے دستور کی اٹھاؤ تو ہم پیش

ہوئی تھی، اس وقت خشکی اور تری کے درمیان ہر طرح موازنہ کر لیا گیا تھا اور انہی تمام مضرتوں اور خرابیوں کا حل  
 کرتے ہوئے کانگریس نے وہ ترمیم منظور کی تھی، ۴۶ ریاستوں نے اس ترمیم کی توثیق کی تھی، دارا لمبوعونین  
 ( House of Representatives ) اور مجلس شیوخ ( Senate ) نے اس ترمیم کے مطابق  
 قانون تحریم ( Valstead Act ) پاس کیا تھا۔ یہ سب کچھ امریکی قوم کی مرضی سے ہوا اور جب تک تحریم کا  
 معاملہ کاغذ اور زبان تک رہا، قوم خوش خوش اس کی تائید کرتی رہی۔ مگر جو انہی کی یہ تحریم عالم معاملہ میں  
 آئی، تمام امت امریکیہ کا رنگ بدل گیا۔ ام المخابرات کے ہجرتیں پہلی رات بسر کرتے ہی دنیا کی سب سے  
 زیادہ متمدن، ذی علم، ذی ہوش، محتاط پسند، اور ترقی یافتہ قوم دیوانی ہو گئی، اور اس نے جوش جوں  
 میں وہ حرکتیں شروع کر دیں جن سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ قوم مشرقی شاعری کے خیالی عاشقوں کی طرح  
 فی الواقع اپنا سر پھوڑ ڈالے گی۔

اجازت یافتہ شراب خانوں کے بند ہوتے ہی تمام ملک میں لکھو کھا خفیہ شراب خانے  
 ( Speak-easies and Blind-pigs ) قائم ہو گئے جن میں قانون کی گرفت سے بچ کر شراب پیئے  
 پلانے، بیچنے اور خریدنے کے عجیب عجیب طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ کسی شخص کا اپنے کسی دوست یا عزیز  
 کو کسی خفیہ شراب خانے اور اس کے مقررہ اشارے ( Pass-word ) کا پتا دینا ایک خاص مہربانی کا  
 فعل سمجھا جاتا تھا پہلے تو حکومت لائسنس یافتہ شراب خانوں کی تعداد، ان کی شرابوں کی نوعیت اور ان میں  
 آنے جانے والوں کے حالات کی نگرانی کر سکتی تھی، مگر اب یہ بدکاری کے اڈے اس کی نگرانی کے حدود  
 آزاد تھے۔ ان کی تعداد قبل تحریم کے اجازت یافتہ شراب خانوں سے کہنی گئی زیادہ ہو گئی۔ ان میں قہریم کی  
 بدترین شرابیں فروخت ہونے لگیں جو صحت کے لیے غایت درجہ مضر تھیں۔ ان میں کس لڑکوں اور  
 لڑکیوں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی جس کے ہونا ک نتائج سے ریاستہائے متحدہ کے اہل فکر میں عام  
 اضطراب برپا ہو گیا۔ شراب کی قیمت پہلے سے کہنی گئی زیادہ ہو گئی۔ مے فروشی کا ہمیشہ ایک بڑا نقصان پیشہ

بن گیا اور ہزاروں لاکھوں آدمی ہی کا۔ و بار کرنے لگے۔ خفیہ سے خانوں کے علاوہ بکثرت پھیری لگنے لگے۔  
 سے فروش (Boot-leggers) پیدا ہو گئے جو گویا پھرتے چھنے سے خانے تھے۔ یہ لوگ مدرسوں، دفاتروں،  
 ہوٹلوں، تفریح گاہوں، حتیٰ کہ لوگوں کے گھروں تک پہنچ کر شراب بیچنے اور نئے نئے گاہک پیدا کرنے  
 لگے۔ کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ قبل تحریم کی نسبت بعد تحریم کے زمانہ میں امریکہ کے سے فروشوں کی  
 تعداد دس گنی زیادہ ہو گئی۔ شہروں سے گزر کر دیہات تک میں یہ کاروبار پھیل گیا گاؤں گاؤں شراب  
 کثیر کرنے کے خفیہ کارخانے قائم ہو گئے۔ تحریم سے پہلے امریکہ میں عقی کشی کے اجازت یافتہ کارخانوں  
 کی تعداد کل چار سو تھی۔ تحریم کے بعد سات سال کے اندر ۹۴۳۴ کارخانے گرفتار ہوئے ۱۹۳۳ء بھٹیلا  
 پکڑی گئیں اور پھر بھی شراب فروشی کے کاروبار میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ محکمہ تحریم کے ایک سابق مکتبہ  
 کا بیان ہے کہ ہم کل کارخانوں اور بھٹیلاں کا صرف دسواں حصہ پکڑ سکے۔ اسی طرح شراب کی مقدار میں  
 بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔ تجربہ کیا گیا ہے کہ تحریم کے زمانے میں امریکہ کے باشندے ہر سال، ہر کوئین  
 شراب پینے لگے تھے۔ یہ مقدار استعمال، قبل تحریم کی مقدار سے بہت زیادہ تھی۔

جو شراب اس قدر کثیر مقدار میں استعمال کی جانے لگی تھی وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بھی حد  
 درجہ خراب اور مضر صحت تھی۔ اطباء کا بیان ہے کہ:-

”اس چیز کو شراب کے بجائے زہر کہنا زیادہ صحیح ہے۔ اس کے حلق سے اترتے ہی معدہ اور دماغ  
 پر اس کے زہریلے اثرات مترتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور دو دن تک اعداد اسے متاثر  
 رہتے ہیں۔ اس کے نشے میں انسان کسی خوش باشی اور خوش فعلی کے مطالعہ کا نہیں رہتا، بلکہ اس کی  
 طبیعت شورش اور ہنگامہ آرائی اور اتکاب جرم کی جانب مائل ہو جاتی ہے۔“

اس قسم کی شرابوں کی کثرت استعمال نے اہل امریکہ کی جسمانی صحت کو تباہ کر ڈالا۔ مثال کے طور پر  
 شہر نیو یارک کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریم سے پہلے ۱۹۱۳ء میں لکھن کے اثر سے بیمار ہونے والوں کی تعداد

(۱۴۳۴) اور مرنے والوں کی تعداد (۲۵۲) تھی۔ ۱۹۲۶ء میں بیمار ہونے والوں کی تعداد گیارہ ہزار اور مرنے والوں کی تعداد ساڑھے سات ہزار تک پہنچ گئی۔ ان کے علاوہ جو لوگ بالواسطہ شراب کے اثرات سے متاثر ہو کر ہلاک یا زندہ درگور ہو گئے ان کی تعداد کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح جرائم، خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کے جرائم میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔ امریکہ کے بچوں کا بیان ہے کہ ”ہمارے ملک کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی کبھی اتنی کثیر تعداد میں بچے بحالت نشہ گرفتار ہوئے ہوں“ جب کہ کئی کے جرائم حد سے بڑھ گئے تو اس کی تحقیقات کی گئی اور ثابت ہوا کہ ۱۹۲۰ء نوجوانوں کی سے غوری اور عریضہ ہوئی میں سال بسال زیادتی ہوتی جا رہی ہے، حتیٰ کہ بعض شہروں میں سال کے اندر دو سو فی صدی اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں امریکہ کی (National Crime Council) کے ڈائریکٹر کرنل موس (Col. Moss) نے بیان کیا کہ اس وقت امریکہ کے ہر تین آدمیوں میں سے ایک آدمی جرائم پیشہ ہے اور ہمارے ہاں قتل کے جرائم میں ساڑھے تین سو فی صدی اضافہ ہوا ہے۔

غرض چودہ سال کے اندر امریکہ میں تحریم خمر کے جو نتائج ظاہر ہوئے ان کا خلاصہ یہ ہے:-  
قانون کا احترام و لوگ اٹھ گیا اور سوسائٹی کے ہر طبقے میں خلاف ورزی قانون کی بیماری پھیل گئی۔  
تحریم خمر کا اصل مقصد بھی حاصل نہ ہوا، بلکہ اس کے برعکس یہ چیز حرام ہو گئے بعد اس سے بھی زیادہ استعمال ہونے لگی جتنی حلال ہونے کے زمانہ میں استعمال ہوتی تھی۔

قانون تحریم کی تنفیذ میں حکومت اور خفیہ طریقہ سے شراب خریدنے میں رعایا کا بے حسابانی نقصان ہوا اور ملک کے معاشی حالات تباہ ہونے لگے۔

امراض کی کثرت، صحت کی بربادی، شرج اموات میں اضافہ، اخلاق عامہ کا فساد، سوسائٹی کے تمام طبقات اور خصوصاً نوجوان نسلوں میں ذمائم اور قبائح کا بکثرت شائع ہونا، اور جرائم میں غیر معمولی ترقی، یہ اس قانون کے تمدنی و اخلاقی ثمرات تھے۔

یہ نتائج اس ملک میں حاصل ہوئے جو بیسویں صدی کے روشن ترین زمانہ میں ہندوستان میں ملک سمجھا جاتا ہے جس کے باشندے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ جن کے دماغ علم و حکمت کی روشنی سے منور ہیں جو اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ نتائج اس حالت میں ظاہر ہوئے جبکہ کروڑ ہا روپیہ صرف کر کے اور کئی ارب رسالے اور کتابیں شائع کر کے تمام قوم کو شراب کے نقصانات سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

یہ نتائج اس کے باوجود ظاہر ہوئے کہ امریکی قوم کی ایک بڑی اکثریت تحریم کی ضرورت کو تسلیم کر چکی تھی اور تحریم کا قانون اس کی مرضی سے پیش اور پاس ہوا تھا۔

پھر ان نتائج کا ظہور ایسی حالت میں ہوا جبکہ امریکہ کی عظیم انسان سلطنت بیسویں صدی کی بہترین تنظیم کے ساتھ کامل چودہ سال تک شراب نوشی اور شراب فروشی کا قلع قمع کرنے پر تلی رہی۔

جبکہ یہ نتائج ظاہر نہ ہوئے تھے حکومت اور رعیت دونوں کی اکثریت شراب کو حرام قرار دینے پر متفق تھی اس لیے شراب حرام ہو گئی۔ مگر جب علوم ہوا کہ قوم کی طرح شراب چھوڑنے پر راضی نہیں ہے، اور زبردستی شراب چھڑانے کا نتیجہ پہلے سے بھی خراب نکلا ہے، تو اسی حکومت اور رعیت کی اکثریت نے شراب کو حلال کر دینے پر اتفاق کر لیا۔

اب ذرا ایک نظر اس ملک کی حالت پر ڈالیے جو اب ساٹھ تیسرے سو برس پہلے کے تاریک ترین زمانہ میں بسکے زیادہ تاریک ملک شمار ہوتا تھا۔ باشندے جاہل، علم و حکمت کا نام و نشان نہیں، تمدن، تہذیب کا پتہ نہیں، پڑھے لکھوں کی تعداد شاید دس ہزار میں ایک اور وہ بھی ایسے کہ آج کل کے کم سواد بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہوں گے۔ موجودہ زمانے کے تنظیمی ادارات اور وسائل کیسے مفقود، حکومت کا نظام بالکل ابتدائی حالت میں اور اس کو قائم ہوئے چند سال سے زیادہ نہ ہوئے تھے۔ باشندوں کا حال یہ کہ شراب کے عاشق، ان کی زبان میں شراب کے تقریباً ڈھائی سو نام پائے جاتے ہیں جس کی مثال شاید دنیا کی کسی زبان

میں نہ ملے گی۔ شراب کے ساتھ ان کے غیر معمولی شغف کا ثبوت ہے۔ اور اس کا مزید ثبوت ان کی شاعری ہی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور لازماً حیات سمجھی جاتی تھی۔

اس حالت میں وہاں شراب کا مسئلہ پیش ہوتا ہے اور رسول خدا سے پوچھا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ خدا کا ارشاد ہے۔

يَسْأَلُوكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ  
يَرْجِعُ عَنْ شَرَابٍ أَوْ رَجُلٍ  
قُلْ فِيهِمَا الْإِثْمُ كَبِيرٌ وَمَنْفَعٌ لِلنَّاسِ  
كَمَنْ دُونَ هَذَا بَعْضٌ يَكْتُمُ  
وَأَنْتُمْ هُمْ أَكْبَرُ مَنْ تَفْعَلُونَ (البقرہ: ۲۰۱)  
ہیں مگر ان کا نقصان ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔

یہ کوئی حکم نہ تھا۔ بلکہ محض شراب کی حقیقت بتائی گئی تھی کہ اس میں اچھائی اور برائی دونوں موجود ہیں، مگر برائی کا پہلو غالب ہے۔ اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ قوم کے ایک گروہ نے اسی وقت سے عذری چھوڑ دی۔ تاہم اکثریت بدستور شراب کی خوگر رہی۔

پھر دوبارہ شراب کے بارے میں حکم پوچھا گیا، کیونکہ بعض لوگ نشے کی حالت میں نماز پڑھتے اور غلطیاں کر جاتے تھے۔ اس پر رسول خدا نے اپنے خدا کی طرف سے حکم سنایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا  
الصلوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا  
مَا تَقُولُونَ۔ (النساء: ۴۳)  
اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ  
(نماز تم کو اس حالت میں پڑھنی چاہیے جبکہ تم جان سکو  
کہ کیا کہہ رہے ہو۔)

یہ حکم سنتے ہی لوگوں نے عذری کے لیے اوقات مقرر کر لیے اور عموماً فجر و ظہر کے درمیان عشا کے بعد شراب پی جانے لگی تاکہ نشے کی حالت میں نماز پڑھنے کی نوبت نہ آئے یا نشے کی وجہ سے نماز نہ ترک کرنی پڑے۔ مگر شراب کی اصلی مضرت ابھی باقی تھی۔ نشے کی حالت میں لوگ فساد برپا کرتے تھے اور خون خرابے تک نوبت پہنچ جاتی تھی اس لیے پھر خواہش کی گئی کہ شراب کے بارے میں صاف اور قطعی حکم دیا جائے اس پر ارشاد ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ  
وَالْأَنصَابُ وَالْأَنكَامُ حَرْبٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ  
فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ  
أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي  
الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ يَصُدُّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ  
وَعَنِ الصَّلَاةِ وَهَلْ أَنتُمْ مِّنْهُمْ وَاعْبُدُوا  
اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِن  
تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا إِنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلَاغُ  
الْمُبِينُ - (۵: ۱۲)

اے ایمان لانے والو! شراب اور جو اور بت اور پانے سے یہ  
سب شیطان کی ساز و برگ ختم کن دگیاں ہیں۔ لہذا تم ان سے  
پرہیز کرو واپس ہو کہ اس پرہیز سے تم کو فلاح نصیب ہوگی  
شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جو سے کے ذریعہ سے تمہارا  
درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد اور نماز  
روک دے کیا یہ معلوم ہو جانے کے بعد اب تم ان بازو گئے  
اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی بات مانو اور باز آ جاؤ لیکن  
اگر تم نے سرتابی کی توجہ نہ رکھو کہ ہمارے رسول کا کلام  
صرف اتنا ہی ہے کہ پیغام کو صاف صاف پہنچا دے۔

یہ حکم آنا تھا کہ وہی شراب کے ریا اور ذلت و رز کے عاشق جو اس چیز کے نام پر جان دیتے تھے یہ ایک  
اس سے نفور ہو گئے تھے کہ یہ شراب کی منادی سنتے ہی شراب کے ٹھکے ٹوڑ دیتے گئے۔ عربینے کی گلیوں میں شراب کے  
ٹالے بگائے۔ ایک محل میں سے نوشی ہو رہی تھی اور دس گیارہ اصحاب شراب کے نشے میں چور تھے۔ اتنے میں رسول  
کے منادی کی آواز کانوں میں پہنچی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے۔ اسی نشے کی حالت میں حکم خدا کا یہ احترام کیا گیا  
کہ فوراً شراب کا دور رک گیا اور ٹھکے ٹوڑ ڈالے گئے۔ ایک شخص کا واقعہ ہے کہ وہ شراب پی رہا تھا مینہ  
پایا لگا ہوا تھا کسی نے اگر تخریم عمر کی آیت پڑھی۔ فوراً پیالہ اس کے ہوں سے الگ ہو گیا اور پھر ایک قطرہ  
بھی خلق کے نیچے نہ اترا۔ اس کے بعد جس کی نے شراب پی اس کو جو توں، لکڑیوں، لاتوں سے پٹیاں لگا پھر  
پایس کوڑوں کی سزا دی گئی، پھر اس جرم کے لیے ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کر دی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ جسے بخوار  
کا نام و نشان مٹ گیا پھر اسلام جہاں جہاں پہنچا اس نے قوموں کو آپس آپ خشک (پرہیزگار) بنا دیا  
آج بھی جبکہ اسلام کا اثر بہت ضعیف ہو چکا ہے، دنیا میں کروڑوں انسان ایسے بستے ہیں جو کسی قانون تخریم

اوپر کی نظام تعزیری کے بغیر شراب بالکل مجتنب ہیں۔ مسلمان قوم میں اگر مردم شماری کر کے دیکھا جائے کہ عوام کی تعداد کافی صدی اوسط کیا ہے تو شاید یہ قوم اب بھی دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ پریزیگنٹ پائی جائے گی۔ پھر اس قوم میں جو لوگ شراب پیتے بھی ہیں وہ بھی اس کو گناہ سمجھتے ہیں، دل میں اپنے فعل پر نادم ہوتے ہیں، اور بے اوقات خود بخود تائب ہو جاتے ہیں۔

عقل و حکمت کی ملکیت میں آخری فیصلہ تجربہ و مشاہدہ پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ شہادت کبھی جھٹلائی نہیں جاسکتی۔ اب آپ کے سامنے ایک تجربہ امریکہ کا ہے اور دوسرا تجربہ اسلام کا۔ دونوں کا فرق بالکل ظاہر ہے اور یہ آپ کا کام ہے کہ ان کا تقابل کر کے اس سے سبق حاصل کریں۔

امریکہ میں برسوں تک شراب کے خلاف تبلیغ کی گئی۔ کروڑوں روپیہ اس کی مضر توں کے اعلان و اشتہار پر صرف کیا گیا۔ فن طب، اعداد و شمار کی شہادتوں سے عقلی استدلال سے، اس کے جسمانی، اخلاقی، معاشی نقصانات اس طرح ثابت کیے گئے کہ ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تصویروں کے ذریعے شراب کی مضر تیں برای بعین مشاہدہ کرادی گئیں اور پوری کوشش کی گئی کہ لوگ خود اس کی خرابیوں کے قائل ہو کر اس کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ پھر قوم کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت (کانگریس) نے اکثریت کے ساتھ اس کی تخریج کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے قانون پاس کر دیا۔ پھر حکومت نے (اور اس حکومت نے جو اس وقت دنیا کی عظیم ترین طاقتوں میں سے ہے) اس کی خرید و فروخت، ساخت و پرداخت اور برآمد کو روکنے کے لیے اپنی ساری قوتیں صرف کر ڈالیں۔ مگر قوم (اور وہ قوم جو اس وقت تعلیم یافتہ اور روشن خیال قوموں کی صف اول میں ہے) اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی اور جب قوم آمادہ نہ ہوئی تو پھر پندرہ برس کی قلیل مدت ہی میں قانون مجبور ہو گیا کہ حرام کو پھر حلال کر دے۔

دوسری طرف اسلام میں شراب کے خلاف کوئی پروپیگنڈا نہیں کیا گیا۔ شرعاً شاعت پر ایک سب سے بھی صرف نہ ہوا کوئی انٹی سیلون لیگ قائم نہیں کی گئی۔ اللہ کے رسول نے بس اتنا کہا کہ اللہ نے تمہارے

یہ شراب حرام کر دی ہے، اور جو نبی کہ حکم اس زبان سے نکلا، تمام قوم (اور وہ قوم جو شراب کے عشق میں اہل امر کیسے بڑھ کر تھی مگر اصطلاحی علم و دانش میں ان سے کوئی نسبت نہ رکھتی تھی) شراب سے بائگی اور ایسی باز آئی کہ جب تک وہ اسلام کے دائرے میں ہے اس کا خشکی سے تری کی جانب تجارت کرنا ممکن نہیں ہے۔ خشکی کے حصاریں بند رہنے کے لیے وہ کسی حاکمانہ قوت، کسی احتساب، اور کسی نظام تعزیری کے محتاج نہیں ہیں۔ اگر کوئی قوت جابرہ موجود نہ ہو تب بھی اس سے باز رہیں گے۔ بھیر یہ تحریم الہی تحریم نہیں ہے جس کو کسی طرح تحلیل سے بدلا جاسکتا ہو۔ اگر تمام عالم کے مسلمان بالاتفاق شراب کی تائید میں ووٹ دے دیں، تب بھی یہ حرام کبھی حلال نہیں ہو سکتا۔

آپ اس عظیم الشان تفاوت کے اسباب پر غور کریں گے تو اس سے چند ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو نہ صرف شراب کے معاملہ میں، بلکہ قانون و اخلاق کے تمام مسائل میں اصول کلیہ کا حکم رکھتی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسانی معاملات کی تنظیم میں اسلام اور دنیوی قوانین کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ دنیوی قوانین کا انحصار سراسر انسانی رائے پر ہے۔ سلفہ نہ صرف اپنے کلیات بلکہ ہر سہ جزئیہ میں عوام یا خواص کی رائے کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں اور انسانی رائے کا غواہ وہ عوام کی ہوا یا خواص کی (حال یہ ہے کہ وہ ہر آن انسانی امیال و عواطف، خارجی اسباب و عوامل، اور علم و عقل کے تغیر پذیر احکام سے) جو ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ صحیح ہوں، متاثر ہوتی لاتی ہے۔ ان تاثرات سے آراء و افکار میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ اس تغیر سے لازمی طور پر اچھے اور برے، صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز، حرام اور حلال کے معیارات بدلتے رہتے ہیں، اور ان کے بدلنے کے ساتھ ہی قانون کو بھی بدل جانا پڑتا ہے۔ اس طرح اخلاق اور تہذیب کا کوئی پائدار، مستقل، ناقابل تغیر معیار قائم ہی نہیں ہونے پاتا۔ انسان کا تلون قانون پر حکمرانی کرتا ہے، اور قانون کا تلون انسانی زندگی پر۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی نوشق آدمی موٹر چلارہا ہو اور اس کے ناز و نمود کا رہا تھ بے قاعدگی کے ساتھ اسٹیرنگ

کو کبھی ادھر اور کبھی اُدھر گھما رہے ہوں۔ اس کی ان بے قاعدہ گردشوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موٹر کی حرکت بھی بتائی  
 اور غیر مستقیم ہوگی، وہ استقلال کے ساتھ کسی ایک تعین راستہ پر نہ چل سکے گی، اور جب وہ اُڑی تو چھٹی رفتار پر چلے گی تو  
 خود چلانے والے حضرت ہی پر اس کا اثر پڑے گا۔ کبھی وہ سیدھے راستے پر ہوں گے اور کبھی ٹیڑھے راستہ پر،  
 کہیں کسی گڑھے میں جا گریں گے، کہیں کسی دیوار سے ٹکرائیں گے، اور کہیں نشیب و فراز کے دھچکے کھائیں گے۔  
 بخلاف اس کے اسلام میں قانون و اخلاق کے کلیات تمام تر، اور جزئیات میں رضی اللہ عنہما اور رسول کے  
 مقرر کیے ہوئے ہیں۔ انسانی رائے کو ان میں ذرہ برابر دخل نہیں ہے۔ اور جزئیات میں کسی حد تک فعل و  
 بھی تو وہ صرف اس قدر ہے کہ زندگی کے تغیر پذیر حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم ان کلی احکام اور جزئی نظام سے  
 حسبِ وقت نئے جزئیات مستنبط کرتے ہیں، جن کو لازماً اصول شرع کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس الہی قانون سازی  
 کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اخلاق اور مذہب کا ایک مستقل اور غیر تغیر پذیر معیار موجود ہے۔ ہمارے اخلاقی و مذہبی  
 قوانین میں تلون کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کل کا حرام آج حلال اور کل بھڑھام نہیں  
 ہو سکتا۔ یہاں تو جو حرام کر دیا گیا وہ ہمیشہ کے لیے حرام ہے، اور جو حلال کر دیا گیا وہ قیامت تک حلال  
 ہے۔ ہم نے اپنی موٹر کا اسٹینڈنگ ایک ماہر کامل کے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ اب ہم مطمئن ہیں کہ وہ موٹر کو  
 اور ہم کو سیدھے رستے پر چلائے گا۔ یٰثَبِّتْ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِی الْحَیْوٰۃِ  
 الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ وَ یُضِلّْ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ (اللہ ایمان لانے والے کو ایک جہی بات کے  
 ذریعہ سے دنیا اور آخرت کی زندگی میں ثبات اور قرار بخشتا ہے اور نافرمان ظالموں کو اوارہ کر دیتا ہے  
 کہ کہیں جمع نہیں سکتے۔)

اس میں ایک دوسرا اہم نکتہ بھی ہے۔ دنیوی طاقتیں انسانی زندگی کے لیے ضوابط بنانے، اور اخلاق،  
 معاشرت اور تمدن کی اصلاح کرنے کے لیے ہمیشہ اس کی محتاج تہ تیہ ہیں کہ ہر جزئی معاملہ میں پہلے عوام  
 کو اصلاح کے لیے رضی کریں، پھر عمل کی جانب قدم بڑھائیں۔ ان کے قوانین کی ہر دفعہ اپنے نفاذ کیلئے

عائتہ خلائق کی رضا پر منحصر ہوا کرتی ہے اور جس اصلاحی یا مصلحتی قانون کا نفاذ عوام کی رضا کے خلاف کرویا گیا ہو اسے سجدہ از خیر اہم ہائے بسیار منسوخ کرنا پڑتا ہے۔ یہ نہ صرف امریکہ کا تجربہ ہے بلکہ تمام دنیا کے تجربات اس بات پر تہیاد لئے رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیوی قوانین و حقیقت اصلاح اخلاق و معاشرت کے معاملہ میں ناکارہ ہیں، وہ جن بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں انہی کی رضا پر ان قوانین کا منظور یا منظور ہونا اور نفاذ یا منسوخ ہو جانا منحصر ہے۔

اسلام نے اس اشکال کو ایک دوسرے طریقہ سے حل کیا ہے، اور آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ شکل کا کوئی حل بجز اس کے نہیں ہے۔ وہ تمدن معاشرت اور اخلاق کے مسائل کو چھوڑنے، اور قوانین شریعت کی اطاعت کا مطالبہ کرنے سے پہلے انسان کو دعوت دیتا ہے کہ خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب پر ایمان لے آئے۔ یہ بات یقیناً انسان کی رضا پر منحصر ہے کہ وہ ایمان لائے یا نہ لائے مگر مثبت ایمان لے آیا تو اس کی رضا و عدم رضا کا کوئی سوال باقی نہ رہا۔ اب خدا کی طرف سے اس کا رسول جو حکم بھی دے، اور خدا کی کتاب جو قانون بھی مقرر کرے وہ اس کے لیے واجب الاطاعت ہے۔ اس ایک اصل کے قائم ہو جانے کے بعد شریعت اسلامی کے تمام قوانین اس پر نافذ ہو جائیں گے کہ کسی جزئی یا کلی مسئلہ میں اس کی رضا مندی یا نارضامندی کا دخل نہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں جو کام کرو روں بلکہ اربوں روپے کے صرف اور بے نظیر تبلیغ و اشاعت اور حکومت کی زبردست کوششوں کے باوجود نہ ہو سکا وہ عالم اسلامی میں خدا کی جانب سے رسول خدا کی صرف ایک منادی سے ہو گیا۔

تیسری سبق آموز بات یہ ہے کہ کوئی انسانی جماعت خواہ کتنی ہی علوم و فنون کی روشنی سے بہرہ ور ہو، اور خواہ عقلی ترقیات کے آسمان ہی پر کیوں نہ پہنچ جائے، اگر وہ الہی قوانین کی تابع فرمان نہ ہو اور ایمان کی قوت نہ رکھتی ہو تو کبھی ہوائے نفس کے چنگل سے نہیں نکل سکتی۔ اس پر خواہشات نفسانی کا غلبہ اتنا شدید رہے گا کہ جس چیز پر اس کا نفس مائل ہو گا اس کی مضرتیں اگر آفتاب سے بھی زیادہ روشن

کر کے دکھا دی جائیں، اگر اس کے خلاف سانس (یعنی پرستارِ عقل کے معبود) کو بھی گواہ بنا کر لا کھڑا کیا جائے، اگر اس کے مقابلہ میں اعداد و شمار کی بھی شہادت پیش کر دی جائے (جو اربابِ حکمت کی نگاہ میں ہرگز جھوٹی نہیں ہو سکتی)، اگر اس کی خرابیاں تجربہ و مشاہدہ سے بھی ثابت کر دی جائیں، تب بھی وہ کبھی اپنے نفس کے معشوق کو نہ جھوٹے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں حاتمہ اخلاقی پیدا کرنا اور اس کے ضمیر کی تشکیل کرنا، اور اس میں اتنی طاقت بھر دینا کہ وہ نفس پر غالب آجائے، عظیم و حکمت کے بس کی بات ہے، اور نہ عقل و خرد کی۔ یہ کام بجز ایمان کے اور کسی چیز کے ذریعہ سے انجام نہیں پاسکتا۔

(ترجمان القرآن - شوال ۱۳۵۲ھ - جنوری ۱۹۳۲ء)

## مغربی تہذیب کی خود کشی

سیاست، تجارت، صنعت و حرفت، اور علوم و فنون کے میدانوں میں مغربی قوموں کے حیرت انگیز اقدامات کو دیکھ کر بہت سے دل اور دماغ سخت و شہت زدہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید ان قوموں کی ترقی لازوال ہے۔ دنیا پر ان کے غلبہ اور تسلط کا کوئی فیصلہ ہو چکا ہے، ربح مسکوں کی حکومت، اور عناصر کی فرمانروائی کا انہیں ٹھیکہ دیدیا گیا ہے۔ اور ان کی طاقت ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی ہے کہ کسی کے اکھاڑے نہیں اکھڑ سکتی۔

ایسا ہی گمان ہر زمانے میں ان سب قوموں کے متعلق کیا جا چکا ہے جو اپنے اپنے وقت کی غالب قومیں تھیں۔ مصر کے فرعون، عرب کے عاد و ثمود، عراق کے کلدانی، ایران کے اکاسرہ، یونان کے جہانگیر فاتح، روم کے عالمگیر فرمانروا مسلمانوں کے جہاں کشا جہان نارا کے عالم سوز سپاہی، سب اس کڑے خاکی کے سٹیج پر اسی طرح غلبہ و قوت کے تماشے دکھا چکے ہیں۔ ان میں سے جس جس کے کھیل کی باری آئی، اس نے اپنی چلت پھرت کے ترتیب دکھا کر اسی طرح دنیا کو خیرت میں ڈال ڈال دیا ہے۔ ہر قوم جب اٹھی ہے تو وہ اسی طرح دنیا پر چھا گئی ہے۔ اسی طرح اس نے چار دانگ عالم میں اپنی شوکت و جبروت کے ڈنکے بجائے ہیں۔ اسی طرح دنیا نے مبہوت ہو کر گمان کیا ہے کہ ان کی طاقت لازوال ہے مگر جب ان کی اجل پوری ہو گئی اور حقیقت میں لازوال طاقت رکھنے والے فرمانروانے ان کے زوال کا فیصلہ صادر کر دیا، تو وہ ایسے گسے کہ اکثر تو صفحہ ہستی سے ناپید ہی ہو گئے، اور بعض کا نام و نشان اگر دنیا میں باقی رہا بھی، تو وہ اس طرح کہ وہ اپنے محکوموں کے محکوم ہوئے، اپنے غلاموں کے غلام بنے، اپنے مغلوبوں سے مغلوب کر رہے تھے کہ خلت مریج

قَبْلَكُمْ سَبِّحُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَلَّبِينَ۔

کائنات کا نظام کچھ اس طور پر واقع ہوا ہے کہ اس میں کہیں سکون اور ٹھہراؤ نہیں ہے۔ ایک بہیم حرکت بغیر اور گردش ہے جو کسی چیز کو ایک حالت پر قرار نہیں لینے دیتی ہر کون کے ساتھ ایک فساد ہی ہر بنا کے ساتھ ایک بگاڑ ہے، ہر بہار کے ساتھ ایک خزاں ہے، ہر چڑھاؤ کے ساتھ ایک تاراجی، اور یہی طرح اس کا عکس بھی ہے۔ ایک ماشہ بھر کا دانہ آج ہوا میں اڑا رہا پھر تاراجی ہو ہی زمین میں استحکام حاصل کر کے ایکٹ وڈر بن جاتا ہے، پر سوں وہی سوکھ کر پوند خاک ہو جاتا ہے، اور فطرت کی نوبخشے والی قوتیں اسے چھوڑ گئی دوسرے بیج کی پرورش میں لگ جاتی ہیں۔ یہ زندگی کے تار چڑھاؤ ہیں۔ انسان جب ان میں سے کسی ایک حالت کو زیادہ طویل مدت تک جاری رہتے ہوئے دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ حالت دائمی ہے۔ اگر اتار ہے تو سمجھتا ہے کہ اتار ہی رہے گا۔ اگر چڑھاؤ ہے تو خیال کرتا ہے کہ چڑھاؤ ہی رہے گا۔ لیکن یہاں فرق جو کچھ بھی ہے دیر اور سویر کا ہے۔ دوام کسی حالت میں بھی نہیں ہے۔ وَلَنُلَاقِيَهُمْ لَاقِيًا وَهُمَا بِآيَاتِنَا لَا يَحْتَسِبُونَ۔ دنیا کے حالات ایک طرح کی دوری حرکت میں گردش کر رہے ہیں۔ پیدائش اور موت، جوانی اور بڑھاپا، قوت اور ضعف، بہار اور خزاں، ہی اور پھر مرگ، سب ہی گردش کے مختلف پہلو ہیں۔ اس گردش میں باری باری سے ہر چیز پر ایک دور اقبال کا آتا ہے جس میں وہ بھٹی ہے، پھٹی ہے، قوت اور زوال دکھاتی ہے، حسن اور بہار کی نمائش کرتی ہے، حتیٰ کہ اپنی ترقی کی انتہائی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ پھر ایک دوسرا دور اقبال کا آتا ہے جس میں وہ گھٹتی ہے، مر جھکتی ہے، ضعف اور ناتوانی میں مبتلا ہوتی ہے، اور آخر کار وہی قوتیں اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں جنہوں نے اس کی ابتدا کی تھی۔

یہ اپنی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، اور دنیا کی سب چیزوں کے مانند ہی سنت انسان پر بھی جاری ہے، خواہ اس کو فرد کی حیثیت سے لیا جائے یا قوم کی حیثیت سے۔ ذلت اور عزت، غم اور مسرت، تنزل اور ترقی، اور یہی ہی دوسری تمام کیفیات ایسی دوری حرکت کے ساتھ مختلف افراد اور مختلف قوموں

میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ باری باری سے سب پر یہ دور گزرتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس تقسیم میں کھینچے نہ ہو، یا جس پر کسی ایک کیفیت کو دوام بخشا گیا ہو عام اس کے کہ وہ اقبال کی کیفیت ہو یا اوبار کی۔ سُبْحَانَ اللَّهِ فِي الدِّينِ خَلَقُوا مِنْ قَبْلُ وَلَكِنْ تَحْدِثُ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔

روئے زمین کے چپہ چپہ پر ہم کو ان قوموں کے آثار ملتے ہیں جو ہم سے پہلے ہو گزری ہیں۔ وہ اپنے تمدن و تہذیب، اپنی صنعت و کاریگری، اپنی ہنرمندی و چالیک دستی کے ایسے نشانات دنیا میں چھوڑ گئی ہیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل کی ترقی یافتہ و غالب قوموں کچھ کم نہ تھیں بلکہ اپنے ہم عصروں پر ان کا غلبہ کچھ ان سے زیادہ تھا۔ کَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً قَاتِلًا وَمُكَرَّمًا عَمَهُمْ وَهُمَا أَكْثَرُ مَلْعَمَةً۔ مگر پھر ان کا حشر کیا ہوا؟ اقبال سامنے دیکھ کر وہ دھوکا کھا گئے۔ مغموں کی بارش نے ان کو غرہ میں ڈال دیا خوشحالی ان کے لیے فتنہ بن گئی غلبہ اور حکومت سے مخمور ہو کر وہ جبار و قہار بن بیٹھے۔ انھوں نے اپنے کرتوتوں سے اپنے نفس پر آپ ظلم کرنا شروع کر دیا دَابَّةً لَدُنْ ظَلَمُوا أَمَّا اتَّزِفُوا فَيَدِّ وَأَكَانُوا هَجِيمِينَ۔ خدا نے ان کی سرکشی کے باوجود ان کو ڈھیل دی۔ وَكَانَ مِنْ قَرِيبًا أَمَلَيْتُمْ هَآؤِهِ ظَالِمَةً۔ اور یہ ڈھیل بھی کچھ معمولی ڈھیل نہ تھی بعض تو توں کو صدیوں تک یونہی ڈھیل دی جاتی رہی۔ وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ۔ مگر پھر ان کے لیے ایک نیا فتنہ بن گئی۔ وہ سمجھے کہ خدا ان کی تدبیروں کے مقابلہ میں عاجز آ گیا ہے، اور اب نیا پر خدا کی نہیں ان کی حکومت ہو۔ آخر کار قہر الہی بھڑک اٹھا۔ ان کی طرف سے نظر غایت پھر گئی۔ اقبال کے بجائے اوبار کا دور آ گیا۔ ان کی چالوں کے مقابلہ میں خدا بھی ایک چال چلا۔ مگر خدا کی چال ایسی تھی کہ وہ اس کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے پھر اس کا توڑ کہاں سے کرتے؟ وَمَكْرُؤًا مَكَرًا وَمَكْرُؤًا مَكَرًا وَهُمْ أَكْثَرُ مَعْجُونَ۔ خدا کی چال سامنے سے نہیں آتی، خود انسان کے اندر سے اس کے دماغ اور دل میں سر اُس کے اپنا کام کرتی ہے۔ وہ انسان کی عقل، اس کے شعور، اس کی تیز، اس کی فکر، اس کے حواس پر چھا کر ہے،

وہ اس کے ہیے کی آنکھیں پھوڑتی ہے۔ وہ اس کو نگھول کا اندھا نہیں بلکہ عقل کا اندھا بنا دیتی ہے۔ فَاتَّخَذَ الرَّكْعِيُّ لَوَابِصَارًا وَلَكِنَّ نَعْيَ الْقُلُوبِ الَّتِي فِي الصُّدُورِ اور جب اس کے دل کی آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں تو ہر تدبیر جو وہ اپنی بہتری کے لیے سوچتا ہے، وہ اٹھی اس کے خلاف پڑتی ہے۔ ہر مذمہ جو وہ کہنا کے مقصود کی طرف بڑھاتا ہے، وہ اس کو ہلاکت کے جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کی ساری قوتیں خود اس کے خلاف بغاوت کر دیتی ہیں۔ اور اس کے اپنے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مُكْرِمِهِمْ إِنَّكَ مَرِنَا لَهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ۔

اس اقبال وادبار کا ایک مکمل نقشہ ہم کو آل فرعون اور بنی اسرائیل کے قصے میں ملتا ہے اہل حضر رقی کے انتہائی مدارج کو پہنچ گئے تو انھوں نے ظلم و سرکشی پر کمر باندھی۔ ان کے بادشاہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا، اور ایک مکرور قوم بنی اسرائیل کو جو حضرت یوسف کے زمانے میں وہاں جا کر آباد ہو گئی تھی، حد سے زیادہ جوڑو ستم کا تختہ مشق بنایا۔ آخر جب اس کی اور اہل مصر کی سرکشی حد بڑھ گئی تو خدا نے ارادہ کیا کہ ان کو نچا دکھائے اور اسی ضعیف قوم کو سر بلند کرے جس کو وہ ہیچ سمجھتے تھے چنانچہ اللہ کا ارادہ پورا ہوا اس ضعیف قوم میں حضرت موسیٰ پیدا کئے گئے۔ ان کو خود فرعون کے گھر میں خود اس کے ہاتھوں سے پرورش کرایا گیا اور انھیں اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائیں۔ انھوں نے فرعون کو نرمی کی راہ سے سمجھایا مگر وہ باز نہ آیا۔ خدا کی طرف سے فرعون اور اس کی قوم کو سلسل تنبیہیں لگیں مگر پھر قحط پڑے طوفان پر طوفان آئے۔ خون برسا۔ مٹی دل ان کی کھینچوں کو چاٹ گئے۔ جوؤں اور میتوں نے ان کو خوب تباہ مگر ان کے تکبر میں فرق نہ آیا۔ فَاسْتَكَبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا فَجُورًا۔ جب تمام جحیمیں ایک ایک کر کے ختم ہو گئیں تو عذاب الہی کا فیصلہ نافذ ہو گیا۔ خدا کے حکم سے حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل گئے۔ فرعون اپنے لشکروں سمیت سمند میں غرق کر دیا گیا اور مصر کی طاقت ایسی تباہ ہوئی کہ صدیوں تک نہ بھر سکی۔ فَاخَذَ اللَّهُ جُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ۔

چربی اسرائیل کی باری آئی۔ مصری قوم کو گرانے کے بعد کائنات کے قیمتی فرمانروا نے اس قوم کو زمین کی حکومت بخشی جو دنیا میں ذلیل و خوار تھی۔ **وَاورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مَشارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَہَا الَّتِیْ بَلَدُکُمْ فِیْہَا وَتَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ الْحَسْبِیْ عَلٰی بَنِیْ سُرَیْسِلَ بِمَا صَبَرُوا۔** اور اس کو دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت عطا فرمائی **وَآتٰی فَضْلَکُمْ عَلٰی الْعَالَمِیْنَ۔** مگر فضیلت اور وراثت انہی حسن عمل کی شرط کے ساتھ مشروط تھی۔ حضرت موسیٰ کی زبان سے پہلے ہی کہوا دیا گیا تھا کہ تم کو زمین کی خلافت دی تو ضرور جائے گی، مگر اس بات پر بھی نظر رکھی جائے گی کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟ **کَیْفَ تَعْمَلُونَ؟** اور یہ وہ شرط ہے جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ جس قوم کو بھی زمین کی حکومت دی جاتی ہے اس پر یہی شرط لگا دی جاتی ہے **ثُمَّ جَعَلْنَاکُمْ خَلَائِفَ فِی الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِہُمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُونَ۔**

پس جب بنی اسرائیل نے اپنے رب کشرشی کی، اس کے کلام میں تحریف کی، حق کو باطل سے بدل دیا، حرام خوردی، جھوٹ، بے ایمانی اور ٹھکنی کا فیہوہ اختیار کیا، زبردست، جریس، بزدل اور آرام طلب بن گئی، اپنے انبیاء کو قتل کیا، حق کی طرف بلانے والوں سے دشمنی کی، اللہ خیر سے منہ موڑا، اللہ شریک اطاعت اختیار کیا، تو رب العالمین کی نظر ان کی طرف سے پھر گئی۔ ان سے زمین کی وراثت چھین لی گئی۔ ان کو عراق، یونان، اور روم کے جابر سلاطین سے پامال کرایا گیا۔ ان کو گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔ ان کو ذلت و خواری کے ساتھ ملک ملک کی ناک چھنوائی گئی، حکومت کا استحقاق ہمیشہ کے لیے ان سے چھین لیا گیا۔ تین ہزار برس سے وہ خدا کی لعنت میں ایسے گرفتار ہوئے ہیں کہ دنیا میں ان کو کہیں عزت کا ٹکسہ کا نہیں ملتا۔ **وَضَرَبْتَ عَلَیْہُمُ الدِّلَالَہُ وَالسَّکَنَہُ وَبَاؤُوا الْعِصَابَ مِنَ اللہِ۔**

آج اسی سنتِ الہی کا اعادہ پھر ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے جس شامتِ انہال میں پہلی قوم میں گرفتار ہوئی تھیں اسی شامت آج مغربی قوموں کو ان پکڑا ہے جنہیں نہیں ملکتی تھیں وہ سب ان کو دی جا چکی

ہیں جنگ عظیم کے مصائب، معاشی مشکلات، بے کاری کی کثرت، ارض خیمہ کی شدت، نظام عالمی کی برہمی، یہ سب کھلی ہوئی روشن آیات ہیں جن سے وہ گرا نکھیں رکھنے تو معلوم کر سکتے تھے کہ ظلم، کسرتی، نفس پرستی، اور حق فراموشی کے کیا نتائج ہونے ہیں۔ مگر وہ ان آیات سے سبق نہیں لیتے۔ حتیٰ سے منہ موڑنے پر برابر اصرار کیے جا رہے ہیں۔ ان کی نظر علتِ مرض تک نہیں پہنچتی۔ وہ صرف شمارِ مرض کو دیکھتے ہیں اور انہی کا علاج کرنے میں اپنی ساری تداہیر صرف کر رہے ہیں اسی لیے جوں جوں دوا کی جاتی ہے مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اب حالات کہہ رہے ہیں کہ تنبیہوں اور تحذیروں کا دور ختم ہونے والا ہے اور آخری فیصلہ کا وقت غریب ہے۔

قدرتِ الہی نے دوزیرِ دستِ شیطان مغربی قوموں پر سلاطین کر دیے ہیں جو ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف کھینچنے لیے جا رہے ہیں۔ ایک قطعِ نسل کا شیطان ہے اور دوسرا قوم پرستی کا شیطان پہلا شیطان ان کے افراد پر سلاطین ہے اور دوسرا ان کی قوموں اور سلطنتوں پر پہلے نے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کی عقلیں خراب کر دی ہیں۔ وہ خود ان کے اپنے ہاتھوں سے ان کی نسلوں کا استیصال کر رہا ہے وہ انہیں منعِ حمل کی تدبیریں سمجھاتا ہے۔ اسقاطِ حمل پر آمادہ کرتا ہے۔ عملِ تعظیم (Sterilisation) کے فوائد بتاتا ہے جس سے وہ اپنی قوتِ تولید کا بیج ہی مار دیتے ہیں۔ انہیں آناشتیِ القلب بنا دیتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو آپ ہلاک کرتے ہیں۔ بغضِ شیطان وہ ہے جو تدبیرِ ج ان سے خود کشی کر رہا ہے۔

دوسرے شیطان نے ان کے بڑے بڑے سیاسی دبڑوں اور جنگی سپہ سالاروں سے صحیح فکر اور صحیح تدبیر کی قوت سلب کر لی ہے۔ وہ ان میں خود غرضی، سابلت، منافرت، عصبیت، اور حرصِ طمع کے جذبات پیدا کر رہا ہے۔ وہ ان کو خیاں اور مماندگروہوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ انہیں ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھایا جا رہا ہے کہ یہ بھی عذابِ الہی کی ایک صورت ہے اَوَّلَیْکُمْ کُفْرٌ بِمَا اُوْدِنَ بِقَ بَعْضُکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۔ وہ ان کو ایک بڑی زبردست خود کشی کے لیے تیار کر رہا ہے جو تدبیرِ جی نہیں بلکہ انی ہوگی۔

اس نے تمام دنیا میں باروت کے خزانے جمع کر دیے ہیں اور جگہ جگہ خطرے کے مرکز بنا رکھے ہیں۔ اب وہ صرف ایک وقت کا منتظر ہے جو یہی کہ اس کا وقت آیا وہ کسی ایک خزانہ باروت کو تباہ کھا دیگا اور پھر ان کی آن میں وہ تباہی نازل ہوگی جس کے آگے تمام پھیلی قوموں کی تباہیاں بیچ ہو جائیں گی۔

یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں کئی قسم کا مبالغہ نہیں ہے۔ بلکہ یورپ امریکہ اور جاپان میں آئندہ جنگ کے لیے جس قسم کی تیاریاں کی جا رہی ہیں ان کو دیکھ دیکھ کر خود ان کے اہل بصیرت لرز رہے ہیں، اور اس جنگ کے نتائج کا تصور کر کے ان کے حواس باختہ ہوئے جاتے ہیں حال میں سرجن نیومن (Sergei Neumann) نے جو پہلے امریکہ کے نظری اٹاف کا ایک رکن تھا، آئندہ جنگ پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ آئندہ جنگ محض فوجوں کی لڑائی نہیں ہوگی بلکہ اسے ایک قتل عام کہنا چاہیے جس میں عورتوں اور بچوں تک کو نہ چھوڑا جائے گا۔ سائنس دانوں کی عقل نے جنگ کا کام سپاہیوں سے چھین کر کیمیاوی مرکبات اور بے روح آلات کے سپرد کر دیا ہے جو مست اقل (Combatants) اور غیر مقاتل (Non-Combatants) میں تمیز کرنے سے قاصر ہیں۔

اب محارب طاقتوں کی لڑائی میدانوں اور قلعوں میں نہیں بلکہ شہروں اور بستیوں میں ہوگی کیونکہ جدید نظریہ کے مطابق غنیم کی اصلی قوت فوجوں میں نہیں بلکہ اس کی آبادیوں، اس کی تجارتی منڈیوں اور صنعتی کارگاہوں میں ہے۔ اب ہوائی جہازوں سے طرح طرح کے بم برسائے جائیں گے جن سے آتش فشاں نائے زہریلی ہوائیں، امراض کے جراثیم پھیل کر وقت واحد میں ہزاروں لاکھوں کی آبادی کو نیست و نابود کر دیں گے۔ ان میں سے ایک قسم کے بم (Lewisite Bombs) ایسے ہیں جن کا ایک گولہ لندن کی بڑی سے بڑی عمارت کو بارہ بارہ بارہ کر سکتا ہے۔ ایک زہریلی ہوا (Green Cross Gass) کے نام سے موسوم ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کو سونگھے گا وہ ایسا محسوس کرے گا کہ گویا پانی میں ڈوب گیا ہو ایک دوسری قسم کی زہریلی ہوا (Yellow Cross) میں سانپ کے زہر کی سی خاصیت اور اس کے سونگھنے سے

بالکل وہی اثرات ہوتے ہیں جو سانپ کے کاٹے سے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی بارہ زہریلی ہوائیں اور بھی ہیں جو تقریباً غیر مرئی ہیں۔ ان کے اثرات ابتداءً بالکل محسوس نہیں ہوتے اور جب محسوس ہوتے ہیں تو تدریجاً علاج کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ ان میں سے ایک خاص ہوا ایسی ہے جو بہت بلندی پر پہنچ کر پھیل جاتی ہے اور جو ہوائی جہاز اس کے حلقہ سے گزرتا ہے اس کا چلانے والا ایک اندھا ہو جاتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ بعض زہریلی ہوائیں اگر ایک ٹن کی مقدار میں شہر پر برس پڑھو رومی جائیں تو ایک گھنٹہ کے اندر اس کو کلیتہً تباہ کیا جاسکتا ہے اور یہ ایسا کام ہے جس کو انجام دینے کے لیے صرف... ہوائی جہاز کافی ہیں۔

حال میں ایک برقی آتش فشاں گولہ ایجاد کیا گیا ہے جس کا وزن صرف ایک کلو گرام ہوتا ہے مگر اتنے سے گولہ میں یہ قوت ہے کہ جب کسی چیز سے اس کا تصادم ہوتا ہے تو دفعۃً تین ہزار درجہ فارن ہٹ کی حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس سے ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے جو کسی چیز سے بجھائی نہیں جاسکتی۔ پانی اس کے حق میں بڑول ثابت ہوا ہے اور ابھی تک سائنس اس کے بجھانے کا کوئی طریقہ دریافت نہیں کر سکا ہے۔ خیال یہ ہے کہ ان کو شہروں کے بڑے بڑے بازاروں پر پھینکا جائے گا تاکہ اس سرے سے اس سرے تک آگ لگ جائے، پھر جب لوگ سراپیم ہو کر بھاگنے لگیں گے تو ہوائی جہازوں سے زہریلی ہواؤں کے بم برسائے جائیں گے جن سے تباہی کی تکمیل ہو جائے گی۔

ان ایجادات کو دیکھ کر ماہرین فن نے اندازہ لگایا ہے کہ چند ہوائی جہازوں سے دنیا کے بڑے سے بڑے اور محفوظ دار السلطنت کو دو گھنٹوں میں پوینڈ خاک کیا جاسکتا ہے۔ لاکھوں کی آبادی کو اس طرح مسموم کیا جاسکتا ہے کہ رات کو اچھے خاصے سوئیں اور صبح کو ایک بھی زندہ نہ اٹھے۔ زہریلے مادوں کا ایک پورے ملک میں پانی کے ذخائر کو مسموم، مویشی اور حیوانات کو ہلاک، کھیتوں اور باغوں کو غارت کیا جاسکتا ہے۔ ان تباہ کن حملوں کی مدافعت کا کوئی مؤثر ذریعہ ابھی ایجاد نہیں ہوا ہے بجز اس کے کہ دونوں محارب فریق ایک دوسرے پر اسی طرح حملے کریں اور دونوں ہلاک ہو جائیں۔

یہ آئندہ جنگ کی طیاروں کا ایک مختصر بیان ہے۔ اگر آپ تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہوں تو کتاب  
 What Would Be the Character of A New War (ملاحظہ کیجیے جو جینیوا کی انٹرنیشنل  
 یونین نے باقاعدہ تحقیقات کے بعد شائع کی ہے۔ اس کو پڑھ کر آپ اندازہ کر لیں گے کہ مغربی تہذیب کس طرح  
 اپنی ہلاکت کا سامان اپنے ہاتھوں فراہم کیا ہے۔ اب اس کی عمر کا امتداد صرف اعلان جنگ کی تاریخ تک  
 ہے جس روز دنیا کی دو بڑی سلطنتوں کے درمیان جنگ چھڑی اسی روز سمجھ لیجیے کہ مغربی تہذیب کی تباہی  
 کے لیے خدا کا فیصلہ صادر ہو چکا۔ کیونکہ دو بڑی سلطنتوں کے میدان میں اترنے کے بعد کوئی چیز جنگ کو  
 عالمگیر ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ اور جب جنگ عالمگیر ہوگی تو تباہی بھی عالمگیر ہی ہوگی۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ دِيمَا  
 كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيَلْبِسُوهُمْ بِغَضَبٍ  
 الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يُرْجَعُونَ۔ (الروم: ۵)

لوگوں کے اپنے ہاتھوں کے ہونے کے قوتوں سے خشکی اور تری  
 میں فساد رونما ہو گیا ہے تاکہ انھیں ان کے بعض اعمال  
 کا جزا کھلائے۔ شاید وہ اب بھی رجوع کریں۔

بہر حال اب قریب ہے کہ وراثت الارضی کا نیا بندوبست ہو، اور ظالمین و مسرفین کو اگر کسی دوسری  
 قوم جو غالباً مستضعفین ہی میں سے ہوگی، زمین کی خلافت پر سرفراز کیا جائے۔ دیکھنا ہے کہ اس مرتبہ  
 حضرت حق کی نظر انتخاب کس پر پڑتی ہے۔

ہمارے پاس یہ علوم کہنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آئندہ کنسی قوم اٹھائی جائے گی۔ یہ اللہ کی دین  
 جس سے چاہتا ہے پھینتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُوْذِ الْمُلْکِ  
 مَنْ نَّشَاءُ وَفَنَزِعْ الْمُلْکَ مِمَّنْ نَّشَاءُ مگر اس معاملہ میں بھی اس کا ایک قانون ہے جسے اس نے اپنی  
 کتاب عزیز میں بیان فرمادیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک قوم کو جب وہ اس کے برے اعمال کی وجہ سے  
 گرتا ہے، تو اس کی جگہ کسی ایسی قوم کو اٹھاتا ہے جو اس منضوب قوم کی طرح بدکار اور اس کے مانند کرشن نہ ہو۔  
 وَاِنْ تَتَوَلَّوْا اَیْسَبْدِلْ قَوْمًا

اگر تم نے روگردانی کی تو وہ تمھارے بجائے کسی اور قوم کو

غَيْرِكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَلَكُمْ (۴:۴۷) اٹھائے گا پھر وہ لوگ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔  
 اس لیے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو کمزور اور مغلوب النفس قومیں مغربی تہذیب کی نقا  
 کر رہی ہیں اور فرنگی اقوام کے محاسن کو (جو تھوڑے بہت ان میں باقی رہ گئے ہیں) اختیار کرنے کے  
 بجائے ان کے معائب کو اختیار کر رہی ہیں (جو ان کے مغضوب ہونے کی علت ہیں) ان کے لیے  
 آئندہ انقلاب میں کامیابی و سرفرازی کا کوئی موقع نہیں ہے۔  
 (ترجمان القرآن - جمادی الاخریٰ ۱۳۵۲ھ - اکتوبر ۱۹۳۳ء)

## لارڈ لوٹھین کا خطبہ

جنوری کے آخری ہفتہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کانوکیشن (جلدہ تقسیم اسناد) کے موقع پر لارڈ لوٹھین نے جو خطبہ دیا ہے، وہ درحقیقت اس قابل ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ — جدید اور قدیم دونوں — اس کو گہری نظر سے دیکھیں اور اس سے سبق حاصل کریں۔ اس خطبہ میں ایک ایسا آدمی ہمارے سامنے اپنے دل و دماغ کے پردے کھول رہا ہے جس نے علوم جدیدہ اور ان کی پیدا کردہ تہذیب کو محض قدس نہیں دیکھا ہے بلکہ خود اس تہذیب کی آغوش میں خم لیا ہے اور اپنی زندگی کے ۵۶ سال اسی سمندر کی غواہی میں گزارے ہیں۔ وہ پیدائشی اور خاندانی یورپین ہے، آکسفورڈ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، ”راؤنڈ ٹیبل“ جیسے مشہور سالے کا ایڈیٹر رہ چکا ہے اور قریب قریب ۲۲ سال سے سلطنت برطانیہ کے ہمارے امور میں ذمہ دارانہ حصہ لیتا رہا ہے۔ وہ کوئی بیرونی ناظر نہیں ہے بلکہ مغربی تہذیب کے اپنے گھر کا آدمی ہے اور وہ ہم سے بیان کرتا ہے کہ اس گھر میں اہل خرابیاں کیا ہیں، کس وجہ سے ہیں اور اس گھر کے لوگ اس وقت درحقیقت کس چیز کے پیالے سے پو رہے ہیں۔

ایک عیشیت یہ خطبہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے سبق آموز ہے کیونکہ اس سے ان کو معلوم ہوگا کہ مغربی علوم اور ان کی پیدا کردہ تہذیب نری تریاق ہی تریاق نہیں ہے بلکہ اس میں بہت کچھ زہر بھی ملا ہوا ہے جن لوگوں نے اس معجون کو بنایا اور صدیوں استعمال کیا وہ آج خود آپ کو آگاہ کر رہے ہیں کہ خبردار اس معجون کی پوری خوراک نہ لینا، یہیں تنہا ہی کے کنارے پہنچا چکی ہے اور تمہیں بھی تباہ کر کے رہے گی۔ ہم خود اس وقت تریاق خالص کے محتاج ہیں۔ اگرچہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم نہیں، مگر گمان ضرور

ہوتا ہے کہ وہ تریاق تھا رہے پاس موجود ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے تریاق کو خاک میں ملا کر جاری اس زہر کو دمچون کے مرے پر لگ جاؤ۔

دوسری حیثیت سے اس خطبہ میں ہمارے علماء اور مذہبی طبقوں کے لیے بھی کافی سامان بصیرت اس سے وہ اندازہ کر سکیں گے کہ اس وقت جس دنیا میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے سامنے اسلامی تعلیمات کے کن پہلوؤں کو روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کئی صدیوں سے ماذہ پرستی کی تہذیب کا تجربہ کر رہی ہے اور اب اس سے تھک چکی ہے صدیوں پہلے روح تحقیق اور آزادی فکر کا جو تریاق ہم نے اہل فرنگ کو ہم بھینچا تھا، اس کو خود انھوں نے محض نادانگی میں لاندہ ہی اور اُذیت کے زہر سے الودہ کر دیا اور دونوں کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب کی معجون تیار کی۔ اس معجون کا تریاق اپنے زور سے انہیں ترقی کے آسمان پر اٹھائے گیا، مگر اس کا زہر بھی برابر اپنا کام کرتا رہا، یہاں تک کہ اب تریاق پر زہر کا اثر پوری طرح غالب ہو چکا ہے۔ اس کے تلخ نتائج کو خوب اچھی طرح بھگت لینے کے بعد اب وہ پھر تریاق کی مزید خوراک کے لیے چاروں طرف نظر دوڑا رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان کی معجون میں زہریلے اجزاء کون کون سے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان اجزاء کے ملنے سے ان کی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے۔ وہ اب بھی صاف طور پر محسوس کر رہے ہیں کہ ان اثرات کو دور کرنے کے لیے کس قسم کا تریاق انھیں درکار ہے، مگر صرف یہ بات ان کو معلوم نہیں کہ جس تریاق کے وہ طالب ہیں، وہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کسی کے پاس نہیں اور یہ آخری خوراک بھی ان کو اُسی دوا خانے سے ملے گی جہاں پہلی خوراک ملی تھی۔ اس مرحلے تک پہنچ جانے کے بعد بھی اگر وہ تریاق کیلئے بھگتے رہیں اور بے نپا کر اپنے زہر سے ساری دنیا کو مسموم کیے چلے جائیں، تو اس گناہ عظیم میں ان کے تھ علماء اسلام بھی برابر کے شریک ہوں گے علماء کے لیے اب یہ وقت نہیں ہے کہ وہ اہلیات اور باطلہ طبیعات، اور فقیہی جزئیات کی بحثوں میں لگے رہیں۔ رسول اللہ کو علم غیب تھا یا نہ تھا، خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ رسول اللہ کا نظیر ممکن ہے یا نہیں؟ ایصالِ ثواب اور زیارتِ قبور کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ امین یا کفر و فسق؟

کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ مسجدیں منبر و محراب کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بیسیوں مسائل کچھ طے کرنے میں آج ہمارے پیشوایانِ دین اپنی ساری قوتیں ضائع کرتے ہیں، دنیا کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے طے ہو جانے سے ہدایت و ضلالت کی اس عظیم الشان لڑائی کا تصفیہ نہیں ہو سکتا جو اس وقت تمام عالم میں چھڑی ہوئی ہے۔ آج اصلی ضرورت ان مسائل کے سمجھنے کی ہے جو ناخدا شعی اور لادینی کی بنیاد پر علم اور تمدن کے صدیوں تک نشو و نما پاتے رہنے سے پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کی پوری پوری تشخیص کر کے اصول اسلام کے مطابق ان کا قابلِ عمل حل پیش کرنا وقت کا اصلی کام ہے۔ اگر علماء اسلام نے اپنے آپ کو اس کام کا اہل نہ بنایا، اور اسے انجام دینے کی کوشش نہ کی تو یورپ اور امریکہ کا جو حشر ہو گا سو ہو گا خود دنیا کے اسلام بھی تباہ ہو جائے گی۔ کیونکہ وہی مسائل جو مغربی ممالک کو درپیش ہیں، تمام مسلم ممالک اور ہندوستان میں پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو چکے ہیں اور ان کا کوئی صحیح حل ہم نہ پہنچنے کی وجہ سے مسلم اور غیر مسلم کے سب ان لوگوں کے اُلٹے سیدھے نسخے استعمال کرتے چلے جا رہے ہیں جو خود بیمار ہیں۔ اب یہ معاملہ صرف یورپ اور امریکہ کا نہیں بلکہ ہمارے اپنے گھر اور ہماری آئندہ نسلوں کا ہے۔

ان وجوہ سے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اور علماء، دونوں، لارڈ لوٹھین کے اس خطبے کو غور سے ملاحظہ کریں۔ بیچ میں حسب ضرورت ہم مطالب کی تشریح کرتے جائیں گے تاکہ مغزِ کلام تک پہنچنے میں مزید یہولت ہو۔

لارڈ لوٹھین اپنی بحث کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:-

”ایک اور امتیازِ طلب ہے جس کی طرف آج میں آپ کی توجہ منقطع کرانا چاہتا ہوں۔ کیا ہندوستان دو جدید کی سائنٹفک اور عقلی تعلیم کے اس شدید نقصان سے بچ سکتا ہے جس میں یورپ اور امریکہ آج کل مبتلا ہیں؟

مغرب میں حکمتِ جدیدہ سے دو بڑے نتیجے رونما ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو اس نے

فطرت اور اس کی طاقتوں پر انسان کی دست رس کو بہت زیادہ وسیع کر دیا۔ دوسری طرف اسے  
یونیورسٹیوں کے تعلیم پائے ہوئے لوگوں پر اور عوام ساری ہی دنیا میں متواتر نہایت کے اقتدار کو کوڑا کر دیا۔  
دنیا نے جدید کی کلم از کم آدھی خرابیاں دراصل انہی دو اسباب پیدا ہوئی ہیں۔ تہذیب یافتہ آدمی ان  
طاقتوں کے نشے سے چور ہو گیا ہے جو سائنس نے اس کو فراہم کر دی ہیں۔ مگر اس نے علم اور تمدن  
کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاق میں مساوی ترقی نہیں کی جو اس بات کی ضامن ہو سکتی تھی کہ یہ طاقتیں  
انسان کی تباہی کے بجائے اس کی بھلائی کے لیے استعمال ہوں۔

اس تہذیب میں فاضل خطیب نے دراصل انسانی تہذیب و تمدن کے ایک بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے  
سائنس مجرد سائنس ہونے کی حیثیت سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ تحقیق و اجتہاد اور تلاش و تجسس کی ایک لگن ہے  
جس کی بدولت انسان کو عالم طبیعی کی چھپی ہوئی قوتوں کا حال معلوم ہوتا ہوا اور وہ اس کام لینے کے ذرائع فراہم کرتا  
ہے۔ اس علم کی ترقی سے جو نئی طاقتیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں، ان کو جب وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کر  
لگتا ہے تو یہ تمدن کی ترقی کہلاتی ہے لیکن یہ دونوں چیزیں بجائے خود انسان کی فلاح کی ضامن نہیں ہیں۔ یہ  
جس طرح فلاح کی موجب ہو سکتی ہیں اسی طرح تباہی کی موجب بھی ہو سکتی ہیں۔ ہاتھ سے کام کرنے کے بجائے اگر  
انسان مشین سے کام کرنے لگا، جانوروں پر سفر کرنے کے بجائے اگر ریل اور موٹر اور بحری و ہوائی جہازوں پر دوڑنے  
لگا، ڈاک چوکیوں کے بجائے اگر تار برقی اور الیکٹریک سے خبر رسانی ہونے لگی، تو اس معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان پہلے  
سے زیادہ خوشحال ہو گیا۔ ان چیزوں سے جس قدر اس کی خوشحالی بڑھ سکتی ہے اسی قدر اس کی مصیبت اور  
تباہی بھی بڑھ سکتی ہے، کیونکہ جس دور و تمدن میں انسان کے پاس صرف تیر و خمیر کے آلات تھے، اس کے مقابلہ  
میں وہ تمدن بدرجہا زیادہ مہلک ہو سکتا ہے جس میں اس کے پاس مشین گنیں اور زہریلی گمیں، ہوائی جہاز اور  
تحت البحر کشتیاں ہوں۔ ترقی علم و تمدن کے موجب فلاح یا موجب ہلاکت ہونے کا تمام تر پختہ اس تہذیب  
پر ہے جس کے زیر اثر علوم و فنون اور تمدن و حضارت کا ارتقا ہوتا ہے۔ ارتقا کا راستہ، انسانی مساعی کا مقصد

اور حاصل شدہ طاقتوں کا مصرف متعین کرنے والی چیز دراصل تہذیب ہے یہی انسان اور انسان کے باہمی تعلق کی نوعیت طے کرتی ہے یہی اجتماعی زندگی کے اصول، انفرادی، قومی اور بین الاقوامی معاملات کے اخلاقی قوانین بناتی ہے اور فی الجملہ یہی چیز انسان کے ذہن کو اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے تیار کرتی ہے کہ علم کی ترقی سے ہوا طاقتیں کس کو حاصل ہوں انہیں اپنے تمدن میں کس صورت میں داخل کرے، کس مقصد کے لیے اور کس طرح ان کو استعمال کرے، مختلف استعمالات میں سے کن کو ترک اور کن کو اختیار کرے۔ عالم طبیعی (Physical World) کے مشاہدات اور قوانین طبیعی کے معلومات بجائے خود کسی اعلیٰ تہذیب کی بنیاد نہیں بن سکتے کیونکہ ان کی رو سے انسان کی حیثیت ایک غی عقل حیوان سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کی مدد سے صرف وہی نظریہ حیات قائم کیا جاسکتا ہے جو مادی دین کا نظریہ ہے یعنی یہ کہ انسان کے لیے زندگی بس یہ دنیا کی زندگی ہے، اس زندگی میں اپنی حیوانی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ کمال کیسے پورا کرنا اس کا منہبائے مقصود ہے، اور کائنات میں جو تنازع للبقاء اور انتخاب طبیعی اور بقائے صالح کا قانون جاری ہے، اس سے ہم آہنگ بن جانا اور گرد و پیش کی تمام مخلوقات کو کچل کر خود سب پر غالب ہو جانا ہی طاقت کا اصل مصرف ہے۔ یورپ جو تہذیب اختیار کی وہ اسی نظریہ حیات پر مبنی تھی اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم اور تمدن کی ترقی نے انسان کو جس قدر طاقتیں ہم پہنچائیں وہ سب انسانیت کی فلاح کے بجائے اس کی تباہی کے راستہ میں صرف ہونے لگیں۔ اب خود یورپ اب لوں کو محسوس ہونے لگا ہے کہ ان کو حیوانی تہذیب سے بلند تر ایک انسانی تہذیب کی ضرورت ہے اور اس تہذیب کی اساس مذہب کے سوا اور کوئی چیز نہیں بن سکتی۔

آگے چل کر لارڈ لوتھین فرماتے ہیں :-

سائنٹفک اسپرٹ (روح تحقیق) نے یہ تو ضرور کیا کہ رفتہ رفتہ پرانے توہمات کو دور کر دیا، علم کے دائرے

کو پھیلا دیا اور اس طرح مردوں اور عورتوں کو ان بہت سی قیود سے آزاد کر دیا جن میں وہ پہلے جکڑے

ہوئے تھے۔ مگر اس کے ساتھ اس نے یہ بھی کیا کہ انسان کو روحانی اور مذہبی صداقت کا شدت کے ساتھ

حاجت مند بنا کر چھوڑ دیا اور اس صداقت تک پہنچنے کا کوئی راستہ فراہم نہ کیا۔ اکثر اہل مغرب کا حال یہ ہے کہ وہ بچوں کی طرح تیز رفتاری اور عجوبہ زانی اور حواس کی لذتوں کے شوق میں مہلک ہیں، سادہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ان سے سلب ہو گئی ہے اور غلامان کا کوئی ربط اس لامحدود وازنی وابہی حقیقت سے باقی نہیں رہا ہے جسے مذہب پیش کرتا ہے۔

”مذہب جو انسان کا ناگزیر رہنما، اور انسانی زندگی کو اخلاقی مقصد، شرف اور معنویت حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہے، اس کے اقتدار میں زوال آجانے کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مغربی دنیا ان سیاسی مسلکوں کی گرویدہ ہو گئی ہے جو نسلی یا طبقاتی بنیادوں پر قائم ہیں اور سائنس کی اس صورت پر ایمان لے آئی ہے جو محض مادی ترقی کو منتہائے مقصد قرار دیتی اور زندگی کو روز بروز پیچیدہ اور گراں بار بنائے چلی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ کے لیے اپنی روح اور اپنی زندگی میں اس اتحاد کا پیدا کرنا دشوار ہو رہا ہے جو اس کو موجودہ دور کی سب سے بڑی مصیبت فیشنلزم سے نجات دلائے۔“

اس کے بعد لارڈ لوٹھین نے ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے سوال پیش کیا ہے:-

کیا ہندوستان کے دو بڑے مذہب، ہندو ازم اور اسلام، جدید دور کی تنقیدی اور تحقیقی روح کا مقابلہ مغرب کی مذہبی عصبیت کی نسبت زیادہ کامیابی کے ساتھ کر سکیں گے؟ براہم ترین سوال ہے اور اگر ہندوستان کو ان مصائب بچانے کے لیے مغرب پر نازل ہو چکے ہیں تو اس ملک کے علمی اور مذہبی لیڈروں کو اسی سوال پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ اس میں تو شک نہیں کہ رائج تحقیقی رفتہ رفتہ توئم اور جاہلیت کے ان عناصر کو فنا کر دیں جو اب تک ہندوستان کے عوام میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ بہت اچھا ہوگا، مگر کیا یہ چیز ان دونوں مذاہب کے اصول اخلاق و روحانیت کو بھی ان لوگوں کے دل و دماغ سے نکال دے گی جو آگے چل کر ہندوستان کی سیاسی، تمدنی و معنوی زندگی کے

لیڈ رہنے والے ہیں؟ میں ہندو ازم اور اسلام کی اندرونی زندگی سے واقفیت کا معنی نہیں ہوں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایسے عناصر رکھتے ہیں جو ان میں سے ہر ایک کو یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے مردوں اور عورتوں پر قابو رکھنے کے قابل بنا سکیں گے۔ عیسائیت تو اپنی بعض ایسی غلط اعتقادی بندشوں کی وجہ سے اس میں ناکام ہو چکی ہے جنہوں نے اس مذہب کے جلیل القاد بانی کی پیش کردہ حدائقوں کو چھپا لیا۔“

جیہا کہ لارڈ وٹھین نے خود اعتراف کیا ہے، حقیقتہً ان کو ہندو ازم اور اسلام کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ انہوں نے محض دو سے دیکھ کر چند چیزیں ہندو مذہب میں اور چند اسلام میں ایسی پائی ہیں جو ان کے نزدیک جدید تنقید و تحقیق کی روح کے مقابلہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کو اخلاق و روحانیت کے بلند تر اصولوں پر قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں لیکن جو لوگ ان دونوں مذہب، بلکہ ہندوستان کے تمام مذاہب کا اندرونی علم رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ روح تنقید و تحقیق کے مقابلہ میں اگر کوئی مذہب ٹھیک رہتا ہے، بلکہ صحیح تر الفاظ میں، اگر کوئی مذہب اس روح کے ساتھ اپنے پیروں کو لے کر آگے بڑھ سکتا ہے اور ترقی و روشنی کے دو میں پوری نوع انسانی کا مذہب بن سکتا ہو، تو وہ اسلام کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ مسیحیت کیوں ناکام ہوئی؟ صرف اس وجہ سے کہ وہ کوئی اجتماعی (social) مسلک نہیں ہے بلکہ اجتماعیت کی عین نفی ہے۔ اس کو صرف فرد کی نجات بحث ہو اور اس کی نجات کا راستہ بھی اس نے یہ تجویز کیا ہے کہ وہ دنیا سے مٹ کر اپنا رخ آسمانی بادشاہت کی طرف پھیر لے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یورپ کی قوموں نے ترقی کے راستہ پر قدم بڑھایا تو مسیحیت ان کی مددگار ہونے کے بجائے مزاحم ہوئی اور انھیں اس کی بندشیں توڑ کر آگے بڑھنا پڑا۔ اسی سے ملت جلتا حال ہندو ازم کا بھی ہے۔ اس کے پاس بھی کوئی ترقی پرور فلسفہ اور کوئی عقلی قانون اخلاق، اور کوئی وسعت پر نظام اجتماعی نہیں ہے۔ سب سے بڑی طاقت جس نے اب تک ہندوؤں کو ایک نیشنل سٹم میں باندھ رکھا ہے اور دوسری تہذیبوں کا

اثر قبول کرنے سے روکا ہے، وہ ان کا درنہ آشرم (Caste system) ہے۔ مگر موجودہ دور کی روح تنقید و تحقیق کے سامنے اس بندھن کا ٹوٹنا یقینی ہے اور یہ ٹوٹ کر رہے گی۔ اس کے بعد کوئی چیز ہندو سوسائٹی کو ٹوٹنے سے نہ بچا سکے گی اور اس کے مقفل دروازے، بیرونی اثرات کے لیے چوڑا کھل جائیں گے پھر ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہندوؤں کے قدیم قوانین معاشرت و تمدن اور ان کے پرانے بت پرستانہ توہمات اور ان کے غیر عقلی اور غیر علمی فلسفیانہ قیاسات، دور جدید کی علمی ترقی اور اجتماعی بیداری کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ اب ہندو وزیر برز ایک ایسے دور ہے کے قریب پہنچے جا رہے ہیں جہاں ان کی اور بڑی حد تک تمام ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ یا تو وہ اسلام کے خلاف اسی تعصب میں گرفتار رہیں گے جس میں یورپ کی نشاۃِ جدیدہ (Renaissance) کے موقع پہنچی اہل یورپ گرفتار تھے اور اسی طرح اسلام سے منحرف ہو کر ماؤہ پرستانہ تہذیب کا راستہ اختیار کریں گے جس طرح اہل یورپ نے اختیار کیا یا پھر فوج در فوج اسلام میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔

اس فیصلہ کا انحصار بڑی حد تک مسلمانوں اور خصوصاً ان کے قدیم و جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے طرزِ عمل پر ہے۔ اسلام محض اپنے نام سے تو کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا اس کے اصول اگر محض کتاب میں لکھے رہیں تو ان سے بھی کسی معجزے کا صدور ممکن نہیں جس انتشار اور بے عملی کی حالت میں مسلمان اس وقت مبتلا ہیں، جو جمہودان کے علماء پر طاری ہے اور جس زمانہ افعال و تاثر کا اظہار ان کی ہی تعلیم یافتہ نسلوں سے ہو رہا ہے، اس سے ہندوستان کی روح کا فتح کرنا تو دیکھنا ہی بھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ اسلام کے نام لیوا خود اپنی جگہ ہی پر قائم رہ جائیں گے انقلاب کے تیز و سیلاب میں کسی جماعت کا ساکن کھڑا رہنا غیر ممکن ہے۔ یا اس کو رو میں بہنا پڑے گا، یا پوری مردانگی کے ساتھ اٹھ کر سیلاب کا منہ چھیر دینا ہوگا۔ یہ دوسری صورت صرف اسی طرح رونما ہو سکتی ہے کہ اول تو عام مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست کی جائے اور ان میں اسلامی زندگی کی روح چھونک نہی جائے۔ دوسرے علمائے اسلام اور نئے تعلیم یافتہ مسلمان مل کر اصولِ اسلام

کے مطابق زندگی کے جدید مسائل کو سمجھیں اور علمی و فنی دونوں صورتوں میں انکو اس طرح حل کر کے بتائیں کہ اندھے متعصبین کے سوا ہر عقول انسان کو تسلیم کرنا پڑ جائے کہ ایک نئی پذیر تمدن کے لیے اسلامی تہذیب کے سوا اور کوئی اساس صحیح اور بے عیب نہیں ہو سکتی۔

ہندوستان میں مذہب اور سائنس کی نزاع کا وہ تصور اب تک چلا جا رہا ہے جو یورپ میں اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تھا لیکن یورپ میں نقشہ بدل چکا ہے اور یورپ کا پس خوردہ کھانے والے ہندوستان میں بھی عنقریب نقشہ بدل جانے والا ہے، لہذا وہ وقت قریب آ رہا ہے جب مذہب کے خلاف کم از کم علمی و فنی حیثیت سے یہ تعصب باقی نہ رہے گا بشرطیکہ ہم اس وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے پہلے سے تیار ہوں۔ اس حقیقت کی طرف لارڈ لوتھین نے مختصر الفاظ میں یوں اشارہ کیا ہے:-

”ساٹھ برس پہلے سائنس اور مذہب میں ایسا معرکہ جاری تھا جس کے ختم ہونے کی کوئی توقع نظر نہ آتی تھی۔ زندگی کے روحانی تصور اور مبنی تصور کے درمیان ایسی جنگ برپا تھی جس کے متعلق شبہ ہوتا تھا کہ یہ دونوں میں سے کسی ایک کی موت سے پہلے ختم نہ ہوگی۔ مگر آج دونوں فریقوں نے ڈنگیں ڈال دی ہیں۔ نہ سائنس دان، اور نہ دیندار، دونوں میں سے کوئی بھی آج اس محکم کے ساتھ نہ جوی نہیں کرتا کہ اس نے کائنات کا معرکہ حل کر لیا ہے، بلکہ حقیقت دل میں دونوں کے یثرب پیدا ہو چکا ہے کہ آیا وہ اس معرکہ کے متعلق کچھ جانتے بھی ہیں یا نہیں۔ لہذا اب ایک ایسے مہراج کا امکان ہو چکا ہے جو تحقیق علمی کے نئے نئے زور شور میں غیر ممکن نظر آتا تھا۔“

لارڈ لوتھین بہر حال مذہب کے صحیح تصور سے آزاد نہیں ہیں اور مذہب کا وہ علمی تصور اب تک پہنچا نہیں ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہی سوچ سکتے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں اب کوئی امتزاج ہو سکتا ہے لیکن ہم مذہب سائنس کے امتزاج کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو حقیقی مذہب وہ ہے جو سائنس کی روح، اس کی رہنمائی بن جائے اسلام درحقیقت

ایسا ہی مذہب ہے اور آج اس کو سائنس کی روح بننے سے اگر کوئی چیز روکے ہوئے ہے تو وہ اس کا اپنا اندرونی نقص نہیں ہے، بلکہ اس کے علمبرداروں کی غفلت اور موجودہ سائنس کے علمبرداروں کا جہل اور جاہلانہ تعصب ہے۔ یہ دو اسباب دور ہو جائیں۔ پھر یہ سائنس کے قالب میں جان ہی بن کر رہے گا۔ آگے چل کر فاضل خطیب نے اس امر پر بحث کی ہے کہ موجودہ دور کی علمی بیداری اور عقلی تنقید کے سامنے کس قسم کا مذہب ٹھہر سکتا ہے؟ انسان اس روشنی کے عہد میں جس مذہب کا طلب گاہ ہے اس کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں؟ اور اس وقت انسان کی اصلی حاجات کیا ہیں جن کے لیے وہ مذہب کی رہنمائی ڈھونڈ رہا ہے؟ یہ اس خطبہ کا سب سے زیادہ قابل توجہ حصہ ہے:۔

اگر میں صورت حال کا غلط اندازہ نہیں کر رہا ہوں تو یہ حقیقت ہے کہ جو امتحان اس وقت مذہب کو پیش ہے، اس سے وہ صرف اسی صورت میں کامیابی کے ساتھ گزر سکتا ہے، جبکہ فوخر نسل، اس کے اندرونی نظام کی جانچ پڑتال کر کے اس امر کا پورا اظہان کرے کہ زندگی میں جن نئی مسائل اور جن پریشانیوں اور پیچیدگیوں سے اس کو سابقہ پڑ رہا ہے ان کا بہترین حل اس مسئلہ میں موجود ہے۔ شخصی مذہب کا دور اب گزر چکا ہے۔ محض جذباتی مذہب کی بھی اب کسی کو حاجت نہیں۔ اس قسم کے مذہب کا زمانہ بھی اب نہیں رہا جو فرد کو صرف اس حد تک تسلی اور ہمارا دے سکتا ہو کہ اس کے اخلاقی طرز عمل کے لیے کچھ ہدایات دیدے اور ایک ایسی نجات کی امید دلادے جس کا حال مرنے کے بعد ہی کھل سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کا سائنس فک کا دی تو ہر چیز کو نئی کڑی خود صداقت کو بھی بین نتائج کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس کو مذہب کا ابتداء کرنا ہے تو وہ مطالبہ کرتا ہے کہ مذہب اس کو یہ بتائے کہ وہ اس کی زندگی کے عملی مسائل کا اپنے پاس کیا حل رکھتا ہے۔ بہت سے جنموں کے بعد آخر کار نروان حاصل ہونے کی امید، یا موت کے دروازے سے گزر جانے کے بعد آسمانی بادشاہت میں پہنچ جانے کی توقع ایسی چیز نہیں ہے کہ صرف اسی کی

بنیاد پر وہ مذہب کو قبول کر لے۔ اس کی فلسفیانہ جستجو کے لیے مذہب کو سب سے پہلے نووہ کلید فراہم کرنی چاہیے جس سے وہ کائنات کے معنی کا کوئی قابلِ اطمینان حل پاسکے پھر لے ٹھیک ٹھیک سائنفسط طریقہ پر علت اور معلول، سبب اور نتیجہ کا یقین تعلق ثابت کرتے ہوئے یہ دکھانا چاہیے کہ انسان اُٹا فو کو کس طرح قابو میں لائے جو اس وقت بے قابو ہو کر نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے تباہ کر دینے کی دھمکیاں دے رہی ہیں اور کس طرح وہ بے روزگاری، غیر معقول عدم مساوات، ظلم و ستم، معاشی لوٹ، جنگ، اور دوسری اجتماعی خرابیوں کا انسداد کرے، اور افراد کی باہمی کش اور خاندانی نظام کی برتری کو کس طرح روکے جس نے انسان کی سرمتوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔

انسان آج صرف اس وجہ سے مذہب کی طرف دیکھ رہا ہے کہ سائنس نے اس کی مشکلات کو حل کرنے کے بجائے اور زیادہ بڑھا دیا ہے، اس لیے وہ مذہب سے اپنے شکوک واپس اپنی مشکلات کا حل طلب کرنے میں اُتارے چین ہے جتنا اس سے پہلے کبھی نہ تھا اب اگر مذہب اپنے مقام کی حفاظت اور اپنے کھوئے ہوئے میدان کی بازیافت چاہتا ہے تو اسے ان سوالات کا روحانی نگر سائنفسطک جواب دینا چاہیے جس کی صحت کو نتائج کے معیار پر اسی دنیا میں جانچا اور پرکھا جاسکے، تو کے بعد دوسری دنیا پر نہ اٹھا رکھا جائے۔ ہم اہل مغرب جانتے ہیں کہ یہ سب سے بڑا سوال ہے جو ہماری اس دور میں سامنے آیا ہے۔ کیا آپ ہندوستان میں اس کا جواب دے سکتے ہیں؟“

لارڈ لوتھین کی تقریر کا یہ حصہ پڑھتے وقت بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پیاسا ہے جسے پا نی کا تو علم نہیں، مگر وہ اپنی پیاس کی کیفیات کو ٹھیک ٹھیک محسوس کر رہا ہے اور بتاتا جاتا ہے کہ میرے جگر کی لگ کوئی ایسی چیز مانگتی ہے جس میں یہ اور یہ صفات موجود ہوں۔ اگر پانی اس کے سامنے لا کر رکھ دوں گا تو اس کی فطرت فوراً پکار اٹھے گی کہ جس چیز کا وہ پیاسا ہے وہ یہی چیز ہے اور لپک کر اسے منہ سے لگائے گا۔ یہ حال صرف ایک لارڈ لوتھین ہی کا نہیں ہے بلکہ یورپ اور امریکہ اور تمام دنیا میں

جو لوگ موجودہ تہذیب و تمدن کی گری سے خوب تپ چکے ہیں، اور جو فلسفہ و سائنس کے صحرائیں کناریں کی شاوادیوں سے گذر کر وسط کی بے آب گیاہ پٹیوں تک پہنچ چکے ہیں، ان سب کو آج یہی بیانیہ محسوس ہو رہی ہے، سب انہی صفات کی ایک چیز مانگ رہے ہیں جن کا ذکر لارڈ لوتھین نے کیا ہے اور ان سب کا یہی حال ہے کہ پانی کا نام نہیں جانتے، یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کہاں پایا جاتا ہے، مگر رہ کر پکڑے تین کر جگر کی آگ بجھے جس سے وہ شے لا!

پانی کا نام انھوں نے نہ تو ضرور ہے مگر اس نام سے یہ محض اس لیے گھبراتے ہیں کہ اصل شے کو انھوں نے خود دیکھا نہیں ہے اور اپنے جاہل و متعصب اسلاف کے سنتے ہی چلے آ رہے ہیں کہ خبردار پانی کے پاس نہ پھٹکنا، یہ ایک بڑی زہریلی چیز کا نام ہے لیکن اب یہ اس محلے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر نام کو چھپا کر نفس شے کو ان کے سامنے رکھ دیا جائے تو بے اختیار کہہ دیں گے کہ ہاں اٹھیک ہی وہ چیز ہے جس کے ہم پیاتے ہیں۔ اس کے بعد جب انھیں بتایا جائے گا کہ حضرت! یہ وہی پانی ہے جس کے نام سے آپ گھبراتے تھے، تو صریح کہ ان کا منہ کھلا رہ جائے گا اور کہیں گے کہ کیا دھوکا تھا جس میں ہم مبتلا تھے۔

”موجودہ زمانے کا سائنٹفک ادنیٰ عیسائیت کو خوب چکھ اور پرکھ چکا ہے، اور یہ بات اس پر زور و شین کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ وہ اس کے مرض کی دو انہیں ہے۔ ہندو ازم اور بودھ ازم کے خیالی فلسفوں اور ان کی تاریخی قدامت کو دیکھ کر وہ کبھی کبھی ان سے مسحور ہو جاتا ہے، مگر سائنٹفک تنقید و تحلیل کے پہلے ہی امتحان میں ان کی ناکامی کھل کر رہتی ہے۔ بودھ مت تو قریب قریب عیسائیت کا ہندوستانی ایڈیشن ہے۔ رہا ہندو ازم تو وہ خود ان مشکلات اور ان سچیدگیوں کو پیدا کرتا ہے جن سے نکلنے ہی کے لیے موجودہ زمانے کا سائنٹفک آدمی مذہب کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ انسان اور انسان میں غیر محقول نامساوات سب سے زیادہ اسی کے دائرہ میں پائی جاتی ہے۔ معاشی لوٹ کی سب سے بدتر صورت، یعنی ہاجنی و سود خواری اس کے سسٹم کا ایک غیر منطقی جز بن چکی ہے۔ جنگ کی اصلی وجہ یعنی انسان کی نسلی تقسیم اور نسلی منافرت اس کی عین اساس میں

میوسٹ ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے جو نظام اس نے قائم کیا ہے وہ انسانوں کو ملانے والا نہیں بلکہ بٹانے والا ہے۔ اس کے قوانین معاشرت اتنے بوسیدہ ہیں کہ موجودہ علمی و عملی زندگی کے دو تہیں خود ہزاروں برس کے خاندانی ہندوؤں کو توڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں، کیونکہ ان کی بنیاد علم اور عقل پر نہیں بلکہ تعصبات اور توہمات پر ہے۔ ان ذہنی مسئلے سے اوپر، اخلاقیات اور الہیات کے دائرے میں وہ اس سے بھی زیادہ ناقص پایا جاتا ہے۔ کائنات کے معنی کو اطمینان بخش طریقہ پر حل کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی کلید نہیں۔ اس کے عقائد اذعان عقائد میں، علمی یا عقلی ثبوت ان میں سے کسی چیز کا نہیں دیا جاسکتا۔ اخلاقیات میں وہ دل خوش کن مفروضات کا ایک نظم ضرور بناتا ہے جیسا کہ مثال کے طور پر ایک ظلم ہما تھا گا ندھی نے بنا رکھا ہے۔ مگر معقولات اور حکمت عملی (Practical

Wisdom) اسے اس کا دامن خالی ہے۔ موجودہ علمی بیداری کے دو تہیں اس کی ناکامی اگر نہیں کھلی ہے تو غمگین کھل جائے گی۔

اس کے بعد میدان میں صرف اسلام رہ جاتا ہے، اور وہی ان معیاروں میں سے ایک ایک معیار پر پورا اترتا ہے جو آج کل کا سامنا ٹھنک آدمی اپنے مذہب مطلوب کے لیے پیش کر رہا ہے یا کر سکتا ہے۔ یہ بات کہ مذہب محض ایک شخصی معاملہ ہے، اور محض انفرادی ضمیر ہی سے اس کا تعلق ہے، اب ایک فرسودہ بات ہو چکی ہے۔ یہ انیسویں صدی کی بہت سی خام خیالیوں میں سے ایک تھی، جسے بیسویں صدی کی اس چوتھی دہائی میں بھی ہندوستان کے بعض وہ قدامت پسند اب تک لٹے جا رہے ہیں جو ادعائے تجدید کے باوجود ہمیشہ دنیا سے پچاس برس پیچھے چلنے کے خوگر ہیں۔ اب قریب قریب یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ فرقہ وارانہ تصور جماعت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شخص دوسرے کے ساتھ بے شمار چھوٹے بڑے تعلقات میں جکڑا ہوا ہے اور سوسائٹی میں حیثیت المجموع ایک حکم رکھتی ہے جس میں افراد کی حیثیت زندہ جسم کے اعضا کی سی ہے۔ مذہب کی ضرورت اگر ہے تو وہ صرف فرد کو اپنے ضمیر کے اطمینان اور اپنی نجات

بعد الموت ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ پوری جماعت کو اپنی تنظیم اور اپنی دنیوی زندگی کے سارے کاروبار چلا کیسے ہے۔ اور اگر اس چیز کی ضرورت نہیں ہے تو فرد کو بھی نہیں اور جماعت کو بھی نہیں۔ یہ تصور سراسر ایک طفلانہ تصور ہے کہ اجتماعی زندگی کا نظام کچھ اور ہو اور اس نظام سے بے تعلق ہو کر افراد کے مذہبی عقائد اور ان کے مذہبی اعمال کچھ اور ہوں۔ مذہبی عقائد اور مذہبی اعمال کا کوئی ربط اگر اجتماعی زندگی سے نہ ہو تو ایسے عقائد اور اعمال محض بے کار ہیں اور صرف بے کاری ہی نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے اجتماعی نظام میں ان کا مضل ہو جانا یقینی ہے جس کے دوسرے اجزاء کے ساتھ وہ تعامل (Interaction) قبول نہ کرتے ہوں۔ لہذا دو صورتوں میں سے لامحالہ کوئی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ یا تو پوری جماعت کا نظام سراسر لاد مذہبی ہو اور مذہب کو قطعی طور پر انسان کی زندگی سے خارج کر دیا جائے۔ جیسا کہ اشتراک بول کا مسلک ہے۔ یا پھر اجتماعی نظام پورا کا پورا مذہبی ہو اور علم اور تمدن دونوں کے لیے مذہب کو رہنما تسلیم کیا جائے جیسا کہ اسلام کا مقصد ہے۔ پہلی صورت کا تجربہ نہایت طویل مدت تک کر چکی ہے۔ اس سے وہی کڑو پھل پیدا ہو سکتے تھے، وہی پیدا ہوئے اور وہی آئندہ بھی پیدا ہوں گے جن کا ذکر لارڈ لوتھین نے کیا ہے۔ اب دنیا کی نجات صرف دوسری ہی صورت میں ہے اور اس کے برروے کار کرنے کے مواقع روز بروز پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

مگر جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، ان مواقع سے فائدہ اٹھانا یا ان کو ہمیشہ کے لیے کھودینا مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ واقعات کی رفتار دنیا کو۔ اور دنیا کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے ہندوستان کو بھی۔ ایک ایسے مقام پر آئی ہے جہاں وہ اسلام کی طرف بھی مڑ سکتی ہے اور مادہ پرستی اور فساد اخلاق کے اسفل السفلین کی طرف بھی طبعاً اس کا رخ بھی تک دوسرا رستے کی طرف ہے کیونکہ اسی راستہ پر وہ ایک مددگار سے بڑھتی چلی آرہی ہے۔ اگرچہ اس راستہ کے ہمالک دیکھ دیکھ کر وہ ہم رہی ہے اور چاروں طرف گھبرا گھبرا کر دیکھتی ہے کہ کوئی بچاؤ کی راہ بھی ہے یا نہیں، مگر بچاؤ کی راہ خود اس کی اپنی نکال ہوگی اور جھل

وہ حقیقت اس وقت ایسے لیڈروں کی محتاج ہے جو قوت کے ساتھ اٹھ کر اس کی نگاہوں پر سے پرہ  
اٹھادیں اور اسلام کی مصراطِ مستقیم کا واحد راہِ نجات ہونا ثابت و میراث بن کر دیں۔ ایک ایسی مجاہد اور مجتہدِ جبار  
اگر مسلمانوں میں پیدا ہو جائے تو مسلمان تمام دنیا کے بیٹوں بن سکتے ہیں۔ ان کو وہی مقامِ عزت پھر حاصل  
ہو سکتا ہے جس پر وہ کبھی سرفراز تھے اور جس پر مغربی قوتوں کو ممکن دیکھ کر آج ان کے منہ میں پانی بھر چلا  
آ رہا ہے لیکن اگر اس قوم کے جمہور اسی طرح دوں ہمہتی و بہتِ وصلگی کے ساتھ بیٹھے رہے، اگر اس کے  
نوجوان یونہی غیروں کا پس خوردہ کھانے کو اپنا منہ نہ کھال سکتے رہے، اگر اس کے علما اپنی اپنی  
پرانی فقہ و کلام کی فرسودہ بیٹیوں میں الجھے رہے، اگر اس کے لیڈروں اور سیاسی بیٹوں کی ذلیل  
ذہنیت کا یہی حال رہا کہ لشکرِ اختیار کے پیچھے لگ چلنے کو مجاہدانہ غریمت کا بلند ترین مرتبہ سمجھیں اور  
بیسویں صدی کے سب سے بڑے فریب میں اپنی قوم کو مبتلا کرنا کمالِ دشمنی خیال کریں، غرض اگر اس  
قوم کے دست و پا سے لے کر دل و دماغ تک سب کے سب تعطل یا خام کاری ہی میں گرفتار رہیں اور  
اس کروڑوں کے انبوہ سے چند مردانِ خدا بھی جہاد و اجتہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمر باندھ کر نہ  
اٹھ سکیں، تو پھر دنیا جس ہفل الفیلین کی طرف جارہی ہے اسی طبقہ جہنم میں یہ قوم بھی دنیا کی دم  
کے ساتھ بندھی بندھی جا کرے گی اور غضبِ خداوندی ایک مرتبہ پھر پکارے گا کہ اَلَا بُعْدًا  
لِقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۵۶ھ۔ مارچ ۱۹۳۶ء)

# ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

## خطباتِ خالدہ ادیب خانم

ترکی کی شہر و نقل و مجاہد خاتون، خالدہ ادیب خانم اب کچھ مدت قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائی تھیں اور انھوں نے دہلی میں چند خطبات ارشاد فرمائے تھے جن کا اردو ترجمہ جامعہ کے چائل پرفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین صنائے ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش کے نام سے کیا ہے۔ ان سطوح میں اس مجموعہ خطبات پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں گے۔

دنیاۓ اسلام میں اس وقت دو ملک ایسے ہیں جن کو دو مختلف حیثیتوں سے مسلمانانِ عالم کی پیشوائی کا مرتبہ حاصل ہے۔ ذہنی حیثیت سے مصر اور سیاسی حیثیت سے ترکی۔ مصر کے ساتھ اہم اسلامیہ کے تعلقات نسبتاً زیادہ گہرے ہیں، کیونکہ اس کی زبان ہماری بین الاقوامی زبان، عربی ہے، اس کا لٹریچر تمام دنیا کے مسلمانوں میں پھیلتا ہے، اس کے ذہنی اثرات چین سے مراکش تک پہنچتے ہیں، اور وہی مسلمانوں کے درمیان ربط اور تقابہم اور واقفیت حالات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ بخلاف اس کے ترکی قوم کی مجاہدانہ زندگی اور مغربی تقدیمات کے مقابلہ میں اس کی خجائے عافیت، اور ناموس ملی کے لیے اس کی قربانیوں کا سکھ تو بلاشبہ تمام عالمِ اسلامی پر بٹھایا ہوا ہے، اور اسی وجہ اس کو مسلمانوں میں سرداری اور پیشوائی کا منصب حاصل ہے، لیکن زبان کی اجنبیت، اور ربط و تقابہم کے فقدان نے ترکی اور اکثر ممالکِ اسلامیہ درمیان ایک گہرا پردہ حائل کر دیا ہے جس کے سبب ترکی قوم کے ذہنی ارتقاء اور اس کی دماغی ساخت اور اس کے تمدنی، سیاسی

ذہنی اور علمی تحولات کے متعلق ہماری واقفیت بہت محدود ہے خصوصاً حال کے دس بارہ برسوں میں جو انقلابات ترکی میں رونما ہوئے ان کے باطنی اسباب اور ان کی اصلی روح کو جاننے اور سمجھنے کا موقع تو ہم کو بہت ہی کم ملا ہے۔ بہت سے لوگ ترکوں سے سخت ناراض ہیں، بعض ان کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں بعض ان کی مغروریت کو اپنی مغرب پرستی کے لیے برہان قاطع بنائے بیٹھے ہیں مگر مستند معلومات کسی کے پاس بھی نہیں ہیں اور جو تھوڑی بہت معلومات ہیں بھی تو وہ ترکی جدید کی روح کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔

اس حالت میں ہم اس کو خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ خود ترکی جدید کے معماروں میں سے ایک ایسی ہستی نے ہندوستان اگر ہمارے سامنے اپنی قوم کے باطن کو ظاہر کیا ہے جو انقلاب کے بیج پر محض اکیتر ہی نہ تھی، بلکہ اس انقلاب کی محرک طاقتوں میں سے ایک طاقت تھی۔ اس کے ساتھ وہ خدا کے فضل سے عالمانہ نظر، اور فلسفیانہ فہم، اور فکر اندہ متقی بھی رکھتی ہے جس کی بدولت وہ خارجی واقعات کے اندرونی محرکات کو سمجھ بھی سکتی ہے اور سمجھا بھی سکتی ہے۔ ایسے مستند و معتبر ذریعے نہیں اب پہلی مرتبہ ترکی کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کا موقع مل رہا ہے اس نے ترکی جدید کی روح کو ہمارے سامنے بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور پوری صداقت و دیانت کے ساتھ ہمیں بتایا ہے کہ جو قوم آج دنیا کے اسلام کی نہ صرف سیاسی ہمنما کر رہی ہے بلکہ ذہنی رہنمائی کے لیے بھی کوشاں ہے، درحقیقت خود اپنے باطن میں کیا ہے، کن عناصر اس کی تعمیر ہوئی ہے، کونسی قوتیں اس میں کام کر رہی ہیں، کون سے اسباب اس کو موجودہ مقام تک پہنچ کر لائے ہیں اور اب کس رخ پر وہ جا رہی ہے۔ یہ مستند ذخیرہ معلومات، مختلف حیثیتوں سے ہمارے لیے مفید ہے۔ اس کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ ترکی قوم کا حقیقی حال ہم پر روشن ہو گیا، بلکہ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ترکی سے جو رہنمائی اب ہماری جدیدیوں تک پہنچ رہی ہے اس کی روح کو ہم زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں اور دنیا کے اسلام میں جو انقلاب اس وقت رونما ہو رہا ہے اس کے اندرونی اسباب کو سمجھنے کا ایک اور موقع ہم کو مل گیا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم خالدہ ادیب خانم کے ذریعہ سے ترکی جدید کو سمجھیں، ہمیں خود ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ان کا دل پورا پورا مسلمان ہے، ایمان سے لبریز ہے اور ایمان بھی ایسا جس پر ہم کو رشک کرنا چاہیے، کیونکہ وہ ایک حجاب عورت کا ایمان ہے۔ الحاد اور بے دینی کا شائبہ تک ان کے خیالات میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام سے ان کو محبت ہے، ویسی ہی محبت جیسی ایک سچی مسلمان عورت کو ہونی چاہیے۔ لیکن ان کا دل جیسا مسلمان ہے، ان کا دماغ ویسا نہیں ہے۔ انھوں نے تمام مغربی طرز کی تعلیم پائی ہے، مغربی علوم ہی کا مطالعہ کیا ہے، مغربی عینک ہی سے دنیا اور اسلام اور خود اپنی قوم کو دیکھا ہے اور ان کی تمام فکری اور نظری قوتیں مغربی سانچے ہی میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے دل کی چھپی ہوئی اسلامیت اور مشرقیت نے مغربیت کے اس دماغی استیلاء کی بہت کچھ مزاحمت کی ہے اور اسی مزاحمت کا نتیجہ ہے کہ ترکی قوم کے دوسرے انقلابی لیڈروں کی نسبت ان کے خیالات میں بہت کچھ اعتدال پایا جاتا ہے، لیکن یہ مزاحمت ان کو مغربیت کے غلبہ سے نہیں بچا سکی ہے۔

اسلام کے متعلق ان کی معلومات بہت محدود معلوم ہوتی ہیں۔ قرآن اور سنت نبوی اور تاریخ اسلام کے مطالعہ میں انھوں نے شاید اُس وقت کا دسواں حصہ بھی صرف نہیں کیا ہے جو مغربی فلسفہ اور تاریخ اور عمرانیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے متعلق ان کے خیالات کی جو جھلک ہم کو ان کے خطبات میں نظر آئی ہے، اس میں حسن عقیدت تو ضرور موجود ہے مگر فہم اور تدبر اور بصیرت بہت کم ہے۔

اپنے آخری خطبہ میں وہ فرماتی ہیں کہ گاندھی جی کی ذات ”جدید اسلام کا ایک مکمل نمونہ ہے“۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو نہیں جانتا کہ اسلام کیا ہے، جدید اور قدیم کی نسبتوں سے کس قدر بالا و برتر ہے اور اس کا مکمل نمونہ کیسا ہوتا ہے۔ اسلامی سیرت کی خصوصیات پر جس شخص کی نظر ہو اور جس نے اس سیرت کے مکمل نمونے کی جھلک بھی دیکھی ہو، اس کی نگاہ میں گاندھی جی کی تو کیا حقیقت ہی

تاریخ عالم کے بڑے سے بڑے ہیرو بھی نہیں بچتے اور یہ کچھ قومی عصبیت کی بنا پر نہیں، ناقابل انکار تاریخی حقائق کی بنا پر ہے۔ ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰؓ، حسینؓ ابن علیؓ، احمد بن حنبلؓ اور عبدالقادر جیلانیؒ کی سیرتیں سامنے رکھیے اور پھر انصاف سے دیکھیے کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر تاریخ عالم کی کونسی شخصیت اس قابل ہے کہ ان سیرتوں کے مقابلہ میں لا کر رکھی جاسکے؟ عثمانی قوم کے سیاسی مزاج کی ترکیب میں ان کو ترکی قوم کی قدیم سنی خصوصیات لیکر یونان، بائسٹرا روم، حتیٰ کہ افلاطون کی جمہوریت تک، سب کے اثرات نظر آتے ہیں، مگر نہیں نظر آتے تو قرآن اور محمدؐ کی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے اثرات، حالانکہ جس چیز نے وسط ایشیا کے بدوی ترکوں کو تہذیب و تمدن آراستہ کیا اور ان کے اندر جہاں کشمکش کے ساتھ جہان بینی کی استعداد بھی پیدا کی اور ان کو نوع انسانی کی ایک تخریبی قوت کے بجائے ایک تعمیری طاقت بنا دیا وہ یہی تعلیم تھی۔ خالدہ خانم زیادہ سے زیادہ اسلام کا جو اثر عثمانیت میں دیکھ سکی ہیں وہی محض اسلامی عدل و مساوات ہے مگر اس کا حال بھی یہ ہے کہ جب سلطان سلیم اپنی رعایا میں بزرگتر اسلام کو بھیلانا چاہتا ہے اور شیخ الاسلام جمالی آفندی اس کو اس فعل سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے، اور مسلم حیات قہار فرما کر اس حکم کے گائے سر جھکا دیتا ہے، تو اس عظیم الشان واقعہ میں خالدہ خانم کو اسلامی عدل کے بجائے عثمانی قومیت کا احساس اور عثمانی اصول سلطنت کی حمایت کا جذبہ ہی نظر آتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتیں کہ جمالی آفندی کے فتوے میں لاکڑا کر اے فی الدین کی روح تھی۔ اور وہ اسلامی حق پرستی کی طاقت تھی جس نے سلیم کے سامنے اس کو فتویٰ دینے کی جرأت دلائی اور وہ اسلام کی عظمت تھی جس نے سلیم کو اس شرعی فتویٰ کے آگے سر جھکا دینے پر مجبور کر دیا۔

خالدہ خانم ترکی کے موجودہ حکمران طبقہ کی انتہا پسندی، استبدادیت، معاشرت کی جبری تنظیم، حدسپہنچ ہوئی مغربیت، مادہ پرست نذر دجانات اور مذہب کے متعلق اس کی روش سے بیزار معلوم ہوتی ہیں۔ وہ مغربیت اور مشرقیت کا معتدل امتزاج چاہتی ہیں، مادیت اور روحانیت، ایں مصاحبت کی خواہشمند ہیں، اور اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ زندگی کے ان دونوں نظریوں میں جو امتزاج اسلام نے پیدا کیا ہے،

وہ سبک بہتر ہے۔ مگر خود اسلام میں پوری بصیرت نہیں کھینچیں، اس لیے ان کو نہیں معلوم کہ اصول اسلام کے تحت امتزاج کی صحیح صورت کیا ہے اور افراط و تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کا خط تقسیم کہاں واقع ہے تاہم اگر ان کی ذاتی آراء سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ان کے خطبات میں ہم کو ترکی جدید کی ذہنیت اور اس کے رجحانات اور انقلاب کے تاریخی اسباب کی صداقت اور صحیح بیان مل جاتا ہے اور وہی ہم کو مطلوب ہے۔

ترکی قوم اسلام میں اُس وقت داخل ہوئی جب مسلمانوں کے ذہنی انحطاط کا آغاز ہو چکا تھا۔ رُوح جہاد اگرچہ زندہ تھی مگر رُوح اجتہاد مردہ ہو چکی تھی۔ اسلام میں بصیرت رکھنے والے تفکرین اور تفسیرے بہرہ وافر رکھنے والے فقہاء ناپید تھے۔ تہذیب اسلامی نیم جاں اور کلام اسلامی قریب قریب بے جان ہو چکی تھی بشریعت میں تقلید جا کا غلبہ تھا۔ تمدن میں عجمیت اور رومیت کے عناصر سوویت ہو چکے تھے۔ تصوف پر اشرافیت کا اور تفکر پر تفلسف کا اثر غالب آگیا تھا۔ قرآن اور سنت سے براہ راست اقتساب علم کرنے والے مفقود تھے۔ علماء زیادہ تر الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسنے والے کلام کی عجید گیوں میں الجھنے والے اور متقدمین کے روندے ہوئے رستوں پر رُوح و ایضاح کے پھلڑے چلائیوا لے تھے۔ امرا اکثر بدیشہ قیصر و کسریٰ کے ٹھنڈک پر چلنے والے تھے۔ متصوفین اور روحانی پیشوا اسلام کے دورانِ اول کی حقیقی صوفیت سے بیگانہ اور راہبوں جیگیوں اور اشرافی خلیفوں کی پیروی کرنے والے تھے۔ علوم و فنون میں مسلمانوں کی ترقی رک گئی تھی۔ تحقیق و کشف کی راہ میں ان کے تقدّمات قریب قریب ختم ہو گئے تھے اور عروج کے بعد زوال کے آثار تمام ممالک اسلامیہ میں پیدا ہو چکے تھے۔

اس طرح اسلامی تاریخ میں ترکوں کی ابتدائی ایک بنیادی کمزوری کے ساتھ ہوئی۔ دولت عثمانیہ کا قیام تقریباً ہی زمانہ میں ہوا ہے جب یورپ میں فہنی ارتقاء اور علمی نہضت کا آغاز ہو رہا تھا۔ اگرچہ عثمانیوں نے ابتدائی دو ڈوہانی صدیوں میں یورپ کو پیچھے نکلتے دے کر اسلام کی دھاک بٹھا دی تھی لیکن اس زمانہ میں غم مسلمان قوموں کے ساتھ ساتھ ترک بھی رفتہ رفتہ منزل کی طرف جا رہے تھے اور ان کا مقابلہ جن مغربی قوتوں

تھا و نیز رفتاری کیفیت مادی اور ذہنی ترقی کی راہ پر گامزن تھیں۔ سترہویں صدی عیسوی میں حالات نے پلٹا دکھایا۔ فرنگیوں کی عسکری تنظیم اور مادی و معنوی قوت اس حد تک بڑھ گئی کہ انھوں نے سینٹ گوٹھرڈ کے محرم میں پہلی مرتبہ تنزل پذیر ترکوں کو نمایاں شکست دی مگر ترکوں کی آنکھیں نہ کھلیں۔ وہ براہِ راستی میں گرتے رہے اور فرنگی براہِ راستی کرنے رہے۔ یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی میں ترکوں کی اخلاقی، مذہبی، سیاسی، علمی اور تمدنی حالت انتہائی تنزل کو پہنچ گئی اور ان پر فرنگیوں کا غلبہ پوری طرح نمایاں ہو گیا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں سلطان سلیم نے اس کمزوری کو محسوس کیا اور نظامِ سلطنت کی اصلاح، علوم جدیدہ کی اشاعت، طرزِ جدیدِ عسکری تنظیم، اور جدیدِ مغربی آلاتِ حرب کی ترویج شروع کی لیکن جاہل سنیوں اور تنگ نظر علمائے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے، مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی۔ یورپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا۔ جدید فوجی وردیوں کو تشبیہ بالقداری قرار دیا۔ غلین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے ہلے استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کرے کہ اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ اللہ افندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو، بادشاہی کے لائق نہیں۔ آخر کار مشن میں سلیم کو مغرور کر دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا۔

زمانے کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے، دوسرے ممالکوں کی نسبت ترکوں پر ان تغیرات کا زیادہ اثر پڑ رہا تھا۔ وہ یورپ کے مقابل میں بالکل سیدہ بیدہ کھڑے تھے اور برسرِ سپہاڑے تھے۔ مغربی قوموں کے ساتھ ان کے سیاسی تمدنی اور تجارتی تعلقات نہایت گہرے تھے، اور خود ان کی ماتحت یورپین اور عیسائی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات قبول کر رہی تھیں۔ مگر ترکوں کے مذہبی پیشواؤں نے جو تفتہ اور جہاد سے بالکل غری اور سلام کی حقیقی تعلیمات سے قطعاً ناواقف تھے، ان تغیرات کی طرف آنکھیں بند کر لیں اور

ترکی قوم کو مجبور کیا کہ سات سو برس قبل کی فضا سے ایک قدم آگے نہ بڑھے۔ سلیم کے بعد محمود نے اصلاح کی کوشش کی اور عمار و مشائخ نے پھر مخالفت کی۔ بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ۱۸۳۸ء میں محمود قابل ہو سکا کہ جدید فکری تنظیم کو رائج کر سکے مگر عمار اور روش برابر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ یہ اصلاحات بدعت ہیں، ان سے اسلام کو خراب کیا جا رہا ہے، سلطان بے دین ہو گیا ہے اور طرز جدید کی فوج میں بھرتی ہونا مسلمانوں کیلئے خرابی ایمان کا موجب ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں کے اہل دماغ لوگوں میں اپنی قومی پس کا عام احساس پیدا ہو چکا تھا، ان لوگوں نے مغربی قوموں کی ترقی کے اسباب پر غور کیا، ان کے علوم و ادب کا مطالعہ کیا، ان کی تفضیلات پر گہری نگاہ ڈالی، ان کی اپنی سلطنت کے قوانین، انتظامی امور، تعلیمی ادارات اور حربی نظام میں ایسی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی جن سے وہ مغربی قوموں کے دوش بدوش ترقی کر سکیں۔ خالدہ خانم کے بقول یہ وہ لوگ تھے جن کے رگ و پے میں اسلامیت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے دل اور دماغ دونوں مسلمان تھے۔ ان میں اپنی کمزوری کا احساس ضرور تھا مگر مغرب کے مقابلہ میں کمزری کا احساس ہرگز نہیں تھا۔ وہ مغرب سے مرعوب نہ تھے۔ بلکہ امتیاز اس کی ہر چیز کو قبول کرنے والے نہ تھے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مغرب کی مفید چیزوں کو لیکر اپنی سلطنت اور اپنی قوم کی کمزوریوں کو دور کر دیں اور زندگی کے میدان میں یورپ کے ساتھ برابر کی مسابقت کر سکیں۔ انھوں نے سلطان عبدالعزیز خاں کے زمانہ میں نظام سلطنت کی اصلاح اور فوج کی تنظیم کی اپنی قوم کے ادبیات میں زندگی کی نئی روح بھونکی۔ نئے مدارس اور کالج قائم کیے اور چند سال کے اندر ایک نسل تیار کر دی جس میں اسلامی تہذیب کے تمام جوہروں کے ساتھ تفکر و تدبیر کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ سلطان عبدالعزیز کے عزل و عزلت کے بعد اس کے شہزادے عمر پاشا جیسے جنرل، محنت پاشا جیسے مدبر اور نامتو کمال اور عبدالحق حمید جیسے سچے مسلمان اہل فکر و ادب کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

لیکن سلطان عبدالحمید نے اگر دفعۃً حرکت کا رخ بدل دیا۔ ۱۸۷۶ء سے لے کر ۱۹۰۹ء تک ۳۳ سال کا

زمانہ جس میں ایک دوسری مشرقی قوم (جاپان) ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئی اس خود غرض سلطان محض اپنے شخصی اقتدار کی خاطر ترکی قوم کی علمی، ذہنی، تمدنی اور سیاسی تنظیمی ترقی کو روکنے اور اس کی روح کو مردہ کرنے میں صرف کر دیا۔ یہاں موقع نہیں کہ اس شخص کے اعمال پر کوئی تفصیلی تبصرہ کیا جاسکے مختصر یہ ہے کہ اس نے تعمیر کے بہترین زمانے کو جس کی ایک ایک ساعت بیش قیمت تھی، تخریب میں کھودیا اس نے ترکی قوم کے بہترین مائغوں کو برباد کیا جمال الدین افغانی جسابے نظیر آدمی اسے ملا اور اس کو بھی اس شخص نے ضائع کر دیا۔ مگر سب بڑا نقصان جو اس کی بدولت نہ صرف ترکی قوم بلکہ دنیائے اسلام اور خود اسلام کو پہنچا وہ یہ تھا کہ اس نے خلافت کے مذہبی اقتدار اور حبیب پسند علماء و مشائخ کے اثرات کو بتدریج تخریب کے ترکی مصلحین کی اٹھائی ہوئی بنیادیں اکھیرٹنے، اور ترکی قوم کے ادنیٰ و ذہنی ارتقاء کو روکنے، اور سیاسی و تنظیمی اصلاحات کا استیصال کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس کی اس خود غرضانہ و نا عاقبت اندیشانہ حرکت سے ترکوں کی نئی نسل میں ایک انقلابی بحران پیدا ہو گیا۔ وہ مذہب کو مانع ترقی سمجھنے لگے اسلامیت سے ان کے دماغ خرف ہو گئے۔ تاریک خیال علماء اور مشائخ سے بجا طور پر جو نفرت ان کے دلوں میں پیدا ہوئی تھی اٹھلا کے جوش میں اس کا رخ مذہب کی طرف پھر گیا۔ وہ سمجھے اور جاہل علماء و مشائخ نے ان کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام ایک جامد مذہب ہے، زمانہ کی رفتار کے ساتھ حرکت کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں، اس کے قوانین تغیرات احوال کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور بحر چند تھا کہ اس میں کوئی دوسری چیز ایسی نہیں جو اپنے اندر کوئی بامیداری رکھتی ہو۔ اس ۳۳ برس کے استبداد نے جو بد قسمتی سے مذہبی رنگ لیے ہوئے تھا، ترکوں کی نئی نسلوں میں مادہ پرستی، دہریت، مغرب سے کامل معریت، مغربی تخیلات کی انہی تقلید اپنے ماضی سے نفرت، ہر قدیم چیز سے بیزاری اور خلافت و وحدت اسلامی سے جس کو سلطان عبدالحمید نے اپنی اغراض کا آلہ کار بنایا تھا، کراہت تام پیدا کر دی، اور ان کے اندر یہ خیال راسخ کر دیا کہ دنیا میں سر بلندی حاصل کرنے کے لیے تمام بھلی بنیادوں کو ڈھاکر بالکل مغربی طرز پر ترکیت کا قصہ غیر کمر ضروری ہے۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب نے سلطان عبدالحمید ثانی کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، اور سلطنت کی عنان اقتدار ان مخرف ذہنیت رکھنے والے جوشیلے اور متعل نو جوانوں کے ہاتھوں میں آگئی، خالہ ادیب خانم کے بقول یہ لوگ عہد تنظیمات کے اصلاح پسندوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان میں ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو علی قاضییت، تدبر و تفکر اور عالی دماغی میں دو تنظیمات کے مدبرین کی ٹکر کا موہ نہ ان کے پیش نظر وہ بلند نصب العین تھے، نہ ان کی سیرتوں میں مضبوطی تھی، نہ شائستگی اور تربیت کے لحاظ سے ان کا ان سے کوئی مقابلہ تھا، نہ قومی فخر و ناز کا وہ جذبہ ان میں موجود تھا، نہ تنقید کی وہ صلاحیت تھی کہ قدیم اور جدید کے صحیح فرق کو سمجھ سکیں۔ یہ چند ایسے نو جوانوں کا مجمع تھا جو اسلامی علوم میں کورے تھے، اسلامی تربیت میں ناقص تھے، مغربی علوم میں بھی گہری نظر نہ رکھتے تھے، اپنے مذہب اپنی تہذیب، اپنے علوم و آداب، اور اپنی قدیم اجتماعی تنظیمات کے خلاف ان کے دل و دماغ میں تعصب کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، مغرب کے تقدمات سے مرعوبیت ان کے اندر بدرجہ اتم پیدا ہو گئی تھی اور یہ اپنی ہر چیز کو مغرب کی ہر چیز سے بدل دینے کے لیے بے چین تھے۔ جب سلطنت ان کے ہاتھوں میں آئی تو یہ بند بانی جس کو ۳۳ برس کی طویل بندش نے بہت کچھ فاسد کر دیا تھا، طوفان کشی شکل میں پھوٹ نکلا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں ترکوں پر شیر نرم اور تورانی عصبيت کا جن سوار ہوا، وحدت اسلامی کی طرف سے سرد مہری ظاہر ہوئی شروع ہوئی، مذہب پر نکتہ چینی کا آغاز ہوا، قدیم تہذیب کو مٹا کر مغربی تہذیب کو بالکل اختیار کر لینے پر زور دیا جانے لگا، نامی سے تعلق منقطع کرنے اور مغرب کے قرب تر ہونے کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز پیش ہوئی، جدید نظریات کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کے لیے سرکاری علماء کا ایک گروہ اٹھا جس کا سرغنہ ضیا کوک الپ جیسا شخص تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے اتحاد اسلامی کے مقابلہ میں اتحاد تورانی کی زبردست تبلیغ کی، ترکوں کو عہد اسلامی کی تاریخ اور اس کے نامور بہادروں سے نفرت لاکر قدیم وحشی تاتاریوں پر فخر کرنا سکھایا جن میں جنگیز اور ہلاکو کی شخصیتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں، ترکی زبان کو اسلامی ادب کی خصوصیات سے پاک کرنے کی کوشش کی، اور تمدن، معاشرت، تہذیب و اطوار اور

عملی زندگی کے تمام طریقوں میں مغرب کی پوری تقلید کرنے پر زور دیا۔ اس قسم کے خیالات بکھنے والے شخص صاحبِ انقلابی جماعت کا امام مجتہد بن کر اٹھا اور اس نے کوشش شروع کی کہ اپنی متبعین کے ساتھ ملکر اسلامی تعلیمات کی ایسی تعبیر کرے جس سے حیدر گئے چُپے عقاید اور اخلاقی اصول کے سوا اسلام کی ہر چیز کو قابلِ تغیر ثابت کر کے مغربی سلطے میں ڈھال دیا جاسکے۔

ایک طرف ترکی قوم میں اتنی بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی۔ دوسری طرف ترکوں کے علماء اور مشائخ تھے جو اب بھی ساتویں صدی کی فضائے نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کے جمود ان کی تاریک خیالی ان کی محبت پسندی اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطانِ بیم کے زمانہ میں تھا۔ وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، حالانکہ ان کی آنکھوں کے سامنے الحاد کا دروازہ کھل رہا تھا۔ وہ ابھی تک فلسفہ اور کلام کی ہی کتابیں پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے جو کچھ پھینک کر زمانہ پانچ سو برس آگے نکل چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنی غلطوں میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی ضعیف حدیثیں سناتے جا رہے تھے جو کوسن کر سو برس پہلے تک کے لوگ تو سر دھنتے تھے، مگر آج کل کے دماغ ان کو سن کر صرف ان معسرینِ محدثین سے نہیں بلکہ خود قرآن و حدیث سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں۔ وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں ہی فہمی قوانین نافذ کیے جائیں گے جو شامی اور کنسر الدقایق میں لکھے ہوئے ہیں خواہ اس اصرار کا نتیجہ یہی کیوں ہو کہ ترک ان قوانین کے تباہ سے بھی آزاد ہو جائیں جو قرآن اور سنتِ رسول میں مقرر کیے گئے ہیں۔

غرض ایک طرف علماء اور مشائخ اپنی اسی روش پر قائم رہے جو ترکی قوم کو سو برس کے اندر تنظیمات کے مقام سے ہٹا کر انقلابیت کے اس مقام تک کھینچ کر لائی تھی۔ اور دوسری طرف ترکی قوم کے انقلابی لیڈرول سے مسلمان ہونے کے باوجود دماغ اور فکر و عمل کی واقعی دنیا میں سلام ہو وود اور دُور تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اسی زمانہ میں جنگِ عظیم پیش آئی جس میں عرب اور ہندوستان کے ہمت

مسلمانوں نے اعلیٰ اسلام کے ساتھ ملکر ترکوں کے گھیرے کاٹے۔ پھر جنگ عظیم کے بعد جب ترکوں نے اپنی حیات قومی کو کامل تباہی سے بچانے کے لیے جدوجہد شروع کی تو اس میں سب سے زیادہ ان کی مخالفت جنہوں نے کی وہ خلیفہ وقت اور شیخ الاسلام تھے۔ یہ آخری ضربات انقلابی ترک کی نیم جان سلامت کیلئے فیصلہ کن تھیں۔ انہی کا نتیجہ ہے جو آج ہم کو ترکی جدید کی غیر متبدل تجدید پسندی کی شکل میں نظر آ رہا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں جو انقلابی خیالات ابھی خام تھے اور جنکو جنگ طرابلس جنگ بلقان جنگ عظیم اور حملہ یونان کی مشغولیتوں نے پختہ ہونے سے روک رکھا تھا وہ لوزان کانفرنس کے بعد چنگی کو پہنچ گئے اور علی شکر خاں تیار کرنے لگے۔ لندن معاشرت میں کامل مغربیت زبان اور ادب سیاست میں اتہاد درجہ کی جنسی عصبيت انہوں نے خلافت کے بعد مذہب و سلطنت کی تفریق اور پھر خالدہ خانم کے بقول سلطنت کے مذہب سے آزاد کر کے مذہب کو سلطنت کا پابند بنا دینا اسلامی قانون کے بجائے سوشلزم کا قانون اختیار کرنا، وراثت اور نکاح و طلاق وغیرہ مسائل میں سکران کے صریح احکام تک بدل ڈالنا، عورتوں کو اسلامی تعلیم کے باطل خلاف اس آزادی کی روش پر ڈال دینا جس پر جنگ عظیم کے بعد یورپ کی عورتیں چل رہی ہیں یہ سب قدرتی نتائج ہیں جاہل علماء کے جمود اور ہوا پرست فوجی کی گمراہی اور خلافت کے منصبے نا جائز فائدہ اٹھانے والے سلاطین کی خود غرضی اور انقلابی لیڈروں کی قرآن و سنت رسول کے علم سے کلی جہالت کے افسوس کہ اس صدی میں ترکی قوم نے ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں کیا جو قرآن میں بصیرت رکھنے والا اور اسلامی تعلیم کی حقیقی روح کو سمجھنے والا ہوتا، اور زمانے کے متغیر حالات پر گہری نگاہ ڈال کر صحیح جہادی قوت سے کام لیتا اور اصول اسلام کو ان حالات پر منطبق کر کے ایک ایسا سمویا ہوا نظام مرتب کر دیتا جس کی اساس کتاب سنت پر ہوتی اور جس میں فتنہ زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے کی صلاحیت ہوتی۔

ترکی تاریخ کے ان تحولات سے جو لوگ واقف نہیں ہیں وہ عجیب عجیب غلطیوں کا شکار ہو رہے

ہیں۔ پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر و فسق کے فتیے لگا رہے ہیں۔ مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار تو ترکی کے علماء اور مشائخ ہیں۔ انہی کے جمود نے ایک مجاہد قوم کو جو پانچ سو برس سے اسلام کیلئے تنہا سینہ سپر تھی اسلامیہ سے فرگیت کی طرف دھکیلا ہے اور اندیشہ ہے کہ ایسے ہی جاہلین دوسری مسلمان قوموں کو بھی ایک روز اسی جانب دھکیل کر رہیں گے۔ دوسری طرف بدت پسند حضرات ہر اُس وحی کو جو انقرہ سے نازل ہوتی ہے مسلمانوں کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں گویا قرآن منسوخ ہو چکا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ختم ہو گئی، اب ہدایت ہے تو انا ترک کے اسوہ میں اور نورِ علم ہے تو آسمانِ نقس سے اتری ہوئی وحی میں۔ حالانکہ بجا پرے انا ترک اور اس کے متبعین کا حال یہ ہے کہ **وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخِرُّونَ**

(ترجمانِ نقس آں: ذی القعدہ ۱۲۵۲ھ - فروری ۱۹۳۳ء)

# عقلیت کا فریب (۱)

اسلامی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے نیم پختہ یا بالکل خام نوجوانوں کے مذہبی خیالات پر مغربی تعلیم و تہذیب کا جو اثر ہو تب سے اس کا اندازہ ان تحریروں سے ہو سکتا ہے جو اس قسم کے لوگوں کی زبان و قلم سے آئے دن نکلتی رہتی ہیں مثال کے طور پر حال ہی میں صوبہ متحدہ کے ایک مسلمان گریجویٹ صاحب کا ایک مضمون ہماری نظر سے گذرا جس میں انہوں نے اپنی سیاست چین و جاپان کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :-

”ہمارے ساتھ جتنے چینی مسافر ہیں وہ انہما کے بلا نوش اور شراب خوار ہیں، سور کا گوشت تو ان کی جان ہے۔۔۔۔۔ اب میں نے عیسائیت کی ترقی کا راز سمجھا چین اپنے قدیم مذہب کی پیروی کو نئی تعلیم کے ساتھ غار پاتا ہے۔ اسکو اسلام قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا اگر وہ اس کو سمجھتا ہوتا تو اسلام اس کو اس کی تمام مرغوب غذاؤں سے محروم کر دیتا ہے۔ چار و ناچار وہ عیسائی ہو جاتا ہے۔۔۔ کچھ عجیب نہیں کہ آئندہ چین کا سرکاری مذہب عیسائیت ہو جائے۔ میں سور کے گوشت کے معاملہ میں اہل یورپ و اہل چین کے نو مسلموں کے ساتھ ذرا ڈھیل دینا پسند کرتا ہوں قرآن سے بھی مجھے اس کے قطعی حرام ہونے میں شک ہو زیادہ بریں نیت کہ اہل عرب کے لڑکے جسے وہ حرام کر دیا گیا ہو مگر ایسی ملک میں جہاں اسکے بغیر غنّی اَصْطَطَّ عَلَیْہِمْ رَاغٌ وَ لَکَاجِدٌ ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟“

بہر حال قرآن کا یہی ایک حکم ہے جس کی ممانعت عمومی کی علت میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی ورنہ

مولا مودہ اور محرکات اخلاق میں ہر قدر بعد ہے کہ مذہب ہمارے کھانے کا مینو (MENU) بھی تیار

کرے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم کو آہن گری اور زرگری، خیالی وغیرہ کا کام بھی کیوں نہ سکھائے

یہ خیال ہو کہ دنیا میں سلام کے ترقی نہ کرنے کا راز اسی میں پنہاں ہو کہ وہ آدمی کے تمام حقوق انسانی سب کر کے ہو ایک لاشہ بے جان درلبا بے بس بچہ بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ترقی کی راہیں سب بھول جاتا ہے، ورنہ مذہب و حقیقت اسی قدر ہونا چاہیے جیسا کہ عیسائیوں نے سمجھ رکھا ہے۔

اس کے بعد وہ ٹنگھائی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”خدا کی اس بے شمار شفقت کو خوش و خرم و خوشحال دیکھ کر دل گواہی نہیں دیتا کہ یہ تمام کے تمام چند سال کے بعد دوزخ کے ایندھن بنائے جائیں گے گویا ان کی پیدائش کا یہی ایک مقصد خدا کے پاس رہ گیا ہو۔ پھر یہ سب کچھ لامتناہی اللہ چند نفوس کے علاوہ اگر بت پرست اور کافر ہیں تو انہوں نے دوزخ میں رکھے جانے کیلئے کیا یہی قصور کیا ہے کہ انہوں نے خدا کی زمین کو مسموم کر دیا ہے؟ وہ حاجیوں کو قتل و غارت کرتے ہیں، ان میں قوم لوط کا عمل ہے، نہ وہ کسی کے مال کو ہضم کر لیتے ہیں اور اسکو جائز کرنے کیلئے تاویلین کرتے ہیں، خاموشی سے اس زندگی کو جس کو خوبی ملے کر رہے ہیں پھر بھی وہ سختی دوزخ ہیں آخر کیوں؟.....“

یقیناً شراکانہ عقیدہ ایک سوداے خام ہی لیکن یہ تو بتا دو کہ اگر ایک شخص ایک ایسی ہستی کا فطرۃً قاتل ہو جاتا ہے جو اس کو مارتی اور جلاتی ہے تو محض اس لیے کہ اسکی مابینت اسکی سمجھ سے آتی ہے یا ہرے بقیہ عباد ہی سمجھ سے یا وہ عربی کو خدا کی زبان نہیں سمجھتا، اس کے دشمن ہوا اور وہ تنہا دشمن ہو جاتا ہے بھونچا نہیں! تنہا سے نزدیک یہ سب کچھ ضروری نہیں ہے ضروری تو یہ ہے کہ پاشا ایک خاص وضع کا ہو۔ کرتے کی کاٹ ایسی ہو، نفاق کم کا کھانا کھائے، منہ پر چار انگلی کی ڈاڑھی ہو کبھی اپنے ملکی مدرسوں میں قدم نہ رکھے اسلئے کہ وہاں مذہب کی زبان اور مذہب کا فن مٹے

کو نہیں سکھایا جاتا“

جاپان کے بندرگاہ کو بے کے متعلق فرماتے ہیں :-

”دو گھنٹے تک میں کتبے میں پھرتا رہا۔ ایک بھیک مانگتے والا مجھ کو نہ ملا اور نہ کوئی چھپے پرا  
کپڑوں میں بد حال ملا۔ یہ ہے اس قوم کی ترقی کا حال جو نہ مذہب کو جانتی ہے اور نہ خدا کو۔“  
پھر وہ بقول خود موعظہ حسنہ شروع کرتے ہیں :-

یاد رکھو کہ احسان اصل دین ہے اور احسان کسی زبان اور فن کا محتاج نہیں اس کا نظری  
یہ ہے کہ ہم آئندہ زندگی میں یا خود دوس زندگی میں اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور ہوں گے  
یہی اصل مذہب اسلام ہے۔ اس سے زیادہ جس چیز کا تم نے مذہب نام لے رکھا ہے وہ محض ہمار  
نفس کا دھوکا یا ہمارے دماغ کا خلل ہے جس روزانہ دونوں باتوں پر مذہب کو محدود کر  
دو گے اور اپنی ساری بیڑیاں شریعت کی توڑ ڈاؤ گے تم بھی قوموں کے ساتھ باہم ترقی پر چڑھو گے  
بلکہ یوں کہو کہ تم قوموں میں ضمیر پیدا کر دے جن کے ہاتھ سے اگر دنیا نہیں گئی ہے تو آسمانی بادشاہت  
بھی نہ جات گی تم خود کو کوئی قوم نہیں بنو بلکہ قوموں کے مصلح ہو مگر خدا اس کا موقع تو نہ دو  
کہ کوئی کہے کہ قتل قوم برسر اوج ہے مگر جو ان میں مسلمان ہیں ان کی حالت زبوں ہے اور  
یقیناً اس زبونی کا ذمہ دار ان کا عجیب و غریب مذہب ہے۔

یہ تحریر ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کی عام ماضی حالت کا ایک واضح نمونہ ہے۔ مسلمان کے گھر پیدا  
ہوئے مسلم سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے پہلے بڑھے مسلمانوں کے ساتھ معاشرت تمدن کی بندوبست  
میں بندھے اس لیے اسلام کی محبت مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی اور مسلمان رہنمائی کی خواہش گویا ان  
کی گھٹی میں پڑی اور ان کے دلوں میں اس طور پر بیٹھ گئی کہ اس میں ان کے ارادے اور ان کی اپنی  
عقلی و فکری قوتوں کا دخل نہ تھا۔ مگر قبل اس کے کہ اس اضطراری اور غیر شعوری اسلام کو تعلیم و  
تربیت کے ذریعہ سے نستہیاری اور شعوری اسلام بنایا جاتا، اور ان میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی  
کہ وہ اسلامی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ کر مسلمان ہوتے اور عملی زندگی میں اسکے احکام و قوانین کو

یرت کر بھی دیکھ لیتے انھیں انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے قواسم ذہنی فکری کی پرورش باطل غیر اسلامی تعلیم و تربیت میں ہوئی اور ان کے دماغوں پر مغربی افکار اور مغربی تہذیب کے اصول اس طرح چھا گئے کہ ہر چیز کو وہ مغرب کی نظر سے دیکھنے اور ہر مسئلہ پر مغرب ہی کے ذہن سے غور کرنے لگے اور مغربیت کے اس استیلاء سے آزاد ہو کر سوچنا اور دیکھنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ مغرب نے عقلیت (Rationalism) کا سبق ضرور سیکھا، مگر خود عقل ان کی اپنی نہ تھی بلکہ یورپ سے حاصل کی ہوئی تھی، اس لیے ان کی عقلیت دراصل فرنگی عقلیت ہو گئی نہ کہ آزاد عقلیت۔ انہوں نے مغرب سے تنقید (Criticism) کا بھی درس لیا، مگر یہ آزاد تنقید کا درس نہ تھا، بلکہ اس بات کا درس تھا کہ مغرب کے اصولوں کو برحق مان کر ان کے معیار پر ہر اس چیز کو جانچو جو مغربی نہیں ہے، لیکن خود مغرب کے اصولوں کو تنقید سے بالاتر سمجھو۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے بد جب لوگ کالجوں سے بالغ ہو کر نکلتے اور زندگی کے میدان عمل میں انہوں نے قدم رکھا تو ان کے دل اور دماغ میں بعد المشفقین واقع ہو چکا تھا۔ دل مسلمان تھی اور دماغ غیر مسلم رہتے مسلمانوں میں تھے شب و روز کے معاملات مسلمانوں کے ساتھ تھے تمدن و معاشرت کی بندشوں میں مسلمانوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، اپنے گرد و پیش مسلمانوں کی مذہبی و تمدنی زندگی کے اعمال دیکھ رہے تھے، ہمدردی و محبت کے رشتے مسلمانوں سے وابستہ تھے مگر سوچنے اور سمجھنے اور راستے قائم کرنے کی جتنی قوتیں تھیں وہ سب مغربی سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھیں جن سے نہ اسلام کا کوئی قاعدہ مطابقت رکھتا تھا اور نہ مسلمانوں کا کوئی عمل بابائے انہوں نے مغربی معیار کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کی ہر چیز پر تنقید شروع کی اور ہر اس چیز کو غلط اور قابلِ زیرِ سمجھ لیا جسے اس معیار کے خلاف پایا خواہ وہ اسلام کے اصول و فروع میں سے ہو یا محض مسلمانوں کا عمل ہو۔ ان میں سے بعض نے تحقیقِ حال کے لیے کچھ اسلام کا مطالعہ بھی کیا، مگر تنقید و تحقیق کا معیار وہی مغربی تھا۔ ان کی ذہنیت کے ٹیڑھے

سورخ میں اسلام کی سیدھی میخ آڑ بیٹھتی تو کیونکر؟

مذہبی مسائل پر جب یہ حضرات اٹھا رخبال کرتے ہیں تو ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بغیر سوچ سمجھے تقریر فرما رہے ہیں۔ نہ انکے مقدمات درست ہوتے ہیں۔ نہ منطقی اسلوب ان کو ترتیب دیتے ہیں اور صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کلام کرتے وقت خود اپنی پوزیشن بھی متعین نہیں کرتے۔ ایک ہی سلسلہ کلام میں مختلف حیثیتیں اختیار کر جاتے ہیں! ابھی ایک حیثیت سے بول رہے تھے کہ دفعہ ایک دوسری حیثیت اختیار کر لی اور اپنی پچھلی حیثیت کے خلاف بولنے لگے سچی فکر ( loose-thinking ) ان کے مذہبی ارشادات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مذہب کے علاوہ جس مسئلے پر بولیں گے ہوشیار اور چوکے ہو کر بولیں گے کیونکہ وہاں اگر کسی قسم کی بے ضابطگی ہو گئی تو جانتے ہیں کہ اہل علم کی نگاہ میں کوئی وقعت باقی نہ رہیگی لیکن مذہب چونکہ انکی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور اس کو وہ اتنا وزن ہی نہیں دیتے کہ اس پر کلام کرتے وقت اپنی دماغ پر کچھ زور دینا ضروری سمجھیں اس لیے یہاں وہ بالکل بے فکری کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی گفتگو فرماتے ہیں گویا کھانا کھا کر آرام کر سی پر دراز ہیں اور محض تفریح کے طو پر بول رہے ہیں جس میں ضوابط کلام کو ملحوظ رکھنے کی کوئی حاجت ہی نہیں۔

دوسری بات جو ان کی تحریروں میں نمایاں نظر آتی ہے وہ خیالات کی سطحیت اور معلومات کی کمی ہے۔ مذہب کے سوا کسی اور مسئلے میں وہ اتنی کم معلومات اور اس قدم فکر کے ساتھ بونے کی جرات نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں اگر تحقیق کے بغیر ایک کلمہ منہ سے نکل جائے تو آبرو جاتی ہے لیکن مذہب کے معاملہ میں تحقیق اور مطالعہ اور غور و فکر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ سرسری طور پر جو کچھ معلوم ہو گیا اس پر اسے قائم کر لی اور بے تکلف اسکو بیان کر دیا۔ اس لیے کہ کسی گرفت کا یہاں خوف ہی نہیں گرفت اگر کریگا تو مولوی کریگا۔ اور مولوی کے متعلق یہ بات پہلے ہی اصول موضوعہ کے طور پر

داخل مسلمات ہو چکی ہے کہ وہ تاریک خیال، دنیائوسی اور تنگ نظر ہوتا ہے۔

فاضل مضمون نگار کی زیر نظر تحریر چشم بد و دور ان دونوں خصوصیات کی حامل ہی سب سے پہلے تو ان مضمون نویس ہی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلم کی حیثیت سے کلام کر رہے ہیں یا غیر مسلم کی حیثیت سے۔ اسلام کے متعلق گفتگو کرنے والے کی دوسری حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ یا مسلم ہو گا یا غیر مسلم جو شخص مسلم کی حیثیت سے کلام کریگا عام اس سے کہ وہ خوش عقیدہ (Orthodox) ہو یا آزاد خیال یا اصلاح طلب بہر حال اسکے لیے لازم ہو گا کہ دائرۃ اسلام کے اندر بیکر کلام کے لیے قرآن کو منہمائے کلام (Final authority)

سمجھے اور ان اصول و قوانین شریعت کو تسلیم کرے جو قرآن نے مقرر کیے ہیں، کیونکہ اگر وہ قرآن کی سند نہ ملے گا اور کسی ایسی بات میں کلام کی گنجائش سمجھے گا جو قرآن سے ثابت ہو تو دائرۃ اسلام سے باہر نکل آئیگا اور اس لئے نہ بھٹکنے کے بعد کسی مسلمانہ حیثیت باقی ہی نہ رہیگی کہ وہ اس میں کلام کر سکے رہی دوسری حیثیت یعنی یہ کہ بولنے والا غیر مسلم ہو تو اس حیثیت میں اسی پورا حق ہو گا کہ قرآن کے اصول اور اس کے احکام پر چسپی چاہی تفتیش کے اس لیے کہ وہ اس کتاب کو منہمائے کلام نہیں مانتا لیکن یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد اسے مسلم کی حیثیت سے گفتگو کرنے اور مسلمان بن کر مسلمانوں کو اسلام پہنچانے اور اسلام کی ترقی کے وسائل بنانے کا کوئی حق نہ ہو گا۔ ایک صاحب عقل و شعور آدمی جب سوچ سمجھ کر اسلام کے متعلق گفتگو کریگا تو وہ سب سے پہلے یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ ان دونوں حیثیتوں میں سے کون سی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ پھر وہ جو حیثیت بھی اختیار کرے گا اس کے عقلی شرائط کو ملحوظ رکھے گا کیونکہ بیک وقت اپنا آپ کو مسلمان بھی کہنا اور قرآن کے مقرر کیے ہوئے اصول و قوانین پر کتہ چینی کا حق بھی استعمال کرنا قرآن کی سند میں کلام بھی کرنا اور مسلمانوں کو موعظہ حسنہ بھی سنانا کسی عقل کا فعل نہیں ہو سکتا یہ نقیضین کو جمع کرنا ہی اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی شخص بیک وقت مسلم بھی ہو اور غیر مسلم بھی۔ دائرۃ اسلام کے اندر بھی ہو اور اسکے باہر بھی۔

مضمون کا صاحب کی علمی قابلیت اور اپنی مقبولیت کی طرف سے ہم اتنی دکان نہیں ہیں کہ ان  
 یہ امید رکھیں کہ اگر وہ اسلام کے سوا کسی مسئلہ پر کلام فرماتے تو اس میں بھی اسی طرح مختلف حیثیتوں کو  
 بیک وقت اپنا درجہ کر لیتے ہم ان سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ قیصر ہند کی عدالت میں بیٹھ کر قیصر ہند  
 کے امضاء کے بیٹے قوانین پر نکتہ چینی کرنے کا حق استعمال فرمائیں گے نہ ہم ان سے اس جرات کی توقع  
 رکھتے ہیں کہ وہ کسی مذہب پر کرسی (School of thought) کی پیروی کا دعویٰ کرنے کے بعد  
 ان اصولوں پر مخالفانہ نکتہ چینی کریں گے جن پر وہ مذہب قائم ہے لیکن طرفہ ماہر ہے کہ اسلام کے  
 معاملہ میں انہوں نے دو بالکل مختلف حیثیتیں اختیار کی ہیں اور یہ محسوس نہ کیا کہ وہ بار بار اپنی پوزیشن  
 بدل رہے ہیں ایک طرف وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں مسلمانوں کا سامنا کرتے ہیں مسلمانوں  
 کی زبوں حالی پر اظہارِ رنج فرماتے ہیں اسلام کی ترقی کی خواہش ظاہر کرتے ہیں مسلمانوں کو احسان  
 یعنی اصل دین کا وعظ سناتے ہیں دوسری طرف اُس کتاب کے مقرر کیے ہوئے اصول اور قوانین پر نکتہ چینی  
 بھی کرتے ہیں جس پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور جو آخری سند تسلیم کرنا مسلمان ہونے کی لازمی شرط ہے۔  
 قرآن ایک جگہ ہمیں چار جگہ بالتصریح سورہ کے گوشت کو حرام قرار دیتا ہے مگر آپ اس معاملہ میں ڈھیل دینا  
 پسند فرماتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ڈھیل دینے کی یہ خواہش بھی ترقی اسلام کیلئے ہے گویا ترقی اسلام کی فکر  
 آپ کو قرآن کی بھی یاد ہے! یا کوئی اسلام قرآن سے باہر بھی ہو چکی ترقی آپ پاتے ہیں! قرآن فی الواقع  
 انسان کیلئے کھانے کا مینو تیار کرتا ہے کھانے کی چیزوں میں حرام و حلال غیث طیبیت کا فرق قائم کر رہا ہے  
 صاف کہتا ہے کہ تم اپنا اختیار سے کسی شے کو حلال اور کسی کو حرام قرار دینے کا حق نہیں رکھتے مگر آپ کو اپنے  
 اس حق پر اصرار ہے اور خود قرآن کا یہ حق تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ وہ کھانے پینے میں مذہب کو دخل ہے قرآن  
 مذہب کے ان حدود میں محدود نہیں رکھتا جن میں سنٹ پال (انگریز) کے متبعین نے سکھ خود دیکھا ہے وہ لباس

اکل و شرب، نکاح و طلاق، وراثت، لین دین، سیاست، عدالت، تعزیرات وغیرہ کے قوانین وضع کرنا ہی مگر آپس قسم کی قانون سازی کو غلط سمجھتے ہیں اس کو ترقی اسلام میں مانع قرار دیتے ہیں اس پر الزام رکھتے ہیں کہ وہ انسان کو ایک ششہ بیجان اور بے بسن کچھ بنا دیتا ہی اور تجویز کرتے ہیں کہ مذہب اسی قدر ہونا چاہیے جس قدر عیسائیوں (اصل پولیسوں) نے سمجھا ہی قرآن نے خود قوانین شریعت بنائے ہیں اور ان کو محدود اللہ تو نہیں کر کے انکی اپنندی کا حکم دیا ہی مگر آپ شریعت کی ان دو کو بیرونی سمجھتے ہیں اور سینٹ پال کی طرح مذہب کی توسیع و تنزیل کیلئے فری دیتے ہیں ان بیرونی کو توڑ ڈالا جائے۔ قرآن کے نزدیک ایمان نکات کی پہلی اور لازمی شرط ہی اور جو لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے انکے متعلق وہ بالفاظ صریح کہتا ہے کہ وہ دوزخ کا ایندھن بنائے جائیں گے خواہ وہ بے شمار ہوں یا شمار میں آجائیں خوش حال ہوں یا بد حال مگر آپ کا حال یہ ہی کہ کافروں اور بت پرستوں کی بے شمار خلعت کو خوش و خرم و خوشحال دیکھ کر آپ کا دل گواہی نہیں دیتا کہ چند سال کے بعد سب فتنہ کا ایندھن بنائے جائیں گے اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے خدا کی زمین کو مسمور کر دینے کے سوا اور کون سا قصور کیا ہی سوال یہ ہے کہ قرآن سے اتنا کھلا ہوا اختلاف رکھتے ہوئے آپ مسلمان کیسے کہہ سکتے ہیں اور مسلمان جو ہوئے قرآن سے اختلاف کیونکر کر سکتے ہیں؛ اگر آپ مسلمان ہیں تو قرآن سے اختلاف تو فرمائیے اور اگر قرآن سے اختلاف کرنا چاہتی ہیں تو دائرۃ اسلام سی باہر کھڑے ہو کر اختلاف کیجیے۔

جو شخص کسی مذہب کے اصول اور احکام، قوانین، مصلحت ہو، جس کا دل انکی صداقت پر گواہی نہ دیتا ہو، جو انکی علت و مصلحت کو سمجھنے سے عاجز ہو اور جس کے نزدیک ان میں سے بعض یا اکثر باتیں قابل اعتراض ہوں اسکے لیے یہ دہراتے کھلے ہوئے ہیں، یا تو وہ اس مذہب سے نکل جائے پھر اس کو حق ہو گا کہ اس مذہب کے جس قاعدے اور جس حکم پر چائے مکہ چینی کرے، یا اگر وہ اس عدم اطمینان کے باوجود اس مذہب میں رہنا چاہتا ہی تو اس کے خلاف مناظرہ کرنے سے احتراز کرے اور مجتہد بن کر اس کے قواعد و ضوابط پر تیش چلانے کے بجائے طاب علم

بن کر اپنی ٹھکانے کی کوشش کرے عقل و دانش کی رو سے تو اس حالت میں یہی دو طریقے عقل  
 ہو سکتے ہیں اور وہ عقل جب کبھی ایسی حالت میں مبتلا ہو گا تو انہی میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کرے گا۔  
 لیکن جنہیں مضمون نگار اور انجی طرح بہت سی ذہنی تعلیم و تربیت پائے ہوئے حضرات کا حال یہ ہے کہ پہلا طریقہ اختیار  
 کرنے کی اخلاقی جرأت ان میں نہیں اور دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہوئے انہیں شرم آتی ہے اس لیے انہوں نے  
 بیچ کا ایک غیر عقلی طریقہ اختیار کر رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں میں شامل بھی ہوتے ہیں ترقی  
 اسلام کے آرزو مند بھی بنتے ہیں اسلام اور مسلمانوں کے درمیان تپتے بھی ہیں اور دوسری طرف مسلمان  
 کے خلاف وہ کچھ کہتے اور کرتے ہیں جو ایک غیر مسلم کہہ اور کر سکتا ہے حدیث و فقہ تو درگزر ان تک پر  
 نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہتے اور ان تمام بنیادوں پر ضرب لگاتے ہیں جن پر اسلام قائم ہے۔ ان  
 حضرات کو دعویٰ ہے کہ ہم ارباب عقل (Rationalists) ہیں کہتے ہیں کہ ہم کوئی ایسی بات نہیں  
 مان سکتے جو عقل کے خلاف ہو۔ ملائی پر ان کا سب سے بڑا الزام یہی ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے بلکہ خود ان  
 کا حال یہ ہے کہ مذہب کے معاملہ میں صریح متناقض باتیں کہتے ہیں متضاد طرز عمل اختیار کرتے ہیں،  
 اور اپنی ایک بات کی تردید خود اپنی ہی دوسری بات سے کرتے ہیں۔ آخر یہ ریشہ ندرم کی کونسی قسم  
 ہے جس کی ایجاد کا شرف ان روشن خیال محققین کو حاصل ہوا ہے؟

اب ذرا ان کی معلومات کی وسعت اور فکر کی گہرائی ملاحظہ فرمائیے

اسلام کی ترقی کے لیے آپ ضروری سمجھتے ہیں کہ مسیحیت کی طرح اسلام سے بھی شرعی حدود و ثلثا  
 دی جائیں اور اسلام صرف ایک عقیدہ کی حیثیت میں رہ جائے کیونکہ مسیحیت کی ترقی کا راز جو آپ نے سمجھا  
 وہ یہ ہے کہ اس میں حرام و حلال کی قیود نہیں ہیں، اخلاقی پابندیاں نہیں ہیں اس میں آدمی کے انسانی  
 حقوق سلب کر کے اسکو ایک لاشہ بیجان اور بے سن پتہ نہیں بنایا گیا ہے بلکہ اسکو آزاد دی دیدی گئی ہے  
 کہ مسیح پر ایمان رکھ کر جو چاہے کرے مگر آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ اسلام جس چیز کا نام ہے وہ قرآن میں ہے

اور قرآن نے ایمان و عمل صالح کے مجموعہ کا نام اسلام رکھا ہی عمل صالح کیلئے قیود مقرر کی ہیں قوانین بنائے ہیں اور انفرادی اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل نظام عمل مقرر کیا جو جس کے بغیر اسلام بحیثیت ایک دین اور ایک تہذیب کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اس نظام اور اس کی حدود کو منسوخ کرنے کا اختیار کسی مسلمان کو نہیں ہو کیونکہ اس کا نسخہ قرآن کا نسخہ ہے اور قرآن کا نسخہ اسلام کا نسخہ ہے اور جب اسلام خود ہی منسوخ ہو جائے تو اس کی ترقی کے کیا معنی؟ آپ خود کسی مذہب کو ایجاد کر کے اسکی اشاعت فرما سکتے ہیں مگر جو چیز قرآن کے خلاف ہے اس کو اسلام کے نام سے موسوم کرنے اور اسکی ترقی کو اسلام کی ترقی کہنے کا آپ کو کیا حق ہے؟

آپ اسلام صرف اس عقیدہ کا نام رکھتے ہیں کہ ہم آئندہ زندگی میں یا خود اس زندگی میں اپنی اعمال کے جوابدہ ہیں اور ہونے والے ایام غالباً آپنے اس سید پر فرمائی ہے کہ اگر اسلام اس حد میں محدود ہو جائیگا تو بالکل نرم اور آسان ہو جائیگا اور خوب پھیلتا چلا جائے گا لیکن اگر آپ اس عقیدہ کے معنی پر غور فرماتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اس حد میں محدود ہونے کے بعد بھی اسلام آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا اس عقیدے کو مذہب قرار دینے کیلئے سب سے پہلے توحیات اخروی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر جواب ہی کا مفہوم تین باتوں کا متقاضی ہے ایک یہ کہ جس کے سامنے جواب ہی کوئی ہے اسکو متعین کیا جائے اور اسکی بالادستی تسلیم کر لی جائے۔ دوسرے یہ کہ جواب ہی کی نوعیت متعین کی جائے اور زندگی کے اعمال میں اس لحاظ سے امتیاز کیا جائے کہ کن اعمال سے اس جواب ہی میں کامیابی نصیب ہوگی اور کون سے اعمال ناکامی کے موجب ہونگے تیسرے یہ کہ جواب ہی میں کامیابی اور ناکامی کے جدا جدا نتائج متعین کیے جائیں کیونکہ اگر ناکامی کا نتیجہ بھی وہی ہو جو کامیابی کا ہے یا سب سے سبب و فوٹوں کا کوئی نتیجہ ہی نہ ہو تو جواب ہی باطل ہے معنی ہے۔ یہ اس عقیدہ کے عقلی لوازم ہیں جبکہ آپ اصل دین و قرآن سے ہیں۔ اب اگر آپ کی تجویز کے مطابق اسی عقیدہ پر اسلام کو قائم کر دیا جائے تب بھی وہی مصیبت پیش آئے گی جس سے آپ بچنا چاہتے تھے پھر وہی خدا کو ماتنا لازم آئے گا جس کے بغیر جاپان آپ کو ترقی کے نام پر چڑھتا ہوا نظر آ رہا ہو۔ پھر وہی شریعت

کی بیڑیاں اور اخلاق کی زنجیریں تیار ہو جائیں گی جن کو آپ نے اُٹھا چاہتے ہیں اور جن کے وجود میں آپ کے نزدیک اسلام کے ترقی نہ کرنے کا راز پوشیدہ ہو۔ پھر وہی عذابِ ثواب کا جھگڑا نکل آئے گا اور خدا کی بے شمار خلقت کو اس عقیدے کے بغیر خوش و خرم و خوشحال نہ دیکھ کر آپ کا دل پھر سبابت پر گواہی دینے سے انکار کرنے لگے گا کہ چند سال بعد یہ سب عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

براہِ کرم اب فراموش کر کے کسی ایسی چیز کا نام سلام نہ کیجیے جس میں کسی قسم کی قید و بند نہ ہو جس کو ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ یکساں ہو جس میں صرف خدا کی زمین کو مسمور کر دینا دنیا و آخرت کی کامیابی کیلئے کافی ہو اور جس پر ایمان نہ لانے والی بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوشحال نہ دیکھ کر آپ کا دل گواہی دے سکے کہ وہ سب جنت کی ٹیلیں بنائی جائیں گی۔

قرآن کی رو سے سورے گوشت کا قطعی حرام ہونا آپ کے نزدیک مسلم نہیں ہے۔ آپ شک فرماتے ہیں کہ شاید اہل عرب کے ایسی کسی خالص جہ سے حرام کر دیا گیا ہو گا۔ لیکن اگر آپ اس سائے کو ظاہر کرنے سے پہلے قرآن کھول کر پڑھ لیتے تو اس شک کی تحقیق ہو جاتی۔ اس کتاب میں صاف لکھا ہوا ہے کہ :-

قُلْ لَا اَجِدُ فِيمَا اُوْحِيَ اِلَيَّ حَرْمًا  
عَلٰی طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ مَيْتَةً  
اَوْ دَمًا مَّسْفُورًا اَوْ خَوْضًا بَرًا لِّهِمْ  
اَوْ قِسْقًا اَهْلًا لِّغَيْرِ اللّٰهِ بِمَنْ اَضَلَّ وَغَيَّرَ  
بَآخِرَ ذٰلِكَ اَعَادَ فَاَنْ اَللّٰهُ عَفُوٌّ رَّحِيْمٌ

اے پیغمبر! کہو کہ میری طرف جو وحی بھیجی گئی ہے اس میں تو کسی چیز کو جسے کوئی کھانے والا کھلتے ہیں اہم نہیں پاتا الا یہ کہ وہ مڑا ہو یا بہا ہو یا خون ہو یا سور کا گوشت ہو کیونکہ وہ تحقیق ناپاک ہے یا نافرمانی کے طوط پر اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے ذبح کیا گیا ہو پھر جو شخص مجبور ہو گیا بغیر اس کے کہ وہ نافرمان اور مدد فرستے۔

(۱۸: ۶)

تجاذر کر لیا ہوا ہو تو تیرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں سور کے گوشت کو ہر طاعم یعنی کھانے والے کیلئے حرام قرار دیا گیا ہے اور مرت کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ "رئس" ناپاک ہے۔ کیا یہاں طاعم سے مراد عرب کا طاعم ہے؟ اور کیا

ایک ہی چیز کے لیے جس اور غیر عرب کے لیے طیب طاهر ہو سکتی ہے؟ اور کیا اسی طریقہ سے آپ مہر مار کھانے والوں کیلئے بھی ذرا ڈھیل دینا پسند فرمائیں گے؟ آپ سور کے معاملہ میں ڈھیل چاہتے ہیں تو خود اپنی طرف سے دیکھیے، مگر قرآن کے صریح الفاظ کے خلاف آپ کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ قرآن سے اس کی قطعی ممانعت منکوک ہے؟

آج کل کے نئے مجتہدین نے اجتہاد کے جو اصول وضع کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام کے جس حکم کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق بلا تکلف کہہ دیتے ہیں کہ یہ حکم خاص اہل عرب کے لیے تھا خواہ قرآن میں اس شخص کی طرف کوئی ذرا سا اشارہ بھی نہ ہو اور تخصیص کیلئے وہ کوئی عقلی فیصلی دلیل نہ رکھتے ہوں اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو بعد نہیں کہ ایک روز قرآن ہی کو اہل عرب کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

اور فہم اضطراعیہ کاغذ کا عادی سے استدلال تو اتنا لطیف ہے کہ صاحب سفر نامہ کے علم و فضل کی داد دینے کو بھی چاہتا ہے۔ غالباً اس آیت کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا ہو گا کہ جب سور کا گوشت کھانے کو بے اختیار جی چاہے تو کھا لو مگر باغ میں بیٹھ کر نہ کھانا اور نہ اسکی عادت ڈال لینا۔ سور کے گوشت کے معاملہ میں اہل یورپ و اہل چین کے لیے ڈھیل دینے کی گنجائش اس آیت سے وہی شخص کال سکتا ہے جو نہ اضطراعیہ کے معنی جانتا ہو نہ باغی کا مفہوم سمجھتا ہو اور نہ عادی کا۔ ورنہ جانتے والے کے لیے تو اتنی جرات کرنا بہت مشکل ہے۔ آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کو مردار خوردی یا خون آشامی کا چسکا لگا ہوا ہو یا جو لوگ سور کے گوشت پر جان دیتے ہوں یا جن کے ہاں مَا اٰھْلَیْہِ لِغَیْرِہِ اللّٰہِ کے کھانے کا عام دستور ہو کہ وہ سب مجبوروں میں داخل ہیں، اگر ایسا ہوتا تو تحریم کا حکم ہی بے معنی ہو جاتا کیونکہ اگر تحریم ان لوگوں کیلئے تھی جو ان چیزوں کے خوگر تھے تو ہتھنار سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی عادت کے مطابق انہیں کھانے سہتے اور اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو خود ہی ان سے مجتنب تھے، تو ان کے لیے اس حکم کی لے خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا ہوا۔

ضرورت ہی نہ تھی۔ جنہارا مجبوری کے ساتھ غیوبِ باغِ وِلا عادی کی شرط لگا کر جو استثناء کیا گیا، اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ جو شخص بھوک سی مر رہا ہو اور حرام چیز کے سوا کوئی چیز اس کو ملتی نہ ہو وہ شخص جان بچانے کے لیے حرام چیز کھا سکتا ہے بشرطیکہ حد نصرت سے تجاوز نہ کرے یعنی جان بچانے کیلئے جتنی مقدار ناگزیر ہو اس سے زیادہ نہ کھائے اور حدودِ اسد کو توڑنے کی خواہش اس کے دل میں نہ ہو۔ اسی بات کو ایک دوسری جگہ سورۃ رعد اور وغیرہ چیزوں کی تحریم کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا گیا ہے فَمِنْ أَضْطَرٍّ فِي غَلْظٍ عَیْرٍ مِّنْكَ أَنْفٍ لَا تَعْلَمُ لِمَنِ بَشْعٌ بھوک کی شدت سے مجبور ہو جائے بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف کوئی میلان اس کے دل میں ہو وہ ایسی حالت میں حرام چیز کھا سکتا ہے کہاں یہ بات اور کہاں کہ اہل یورپ اور اہل چین چونکہ سور کے گوشت پر جان دیتے ہیں لہذا فَمِنْ أَضْطَرٍّ غَیْرٍ بَاغٍ وِلا عادی سے فائدہ اٹھا کر ان کے لیے سور کو جائز کر دیا جائے اور وہ بھی اس لیے کہ وہ اسلام میں داخل ہو سکیں اگر اسی طریقہ سے ہر قوم کی رغبتوں اور خواہشوں کا لحاظ کر کے اسلام کے قوانین میں مصلحت دینے کا سلسلہ شروع ہوتا تو شراب بھو، زنا، سود اور ایسی ہی دوسری تمام چیزوں کو ایک ایک کر کے حلال کرنا پڑیگا۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے احکام کو ماننے اور اس کے قائم کیے ہوئے حدود کی پابندی کرنے اور اس کے حرام کو حرام سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہیں ان کو اسلام میں داخل کسے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اسلام ان کا محتاج کب ہے کہ وہ ان کو راضی کرنے کیلئے کم و بیش پر سودا کرے؟

پہلے تو صرف سور ہی کے حرام ہونے کی علت آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر پھر جو آپ نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اصولاً مسدود اور محرکات اخلاق میں بونِ بعید ہے لہذا آپ نے یہ رائے قائم فرمائی کہ مذہب کو کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کا امتیاز قائم کرنے کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں ہے۔ اس ارشاد سے یہ راز فاش ہو گیا کہ آپ جتنا قرآن کے متعلق جانتے ہیں حکمتِ طبعی (Physical Science) کے متعلق بھی اس سے کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ قرآن ہی ناواقف ہوتا تو خیر ایک

”روشن خیال تعلیم یافتہ آدمی کے لیے شرمناک نہیں ہے مگر سائنس سے اتنی بے خبری البتہ بہت شرمناک ہے! آپ کو اب تک یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ انسان کے نفس اور اس کی ترکیب جسمانی کے درمیان کیا تعلق ہے اور اس کی ترکیب جسمانی غذا سے کیا تعلق رکھتی ہے؟ جو چیز جسم کو اس کے ضائع شدہ اجزائے ترکیبی فراہم کرتی ہے جس سے بدن کے تمام ریشے اور اعصاب از سر نو بنتے ہیں جو چند سال کے اندر پورے جسم کی جگہ نیا جسم پورا کرنا دیتی ہے اس کی خصوصیات کا اثر نفس اور روح پر ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا قابل تعجب ہے، اس حقیقت سے سائنٹفک دنیا پہلے عموماً غافل تھی مگر فن تغذیہ (Dietetics) پر حال میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے یہ راز منکشف ہو گیا ہے کہ انسان کے اخلاق اور اس کی ذہنی قوتوں پر اس کی غذا کا اثر ضرور مترتب ہوتا ہے چنانچہ آج کل کے حکماء اس بحث میں لگے ہوئے ہیں کہ مختلف قسم کی غذاؤں سے ہمارے نفس اور قوائے فکری پر کیا اثرات ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گوبجیٹ دوست کی سائنٹفک معلومات تازہ Up-to-date. نہیں ہیں ورنہ وہ اتنی جرأت کے ساتھ یہ دعویٰ نہ کر دیتے کہ اصولاً معرہ اور محرکات اخلاق میں بُعد ہے۔

(ترجمان القرآن شعبان ۱۳۵۳ھ - دسمبر ۱۹۳۲ء)

## عقلیت کا فریب (۲)

حقیقت (Naturalism) اور فطرتیت (Rationalism) یہ دو چیزیں ہیں جن کا اشتہار گذشتہ دو صدیوں سے مغربی تہذیب بڑے زور شور سے دے رہی ہے۔ اشتہار کی قوت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ جس چیز کو ہم مسلسل اور بکثرت نگاہوں کے سامنے لایا جائے اور کانوں پر مسلط کیا جائے اس کے اثر سے انسان اپنے دل اور ذہن کو کہاں تک بچا تا ہے گا۔ بالآخر اشتہار کے زور سے دنیا نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ مغربی علوم اور مغربی تمدن کی بنیاد سراسر عقلیت اور فطرت پر ہے۔ حالانکہ مغربی تہذیب کے تعقیدی مطالعہ سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ اسکی بنیاد یہ عقلیت ہے اور نہ اصول فطرت کی متابعت پر بلکہ اسکے برعکس اس کا پورا ڈھچر حس اور خواہش اور ضرورت پر قائم ہے۔ مغرب کی نشاۃ جدیدہ و اصل عقل اور فطرت کے خلاف ایک بناوت تھی۔ اس نے مقولات کو چھوڑ کر محسوسات اور مادیات کی طرف رجوع کیا۔ عقل کے بجائے حس پر اعتماد کیا۔ عقلی ہدایت اور منطقی استدلال اور فطری وجدان کو رد کر کے محسوس مادی نتائج کو اصلی حقیقی معیار قرار دیا۔ فطرت کی رہنمائی کو مردود ٹھہرا کر خواہش اور ضرورت کو اپنا رہنما بنایا۔ ہر اس چیز کو بے اصل سمجھا جو ناپ اور تول میں آسکتی ہو۔ ہر اس شے کو بیچ اور ناقابل عہد تنا قرار دیا جس پر کوئی محسوس مادی منفعت مترتب ہوتی ہو۔ ابتدا میں یہ حقیقت خود اہل مغرب سے چھپی ہوئی تھی اس لیے وہ عقل اور فطرت کے خلاف چلنے کے باوجود یہی سمجھتے رہے کہ انہوں نے جس روشن خیالی کے دور جدید کا افتتاح کیا ہے اسکی بنیاد عقلیت اور فطرت پر ہے۔ بعد میں اصل حقیقت کھلی مگر اعتراف کی جرأت نہ ہوئی۔ مادہ پرستی اور خواہشات کی غلامی اور مطابقت

نفس جس کی بندگی پر ممانعت کے ساتھ عقلی استدلال اور ادعائے فطرت کے پرے ڈالے جاتے ہیں۔ لیکن انگریزی محاورے کے مطابق بلی تھیلے سے بالکل باہر کی ہو غیر معقولیت اور خلاف ورزی فطرت کی لئے اتنی بڑھ چکی ہے کہ اس پر کوئی پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس یو اب حکم کھلا عقل اور فطرت دونوں بغاوت کا اعلان کیا جا رہا ہے علم اور حکمت کی مقدس فضا سے لے کر معاشرت و معیشت اور سیاست تک ہر جگہ بغاوت کا علم بلند ہو چکا ہو اور قدانت پرست منافقین کی ایک جماعت کو مستثنیٰ کر کے دنیائے جدید کے تمام رہنما اپنی تہذیب نہ صرف خواہش اور ضرورت کی حکمرانی تسلیم کر رہے ہیں۔

مشرقی مستغربین و متغربین اپنی پیشواؤں سے ابھی چند قدم پیچھے ہیں۔ ان کا دماغی نشوونما جس تعلیم اور جن ذہنی فضا اور جن عوامل تہذیب تمدن کے زیر اثر ہوا ہے ان کا اقتدار یہی ہے کہ وہی محسوس و مادیات کی سبقت اور خواہشات و ضروریات کی غلامی ان میں بھی پیدا ہو اور فی الواقع ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اس منزل پر نہیں پہنچے ہیں جہاں بلی تھیلے سے باہر آجائے اپنی تحریر و تقریر میں اب بھی کہے جاتے ہیں کہ ہم صرف عقل اور فطرت کی رہنمائی تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے صرف عقلی استدلال پیش کرو۔ ہم کسی ایسی چیز کو نہ مانیں گے جو عقلی دلائل اور فطری شواہد سے ثابت نہ کر دی جائے لیکن ان تمام بلند آہنگیوں کے پھیلے میں ہی بلی چھپی ہوئی ہے جو نہ عقلی نہ فطری۔ ان کے مقالات کا تجزیہ کیجیے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ مقولات اور فطری وجدانیت کے اور ان کے ذہن عاجز ہیں جسکو عقلی فائدہ“ کہتے ہیں اسکی حقیقت پوچھیے تو معلوم ہوگا کہ اس سے مراد تجربی فائدہ ہی اور تجربی فائدہ وہ ہے جو ٹھوس ہو ورنہ ہوشیار اور پیمائش میں آسکے۔ کوئی چیز جس کا فائدہ انکو حسابی اعداد سے گن کر یا ترازو کے پڑوسے تول کر یا گنت سے ناپ کر نہ بتایا جاسکے، اسکو یہ مفید نہیں مان سکتے، اور جب تک اس معنی خاص میں اسکی افاد ثابت نہ کر دی جائے اس پر ایمان لانا اور اس کا اتباع کرنا انکے نزدیک ایسا فضل ہی جسکو غیر معقولیت سے تعبیر کرتے ہیں فطرت کی رہنمائی جسکی پیروی کا ان کو دعویٰ ہو اسکی حقیقت بھی ٹھوڑی سی جرح میں

کھل جاتی ہے فطرت سے مردان کے نزدیک انسانی فطرت نہیں بلکہ حیوانی فطرت ہی جو وجدان اور شہادت قلبیہ سے قالی ہے اور صرف حس و خواہش اور مطالبات نفس و جسد ہی رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک اعتبار کے قابل صرف وہی چیزیں ہیں جو حواس کو متاثر کر سکیں خواہشات کو تسکین دے سکیں جسمانی یا نفسانی مطالبات کو پورا کر سکیں جن کا فائدہ فوراً مشاہدہ میں آجائے اور جن کا نقصان نظروں سے اوجھل ہو یا فائدہ کے مقابلے میں ان کو کم نظر لگے۔ باقی رہیں وہ چیزیں جو فطرت انسانی کے مقصدیات سے ہیں جن کی اہمیت کو انسان اپنی وجدان میں پاتا ہے جسکے فوائد یا نقصانات مادی اور حسی نہیں بلکہ نفسی اور روحانی ہیں۔ سوان کی نگاہ میں وہ اوہام اور خرافات ہیں، ہوج اور ناقابل اعتنا ہیں، ان کو کسی قسم کی اہمیت دینا بلکہ ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی تاریک خیالی و ہم پرستی اور دنیا تو سیت ہے ایک طرف عقل و فطرت سے یہ انحراف ہے دوسری طرف عقلیت اور فطرت کا دعویٰ ہے اور عقل کے دیوالیہ پن کا حال یہ ہے کہ وہ ہل اجتماع ضدین کو محسوس تک نہیں کرتی۔

تعلیم اور تہذیب فکر کا کم سے کم اتنا فائدہ تو ہر انسان کو حاصل ہونا چاہیئے کہ اس کے خیالات میں الجھاؤ باقی نہ رہے افکار میں پراگندگی اور ژولیدگی نہ ہو وہ صاف اور سیدھا طریق فکر اختیار کر سکے۔ مقدمات کو صحیح ترتیب دے کر صحیح نتیجہ اخذ کر سکے، تناقض اور غلط بحث جیسی صریح غلطیوں سے بچ سکے لیکن مستثنیات کو چھوڑ کر ہم اپنے عام تعلیم یافتہ حضرات کو دماغی تربیت کے ان ابتدائی ثمرات سے بھی محروم پاتے ہیں۔ ان میں اتنی تمیز بھی تو نہیں ہوتی کہ کسی مسئلے پر بحث کرنے سے پہلے اپنی صحیح حیثیت متعین کر لیں پھر اس حیثیت کے عقلی لوازم کو سمجھیں اور ان کو ملحوظ رکھ کر ایسا طریق ہستہ لال اختیار کریں جو اس حیثیت سے مناسبت رکھتا ہو۔ ان سے گھٹا کیجیے یا ان کی تحریریں دیکھیے پہلی نظر ہی میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ ان کے خیالات میں سخت الجھاؤ ہے۔ بحث کی ابتدا ایک حیثیت سے کی تھی چند قدم چل کر حیثیت بدل دی آگے بڑھے تو ایک دوسری حیثیت اختیار کر لی۔ انہماک مدعا کیلئے مقدمات کو

سمجھ بچھ کر انتخاب کرنا اور ان کو منطقی اسلوب پر مرتب کرنا نہ آیا۔ آفاذ سے لے کر اختتام تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ دراصل آپ کا مدعا کیا ہے؟ کس مسئلے کی تحقیق پیش نظر تھی اور کیا آپ نے ثابت کیا۔ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ موجودہ تہذیب اور اسکے اثر سے موجودہ تعلیم کا میلان زیادہ تر حسیات اور مادیات کی طرف ہے۔ وہ خواہشات کو تو بیدار کر دیتی ہے، مطلوبات اور ضروریات کے احساس کو بھی ابھار دیتی ہے، عموماً کی اہمیت بھی دلوں میں بٹھا دیتی ہے، مگر عقل اور ذہن کی تربیت نہیں کرتی، تنقید اور فکر کی صلاحیتوں کو نہیں چمکاتی، تہذیب نفس اور تنویر افکار سے غفلت برتی ہوئی اور سب سے زیادہ یہ کہ مادیات کی طرف غیر معتدل میلان پیدا کر کے ذہن کا توازن بگاڑ دیتی ہے۔ اس تعلیم سے مرہن ہو کر جو لوگ نکلتے ہیں ان میں عقل اور فکر کا پندار تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور یہی پنداران کو ہر چیز پر "عقلی" تنقید کرنے اور ہر اس چیز سے انکار کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ان کی "عقل" میں شمسائے مگر و تحقیق ان کا ذہن عقلیت ہی منحرف ہوتا ہے اور صحیح عقلی طریق پر کسی مسئلے کو سمجھانے یا کسی امر میں رائے قائم کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اس غیر معقول عقلیت کا انہماک سب سے زیادہ ان مسائل میں ہوتا ہے جو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہی وہ مسائل ہیں جن کے روحانی و اخلاقی اور اجتماعی و عمرانی مبادی مغرب کے نظریات سے ہر ہر نقطہ پر متصادم ہوتے ہیں۔

آپ کسی انگریزی تعلیم یافتہ شخص سے کسی مذہبی مسئلے پر گفتگو کیجیے اور اس کی ذہنی کیفیت کا پتہ لے لیں کیلیے پہلے اُس سے مسلمان ہونے کا اقرار کرا لیجیے، پھر اسکے سائن مجروح شریعت بیان کر کے سند پڑ کیجیے۔ وہ فوراً اپنی شانے ہلٹے گا اور بڑے عقل پرستانہ انداز میں کہے گا کہ "یہ قدامت ہے میرے سائن عقلی دلیل لاؤ، اگر تمہارے پاس معقولات نہیں صرف منقولات ہی منقولات ہیں تو میں تمہاری بات نہیں مان سکتا" بس انہی چند فقروں سے یہ راز فاش ہو جائے گا کہ اس شخص کو عقلیت کی ہوا بھی چھو کر نہیں گزری۔ اس غریب کو برسوں کی تعلیم اور تربیت علمی کے بعد اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ طلب حجت

کے عقلی لوازم کیا ہیں اور اطاعتِ حجت کی صحیح پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ اسلام کی نسبت سے عقلاً انسان کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں یا وہ مسلمان ہوگا یا کافر ہوگا۔ اگر مسلمان ہو تو مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کو خدا، اور رسول کو خدا کا رسول تسلیم کر چکا ہو اور یہ بھی اقرار کر چکا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کا رسول جو کچھ حکم پہنچائے گا اسکی اطاعت واجبہ چوں دچرا کرے گا۔ اب فرداً فرداً ایک ایک حکم پر حجت عقلی طلب کرنے کا اسے حق ہی نہیں ہا۔ مسلم ہونے کی حیثیت سے اس کا کام صرف یہ تحقیق کرنا ہو کہ کوئی خاص حکم رسول خدا نے دیا ہے یا نہیں جب حجت عقلی سے یہ امر ثابت کر دیا گیا تو اس کو فوراً اطاعت کرنی چاہیے وہ اپنے اطمینانِ قلب اور حصولِ بصیرت کیلئے حجت عقلی دریافت کر سکتا ہے مگر اس وقت جبکہ وہ اطاعتِ حکم کیلئے سر جھکا چکا ہو۔ اطاعت کیلئے حجت عقلی کو شرط قرار دینا، اور حجت نہ ملنے یا اطمینانِ قلب نہ ہونے پر اطاعت سے انکار کر دینا یہ معنی رکھتا ہو کہ وہ دراصل رسول خدا کی حاکمیت (انتھارٹی) کا انکار کر رہا ہو اور یہ انکار مستلزم کفر ہے حالانکہ ابتدا میں اس نے خود مسلم ہونے کا اقرار کیا تھا۔ اب اگر وہ کافر کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے صحیح جائے قیام دائرہ اسلام کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہے۔ سب سے پہلے اُس میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ جس مذہب پر درحقیقت وہ ایمان نہیں رکھتا اس سے نکل جائے اس کے بعد وہ اس لائق سمجھا جائے کہ حجت عقلی طلب کرے اور اس کی طلب کا جواب دیا جائے۔

یہ قاعدہ عقل سلیم کے حقیقتیات میں سے ہے اور دنیا میں کوئی نظم اور کوئی ضابطہ اس کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ کوئی حکومت ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتی جس کی رعایا کا ہر فرد اس کے ہر حکم پر حجت عقلی کا مطالبہ کرے اور حجت کے بغیر اطاعت امر سے انکار کر دے۔ کوئی فوج درحقیقت ایک فوج ہی نہیں ہو سکتی اگر اس کا ہر سپاہی اپنے جنرل کے ہر حکم کی وجہ دریافت کرے اور ہر معاملہ میں اپنے اطمینانِ قلب کو اطاعت کے لیے شرط قرار دے۔ کوئی مدرسہ کوئی کالج کوئی

انجن غرض کوئی اجتماعی نظام اس اصول پر نہیں بن سکتا کہ ہر ہر فرد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے اور جب تک ایک ایک شخص کو اطمینان حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک کسی حکم کی اطاعت نہ کی جائے انسان جب نظام میں بھی داخل ہوتا ہے اس ابتدائی اور بنیادی مفروضہ کے ساتھ داخل ہوتا ہے کہ وہ اس نظام کے اقتدارِ اعلیٰ پر کئی حیثیت سے اعتقاد رکھتا ہے اور اس کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے۔ اب جس وقت تک وہ اس نظام کا ایک جز ہے اس کا فرض ہو کہ اقتدارِ اعلیٰ کی اطاعت کئے خواہ کسی جزئی حکم پر اس کو اطمینان ہو یا نہ ہو۔ مجربانہ حیثیت سے کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا امرِ دیگر ہے ایک شخص جزئیات میں نافرمانی کر کے بھی ایک نظام میں شامل رہ سکتا ہے لیکن اگر کوئی شخص کھوٹے سے چھوٹے جزئیہ میں بھی نافرمانی کرے تو اطمینان کو اطاعت کیلئے شرط قرار دیتا ہے تو دراصل وہ اقتدارِ اعلیٰ کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور یہ صریح بنادت ہے حکومت میں یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا تو اس پر بنادت کا مقدمہ قائم کر دیا جائے گا۔ فوج میں اس کا کورٹ مارشل ہوگا۔ مدرسہ اور کالج میں فوری اخراج کی کارروائی کی جائے گی۔ مذہب میں اس پر کفر کا حکم جاری ہوگا۔ اس لیے کہ اس نوع کے طلبِ محبت کا حق کسی نظام کے اندر رہ کر کسی شخص کو نہیں دیا جاسکتا۔ ایسے طالبِ محبت کا صحیح مقام اندر نہیں باہر ہے۔ پہلے وہ باہر نکل جائے پھر جو چاہے اعتراض کرے۔

اسلام کی تنظیم میں یہ قاعدہ اصل اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ پہلے احکام نہیں دیتا بلکہ سب سے پہلے اللہ اور رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جتنی جتنیں ہیں سب اسی ایک چیز پر تمام کی گئی ہیں۔ عقلی دلیل اور فطری شہادت سے انسان کو اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدائے واحد ہی اس کا الٰہ ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔ آپ جس قدر عقلی جانچی پڑنا کرنا چاہتے ہیں اس بنیادی مسئلہ پر کر لیجیے۔ اگر کسی دلیل اور کسی محبت سے آپ کا دل اس پر مطمئن نہ ہو تو آپ کو داخلِ اسلام ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور نہ احکامِ اسلامی میں سے کوئی حکم آپ پر

جاری ہوگا لیکن جب آپ نے اس کو قبول کر لیا تو آپ کی حیثیت ایک مسلم کی ہو گئی اور مسلم کے معنی ہی مطیع کے ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں کہ اسلام کے ہر حکم پر آپ کے سامنے دلیل و حجت پیش کی جائے اور احکام کی اطاعت کرنے یا نہ کرنے کا انحصار آپ کے اطمینان قلب پر ہو مسلم بن جانے کے بعد آپ کا اولین فرض یہ ہو کہ جو حکم آپ کو خدا اور رسول کی طرف سے پہنچے بے چون و چرا اسکی اطاعت میں سر جھکا دیں۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا  
دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ  
أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (النور: ۴)

ایمان لانے والوں کا کام صرف یہ ہو کہ جب انکو اسرار رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے درمیان حکم کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ایمان اور ایسی طلب حجت جو تسلیم و اطاعت کیلئے شرط ہو باہم متناقض ہیں اور ان دونوں کا اجتماع صریح عقل سلیم کے خلاف ہی جو مومن ہے وہ اس حیثیت سے طالب حجت نہیں ہو سکتا، اور جو ایسا طالب حجت ہی وہ مومن نہیں ہو سکتا۔

وَمَا كَانَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَلَا لِلْمُؤْمِنَةِ إِذَا  
قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ  
لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الاحزاب: ۵)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اسکی رسول کسی امر کا فیصلہ کرنے تو ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

اسلام نے صلاح اور تنظیم کا جو عظیم الشان کام انجام دیا ہے وہ سب اسی قاعدہ کی وجہ سے ہے۔ دلوں میں ایمان بٹھانے کے بعد جس چیز سے روکا گیا تمام اہل ایمان اس سے رک گئے، اور جس چیز کو حکم دیا گیا وہ ایک شائے پر لاکھوں کروڑوں انسانوں میں رائج ہو گئی، اگر ایک ایک چیز کے لیے عقلی جھنجھٹیں پیش کرنا ضروری ہوتا اور ہر امر و نہی کی حکمتیں اور مصلحتیں سمجھانے پر طاعت احکام موقوف ہوتی تو قیامت تک انسانی افلاق کی وہ صلاح اور اعمال کی وہ تنظیم نہ ہو سکتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں انجام دے دی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام کے احکام خلاف عقل ہیں یا اس کا کوئی جزئی سے جزئی حکم حکمت و مصلحت سے خالی ہے۔ اسکے معنی یہ بھی نہیں کہ اسلام اپنے پیروں سے اندھوں کی سی تقلید چاہتا ہو اور احکام کی عقلی و فطری بنیادوں کو تلاش کرنے اور ان کے مصالح و حکم کو سمجھنے سے روکتا ہو حقیقت اسکے برعکس ہو۔ اسلام کی صحیح پیروی کے لیے تفقہ اور تدبیر ضروری ہے جو شخص احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کو بقینا زیادہ سمجھے گا وہ اتنا ہی زیادہ صحیح اتباع کر سکے گا۔ ایسے فہم اور ایسی بصیرت سے اسلام رکھتا نہیں بلکہ اُس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے لیکن زمین و آسمان کا فرق ہے ہن عقلی تجسس میں جو اطاعت کے بعد ہوا اور ہن عقلی امتحان میں جو اطاعت سے پہلے اور اطاعت کے لیے شرط ہو۔ مسلم سے پہلے غیر مشروط اطاعت کرتا ہو پھر احکام کی مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہو اور یہ ضروری نہیں کہ ہر حکم کی مصلحت اس کی سمجھ میں آجائے۔ بہکو تو دراصل خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر اطمینان کلی حاصل ہو۔ اس کے بعد وہ بصیرت نامہ حاصل کرنے کے لیے جزئیات پر مزید اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہو۔ اگر یہ اطمینان بھی حاصل ہو جائے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہو اور اگر حاصل نہ ہو تو اُس اطمینان کلی کی بنا پر جو اسے خدا اور رسول پر ہے بلا تامل احکام کی اطاعت کیے چلا جاتا ہو۔ اس قسم کی طلب حجت کو اس طلب حجت سے کیا نسبت جو ہر ہر قدم پر پیش کی جائے اور اس اجمہ کے ساتھ پیش کی جائے کہ اگر اطمینان کرتے ہو تو قدم اٹھاتا ہوں ورنہ پیچھے ہٹتا جاتا ہوں۔

حال میں ایک تحریر ہماری نظر سے گزری جو ایک "مسلم جماعت کی طرف سے شائع ہوئی ہو یہ جماعت اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ مذہب سے منحرف بھی نہیں۔ بلکہ اپنی دانست میں بڑی مذہبی خدمت انجام دے رہی ہے۔ مذہبی "اصلاح" کے نام سے جن امور کی تبلیغ وہ کرتی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر سال بقرعہ کے موقع پر مسلمانوں کو قربانی سے روکا جاتا ہے اور انہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ جو روپیہ وہ جانوروں کو ذبح کرنے پر صرف کرتے ہیں اسے قومی ادارات کی اعانت

میتوں اور بچوں کی پرورش اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے میں صرف کر سں پس تبلیغ پر کسی مسلمان نے اعتراض کیا جس کی پوری عبارت ہم تک نہیں پہنچی ہے مگر اس اعتراض کے جواب میں جو کچھ کہا گیا وہ یہ ہے کہ :-

”اُسے نقل و تقلید کے آج تک کسی صاحبِ قربانی کے عقلی و تجربی فوائد پر روشنی نہیں ڈالی..... اگر کوئی صاحب اس سے پہلے ہم کو اپنے عقیدہ قربانی کے عقلی پہلو سے آگاہ فرمائیں تو وہ ہمارے شکر کے مستحق ہوں گے“

یہ تحریر نمونہ ہے ان لوگوں کی دماغی حالت کا جو اپنے آپ کو ”تعلیم یافتہ“ کہتے ہیں۔ ایک طرف ”عقیدت“ کا اس قدر زبردست دعویٰ ہوا اور دوسری طرف ”غیر عقلیت“ کا ایسا شدید مظاہرہ ہے جس سے یہ دو فقرے جو قلم مبارک سے نکلے ہیں اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ اپنے اپنی صحیح حیثیت ہی متعین نہیں کی۔ اگر آپ مسلم کی حیثیت سے بول رہے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے نقل کے آگے سر جھکانا چاہیے پھر عقلی حجت کا مطالبہ کرنے کا حق آپ کو ہوگا، اور وہ بھی شرط اطاعت کے طور پر نہیں بلکہ محض اطمینان قلب کے لیے۔ اور اگر آپ اطاعت سے پہلے حجت عقلی کے طالب ہیں اور یہ شرط اطاعت ہی تو آپ کو ”مسلم“ کی حیثیت سے بولنے کا حق ہی نہیں، اس نوع کے طالب حجت کو پہلے ایک غیر مسلم کی حیثیت اختیار کرنی چاہیئے پھر اسکو یہ حق تو حاصل ہوگا کہ جس مسئلے پر چاہے اعتراض کرے، مگر یہ حق نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے کسی امر دینی میں منفی اسلام بن کر فتویٰ صادر کرے آپ ایک ہی وقت میں ان دونوں متضاد حیثیتوں کو اختیار کرتے ہیں اور ایک حیثیت کے بھی عقلی لوازم پورے نہیں کرتے۔ ایک طرف آپ نہ صرف ”مسلم“ بلکہ منفی اسلام بنتے ہیں۔ دوسری طرف آپ کا حال یہ ہو کہ نقل کو آپ بیچ سکتے ہیں حکم کا حکم ہونا آپ پر نقل کے ذریعہ سے ثابت کیا جاتا ہے تو آپ اسکی اطاعت انکار کر دیتے ہیں اور یہ شرط پیش فرماتے ہیں کہ پہلے اس حکم کے عقلی و تجربی فوائد پر روشنی ڈالی جائے، بالف ظاہر آپ کسی حکم کو محض حکم

حکم خدا و رسول بننے کی حیثیت ہی نہیں مانیں گے بلکہ اس کے عقلی و تجربی فوائد کی بنا پر مانیں گے۔ اگر ایسے فوائد معلوم نہ ہوں گے یا آپ کے معیار پر وہ فوائد ثابت نہ ہوں تو آپ حکم کو رد کر دیں گے اس کے خلاف پروپیگنڈا کریں گے، اسکو بے محل بتائیں، فتنوں بلکہ مضمر اور مسرفانہ رسم قرار دیں گے اور مسلمانوں کو اس کے اتباع سے روکنے میں اپنی قوت صرف کریں گے۔ کوئی عقل ہی جو اس تناقض طرز عمل اور متضاد حیثیات کے اختلاف کو جان نہ رکھتی ہی؟ حجت عقلی کا مطالبہ بجا و درست مگر پہلے یہ تو ثابت کیجیے کہ آپ ذوی العقول میں سے ہیں۔

”عقلی“ اور تجربی“ فائدہ کسی ایک مخصوص اور معین چیز کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک نسبی و اضافی چیز ہے۔ ایک شخص کی عقل ایک چیز کو مفید سمجھتی ہے دوسرے کی عقل اس کے خلاف حکم لگاتی ہے تیسرا شخص اس میں کسی نوع کا فائدہ تسلیم کرتا ہے مگر اسکو اہمیت نہیں دیتا اور ایک دوسری چیز کو اس سے زیادہ مفید ٹھہراتا ہے تجربی فوائد میں اس سے بھی زیادہ اختلاف کی گنجائش ہے۔ فائدے کے متعلق نہ شخص کا نظریہ الگ ہے اور اسی نظریہ کے لحاظ سے وہ اپنے یا دوسروں کے تجربات کو مرتب کر کے مفید یا غیر مفید ہونے کا حکم لگاتا ہے۔ ایک شخص نفع عاجل کا طالب ہے اور صرف ضرر عاجل کو قابلِ حذر سمجھتا ہے اس کا انتخاب ایسی شخص کے انتخاب سے یقیناً مختلف ہوگا جس کی نظر مالِ کار پر ہو۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں ایک نوع کا فائدہ اور دوسری نوع کی مضرت ہے۔ ایک شخص انکو اس لیے اختیار کرتا ہے کہ وہ فائدہ کی خاطر مضرت کو قبول کرنے کیلئے تیار ہے۔ دوسرا شخص ان سے اجتناب کرتا ہے۔ کیونکہ اسکی رائے میں انکی مضرت انکے فائدے سے زیادہ ہے۔ پھر عقلی اور تجربی فوائد میں بھی بسا اوقات تخالف پایا جاتا ہے۔ ایک چیز تجربی حیثیت سے مفید مگر عقل فیصلہ کرتی ہے کہ کسی بڑے عقلی فائدہ کیلئے اس مضرت کو برداشت کرنا چاہیے۔ ایک دوسری چیز ہے جو تجربی حیثیت سے مفید ہے مگر عقل یہ فتویٰ دیتی ہے کہ کسی عقلی مضرت سے بچنے کیلئے اس سے اجتناب کرنا چاہیے ایسا اختلافات کی وجہ

میں کسی چیز کے عقلی اور تجربی فوائد پر کوئی ایسی روشنی ڈالنی ممکن ہی نہیں جس سے تمام لوگ اسکے مفید ہونے پر متفق ہو جائیں اور انکار کی گنجائش ہی باقی نہ رہے محض ایک قربانی پر کیا موقوف ہو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور ادا و نواہی شریعت میں یہ کونسی چیز ایسی ہے جس کے عقلی اور تجربی فوائد پر ایسی روشنی ڈال دی گئی ہو کہ وہ کائنات میں فی النہایں نظر آنے لگے ہوں اور تمام لوگوں نے ان کو تسلیم کر کے ان کی پابندی اختیار کر لی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ایک شخص بھی دنیا میں تارک صوم و صلوٰۃ اور منکر حج و زکوٰۃ نہ ہوتا۔ اسی لیے اسلام نے اپنے احکام کو ہر شخص کی عقل اور تجربہ کے فتویٰ پر موقوف نہیں کیا بلکہ ایمان اور اطاعت کو اساس بنایا ہے۔ مسلم عقلی اور تجربی فوائد پر ایمان نہیں لاتا بلکہ خدا اور رسول پر ایمان لاتا ہے۔ اس کا مذہب یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کا فائدہ عقل و تجربہ سے ثابت ہو جائے تب وہ ہو قبول کرے اور کسی چیز کی مفرت عقلی و تجربی حیثیت سے مبرا بن ہو جائے تب وہ اس سے اقتنا ب کرے بلکہ اس کا مذہب یہ ہے کہ جو حکم خدا اور رسول سے ثابت ہو جائے وہ قابل اتباع ہے اور جو حکم ثابت نہ ہو وہ قابل اتباع نہیں۔

پس یہاں اصلی سوال یہی ہے کہ آپ کا ایمان عقل اور تجربہ پہ ہے یا خدا اور اس کے رسول پر؟ اگر پہلی بات ہو تو آپ کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ پھر آپ کو مسلمان بن کر گفتگو کرنے اور مسلمانوں کو "ارض غیر ذی زرع کی نام نہاد سنت" سے اقتنا ب کا مشورہ دینے کا کیا حق ہے؟ اور اگر دوسری بات ہے تو مدار بحث عقلی و تجربی فوائد نہ ہونے چاہئیں بلکہ یہ سوال ہونا چاہیے کہ آیا قربانی محض ایک رسم ہے جس کو مسلمانوں نے گھڑ لیا ہے یا ایک عبادت ہے جس کو اللہ نے پسند فرمایا اور اللہ کے رسول نے اپنی امت میں جاری کیا؟

(ترجمان القرآن - ربیع الاول ۱۳۵۵ھ جون ۱۹۳۶ء)

## تجدد کا پائے چوبیس

ماہ جون ۱۳۳۷ء کے "نگار" میں حضرت نیاز فتحپوری نے "ترجمان القرآن" پر ایک مفصل تبصرہ فرمایا ہے جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ اگرچہ عموماً رسائل و جرائد کے انتقادات پر بحث کرنے اور ان پر جوابی نقد کرنے کا دستور نہیں ہے لیکن چونکہ تاقدیر فضل نے اپنے تبصرہ میں بعض ایسی خیالات کا اظہار کیا ہے جو جان کے مذہب خیرہ کے مخصوص اصول و مبادی سے تعلق رکھتے ہیں اور جنکی اصلاح کے لئے ترجمان القرآن کے اولین مقاصد میں سے ہیں اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان پر اظہار خیال کے پہلے موقع سو فائدہ اٹھاؤں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"اس سلا کا مقصود اسکے نام سے ظاہر ہے یعنی مطالبہ آفاقی اور تعلیمات فرقانی کو اپنی صحیح روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا یقیناً اس مقصود کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن جیسا کہ خود فضل اویڑنے ظاہر کیا ہے عہد حاضر میں اس مدعا کی تکمیل آسان نہیں۔ عہد ماضی میں جب مذہب نام صرف اسلام پرستی و قدست پرستی کا تھا کسی شخص کا مہتمم یا مصلح بن جانا و شوارہ تھا لیکن اب جبکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے عمل و خیال کی بالکل نئی طرح ڈال کر حریت فکر و ضمیر کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے مذہب صرف اس میل کی بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے اسلاف کا طرز عمل بھی یہی تھا، اور وہ بھی وہی سوچتے تھے جواب بتایا جاتا ہے۔

"پہلے اگر خدا کی وحدانیت سے بحث کی جاتی تھی تو اب سرے سے خدا کا وجود ہی محل نظر بن گیا جاتا ہے۔ آگے پہلے ایک سول کی ہدایت اس کے معجزوں سے ثابت کی جاسکتی تھی تو اب علوم معاصرہ نے انہی معجزوں کی دلیل پر ہزاروں رسول و نبی پیدا کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ پہلے ایک اعظا آسمان

کی طرف دیکھ کر عرش و کرسی ٹلے نہ کو پکا رکھتا تھا، لیکن آج جبکہ آسمان ہی کوئی چیز نہیں رہا اس کا ایسا کرنا کسی طرح مفید یقین نہیں ہو سکتا۔ الغرض اب زمانہ یومنون بالنبیؐ کا نہیں بلکہ یومنون بالتجربۃ والشہود کا ہے اور ایسے نازک وقت میں کسی شخص کا مذہب کی حمایت کے لیے کھڑا ہو جانا آسان کام نہیں جبکہ خود نفس مذہبیت کا خیال بھی اپنی جگہ جذبات قابل قبول نہیں آگے چل کر وہ فرماتے ہیں :-

”قرآن پاک اپنے معنی کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہے۔ ایک وہ جس میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے، دوسرا وہ جس میں مختلف دانت پیش کیے گئے ہیں۔ اور تیسرا وہ جو قصص و تمثیلات پر مشتمل ہے جسداقل کے متعلق نہ زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و براہان کے لانے کی کیونکہ تعلیم اخلاق تمام مذاہب کی تقریباً یکساں ہے اور ہر شخص پر راستے پر مجبور ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں ہو۔ البتہ حصہ دوم اور حصہ سوم پر زیادہ توجہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حالیہ نے انہی دو حصوں کی طرف سے ریب و تذبذب کی کیفیت لوگوں کے دلیں میں پیدا کر دی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان شبہات کے دور کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اس صدی کا مجدد کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔“

اس لیے میں مشورہ دوں گا کہ ایک مستقل باب اس موضوع پر قائم کر کے تمام ان آیات قرآنی کا استقصاء کرنا چاہیے جو عقائد و قصص کے متعلق ہیں اور ان کا صحیح معنوم و مدعا متعین کر کے ان اعتراضات کو رفع کرنا چاہیے جو اس وقت اہل علم و تحقیق کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں۔“

آخر میں وہ لکھتے ہیں :-

”آئندہ کے لیے میں انکو دعوت دیتا ہوں کہ وہ سب سے پہلے وحی والہام کی حقیقت پر

گنہگارین کہ اسی کے سمجھنے پر کام آمد کی حقیقت کا سمجھنا منحصر ہے اور مسئلہ معاد کو لیں کہ اس کے حل ہونے پر پھر خداوند ہدایت، ولاہ ہدایت کلمہ ہے میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کلام الہی اور معاد کا کیا مفہوم متعین کتے ہیں۔ اس کے بعد میں اپنے شبہات و اعتراضات پیش کروں گا اور اگر ان کی کوشش سے وہ دور ہو گئے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کیونکہ ناچار مسلمان شوقی جنس میں بہت سے لوگ گرفت رہیں اس کا ایک بڑا سبب قیعدہ معاد بھی ہے۔

فاضل مبصر نے جن فرعی و جزئی مسائل کی طرف اشارات کیے ہیں ان کو چھوڑ کر میں صرف ان امور سے بحث کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق اصول سے ہے۔

انہوں نے قرآن مجید کے مباحث کی تقسیم تین حصوں پر کی ہے لیکن ہم آسانی ان کو صرف دو حصوں پر تقسیم کر سکتے ہیں ایک وہ حصہ جس کا تعلق ان امور سے ہے جو ہمارے علم کی حدود سے باہر ایمائے ادراک کی سرحد سے ماورا ہیں جن کے متعلق ہم قطعیت کے ساتھ صحیح یا غلط ہونے کا کوئی حکم نہیں لگا سکتے اور جن میں قرآن ہم کو ایمان بالغیب لانے کی دعوت دیتا ہے دوسرے وہ امور جو ہمارے دائرہ علم سے باہر نہیں ہیں اور جن میں قطعیت کے ساتھ کوئی حکم عقلی لگانا ہمارے لیے ممکن ہے پہلے حصہ میں وجود و صفات الہی، فرشتے، وحی و کتب آسمانی حقیقت نبوت، بحث بعد الموت، عذاب و ثواب آخرت اور ایسے دوسرے مسائل کے علاوہ وہ تمام ماورائے سرحد علم و ادراک باتیں بھی آجاتی ہیں جو قصص اور تمثیلات کے سلسلے میں وارد ہوتی ہیں عام اس سے کہ وہ بالذات عام انسانی ادراک کی سرحد سے ماورا ہوں یا اس بنا پر ایسی ہوں کہ سردست ہم جس مرتبہ عقلی و علمی میں ہیں اس میں ہم انکی سخت و صداقت کے متعلق کوئی حکم لگانے کے قابل نہیں ہیں دوسرے حصہ میں وہ تمام امور آجاتے ہیں جن کا تعلق اسلام کی تعلیم حکمت و تزکیہ نفوس اور تنظیم حیات انسانی کے اصول سے ہے۔

ناقد فاضل کی رائے میں دوسرے حصے سے بحث کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں کیونکہ اس بارے

میں جیسے اور مذاہب میں ڈیسا ہی اسلام بھی ہو۔ البتہ بحث صرف پہلے حصہ سے کی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ لوگوں میں ریب و تذبذب کی کیفیت انہی اُمور کے بارے میں پیدا ہو گئی ہے جو اس حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر یہ سوال کہ ان اُمور کے متعلق ریب و تذبذب کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ عہدِ ماضی میں توقافت پرستی اور جمالت کی وجہ سے لوگ غیب کی باتوں پر ایمان لے آتے تھے، لیکن اب علومِ جدیدہ اور اکتشافاتِ حاضرہ نے عملِ خیال کی بالکل نئی طرح ڈال کر حریتِ فکر و ضمیر کی دولت سے دماغوں کو لالہ مال کر دیلے۔ اس لیے اب "یومنون بالغیب" کا زمانہ نہیں رہا، بلکہ "یومنون بالتجربہ و الشہود" کا زمانہ ہے۔

اس لئے کی بنیاد چند غلطیوں پر ہے جن میں سے پہلی غلطی گزشتہ اور موجودہ زمانہ کے حقیقی فرق کو نہ سمجھنا ہو۔ قسمتی سے تمہا حضرت نیاز ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا کردہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مذہب کی شمع صرف گزشتہ زمانے کی تاریکی میں ہی جل سکتی تھی، علومِ جدیدہ کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد اس کا روشن ہونا مشکل ہے۔ حالانکہ علومِ عقلیہ جن کو یہ لوگ روشنی سے تعبیر کرتے ہیں کچھ اس زمانے کی مخصوص متاع نہیں ہیں، گزشتہ زمانے میں بھی ان علوم کی روشنی نے آنکھوں کو اسی طرح خیرہ کیا ہے اور گزشتہ زمانے میں بھی جن لوگوں کی آنکھیں اُن سے خیرہ ہوئی ہیں انہوں نے یہی سمجھا ہی کہ مذہب کی شمع اب روشن نہیں رہ سکتی جو علوم اُس زمانے کے "علومِ جدیدہ" اور اکتشافاتِ اس زمانے کے اکتشافاتِ حاضرہ تھو، وہ اُن کے ذہن میں عملِ خیال کی بالکل نئی طرحیں ڈال چکے تھے اور انہوں نے حریتِ فکر و ضمیر کی دولت سے دماغوں کو ایسا مال لالہ کیا تھا کہ ان کے روشن زمانہ میں "یومنون بالغیب" کی گنجائش ہی نہ تھی۔ کیا بالکل یہی حالت دوسری صدیِ ہجری سے چوتھی صدی تک نہیں گزری ہو؟ افلاطون، ارسطو، اپیکوریس، زینو، تھالس، اسکندر، افروسی، فلاطینوس اور دوسرے علمائے فلسفہ و حکمت کے خیالات جب اسلامی مالک میں شائع ہوئے اور انکی بدولت فلسفیانہ تفکر اور عقلی اجتہاد کا ایک نیا دور شروع ہوا تو کیا

اس وقت بھی ایک گروہ نے بالکل یہی نہ سمجھا تھا جو اب ایک گروہ سمجھ رہا ہے؟ کیا اس زمانہ کی حریت فکر و ضمیر اور عمل و خیال کی نئی طرح نے اسی طرح لوگوں کو مذہبی معتقدات کی طرف سے ریب و شک میں ڈال دیا تھا؟ مگر کچھ کیا ہوا؟ فلاسفہ کے وہ بہت سی نظری و قیاسی مسائل جن پر اس وقت کے لوگ ایمان لے آئے تھے بعد میں غلط ثابت ہوئے۔ وہ آفتابِ علم جس کے سامنے ان لوگوں کو مذہب کی شمع ٹھٹھاتی نظر آ رہی تھی زمانہ کی ایک ہی گردش میں بے نور ہو کر رہ گیا۔ ان کے "علوم جدیدہ" فرسودہ ہو گئے۔ ان کے "اکتشافاتِ حاضرہ" میں "عمل و خیال کی نئی طرحیں" ڈالنے کی قوت باقی نہ رہی اور جو طرحیں انہوں نے ڈالی تھیں وہ سب پرانی ہو گئیں جتنی کہ اپنے زمانہ کے اکتشافات پر کامل یقین (ذوِ امان) رکھتے ہوئے انہوں نے جو عقلی استدلالات کیے تھے اور ان پر جن مذاہبِ حکمت کی بنیاد رکھی تھی ان میں سے اکثر کو آج ایک معمولی طالب علم بھی لغو و محل قرار دینے میں تامل نہیں کرتا۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ گذشتہ زمانہ کی تاریکی میں مذہب کی شمع جل سکتی تھی مگر اب اس روشنی کے زمانے میں نہیں جل سکتی، تو ہمیں بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے جو چیزوں کو آج "علوم جدیدہ" اور اکتشافاتِ حاضرہ کہہ رہی دعوے کیے جا رہے ہیں جو پہلے کیے گئے تھے ان کے مغلوں بھی ہم کو یقین ہے کہ ان میں سے بیشتر کا وہی حشر ہوتا ہے جو گذشتہ لوگوں کے "علوم جدیدہ" اور اکتشافاتِ حاضرہ کا ہو چکا ہے اور عمل و خیال کی نئی طرحیں بھی زمانہ کی گردش کے ساتھ پرانی اور فرسودہ ہو جانے والی ہیں آپ ان تمام علوم و اکتشافات پر ایک نائر نظر ڈالیے جو آپ کا سرمایہٴ فخر و ناز ہیں اور خود ان لوگوں سے جو ان علوم و اکتشافات کے اصلی محقق اور کشف ہیں دریافت کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ گذشتہ علوم کی طرح ان میں بھی ایسے یقینات بہت کم ہیں جن کے متعلق اعتماد کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہو کہ ان کے غلط ثابت ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے باقی جتنی چیزیں ہیں سب غلطون، قیاسات، نظریات، ارضیات اور تدبیرات ہیں جو متعلق یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی کی جانب زیادہ ماقدم جتنا جتنا آئے بڑھتا جاتا

یہ علوم جدیدہ اور یہ اکتشافاتِ حاضرہ قدامت کا لباس عاری نہ ہوتے جائیں گے اور عمل و خیال کی نئی طرحیں جو ان ناپائدار علوم و اکتشافات کے بھروسہ پر پڑی ہیں کچھ دوسری نئی طرحوں کے لینے جگہ خالی کرتی چلی جائیں گی۔

پس جب حال یہ ہو تو ایک ہوشمند اور بالغ النظر آدمی کے لئے اس خیال سے ہیبت زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب علوم جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ نے عمل و خیال کی نئی طرحیں ڈال دی ہیں اور حریتِ فکر و ضمیر کی دولت سودا مغول کو مال کر دیا ہے، لہذا اب خدا جانے مذہب کیا حشر ہو۔ وہ تو ان علوم و اکتشافات پر ایک تحقیقی نظر ڈال کر یہ دیکھے گا کہ ان میں جو چیزیں مذہب سے متصادم ہو رہی ہیں وہ یقینی بھی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ فی الواقع یقینینیات ہوں اور مذہب کے حقیقی معتقدات سے متصادم بھی ہوں تو بلاشبہ اس کے لیے یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ مذہب پر ایمان لائے یا ان یقینی نتائجِ تحقیق پر؟ لیکن اگر محض قیاسات و نظریات ہوں یا محض شک و تذبذب میں ڈالنے والی چیزیں ہوں تو وہ ان کے اور مذہب کے تضادم سے ہرگز نہ گھبرائے گا۔ کیونکہ مذہب کی بنیاد اگر یقین و اذعان پر ہے تو یقین ڈال دینا ان کے مقابلہ میں ظن و قیاس اور شک و تذبذب کو ہرگز کوئی ترجیح حاصل نہیں۔ اور اگر مذہب کوئی ظنی و قیاسی چیز ہے تو اسی ظن و قیاس پر توجہ جدید علمی نظریات کی بنیاد بھی ہے۔ پھر دونوں میں وجہ ترجیح کیا چیز ہے؟

علوم جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ سے مرعوب ہو کر مذہب کی طرف ایک ترمیم طلب نگاہ ڈالنا تو صرف ان لوگوں کا شیوہ ہی جن کے دل میں یہ تخیل گھر کر گیا ہے کہ ہر نئی چیز علم و اکتشافات ہی اور نہ اس کے ساتھ دینے کیلئے اس کو قبول کر لینا یا اس پر ایمان لے آنا ضروری ہے خواہ اسکی حیثیت محض قیاسی و نظری ہی ہو اور خواہ اسکو انہوں نے گہری علمی بصیرت کے ساتھ نقد و تصحیح کی کسوٹی پر پرکھا بھی نہ ہو۔ لیکن یہ لوگوں میں "عمل و خیال کی نئی طرحیں" ڈالنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ بھی نہیں جانتے کہ عمل و خیال کی نئی طرحیں کیوں کر پڑتی ہیں اور کونسی طرحیں عاقلانہ ہوتی ہیں اور کونسی محض طفلانہ اسی طرح

حریت فکر و ضمیر کی دولت سے مالا مال ہونے کا ادعا بھی ایسے ہی سطحی النظر لوگوں کا طرہ امتیاز بنا ہوا ہے۔ مگر انہیں معلوم نہیں کہ مجرد حریت فکر و ضمیر ایک فتنہ اور ایک خطرناک حالت ہے اگر اس کے ساتھ ایک وسیع اور خفیہ علم ایک عمیق اور بالغ نظر، ایک توازن اور صحیح اعتدال کا داغ نہ ہو اور یہ وہ چیز ہے جس کو عطا کرنے میں قدرت نے اتنی فیاضی ہو کام نہیں لیا ہے۔ حتیٰ آج کل فرض کر لی گئی ہے۔

دوسرا نظریہ جو اسی پہلے نظریہ سے نکلا ہے یہ ہے کہ اب زمانہ یونمون بالغیب "کما نہیں" بلکہ "یونمون" بالترتیب والشہود کا ہی میں بہت غور کرنے کے بعد بھی نہیں سمجھ سکا کہ ان الفاظ سے قائل کا حقیقی مقصود کیا ہے۔ اگر تصدیق یہ ہے کہ اس زمانہ میں کوئی ایسی بات تسلیم نہیں کی جاتی جس پر غیب کا اطلاق ہوتا ہو اور جس کا تجربہ یا مشاہدہ نہ کیا گیا ہو تو یہ بالکل غلط ہے۔ ایسا کہنے کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہو گا کہ اس زمانہ کے لوگوں نے صرف اسی حد کے اندر محدود رہنا قبول کر لیا ہے جس میں ان کا تجربہ و مشاہدہ ان کے لئے وسیلہ الکتاب علم بن سکتا ہے اور جس میں ان کے حواس کام نہیں کر سکتے ہیں۔ اور اس دائرے سے باہر جتنے امور ہیں ان کے بارے میں فکر کرنا اور قیاس و استقراء سے ان کے متعلق حکم لگانا انسان نے چھوڑ دیا ہے مگر کوئی شخص جس نے علوم جدیدہ و کشفیات حاضرہ کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے اس بیان کو تسلیم نہ کرے گا۔ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کو چھوڑ دینے کی بحث تمام تر امور غیبیہ ہی۔ خود سائنس اور اس کے علوم طبیعیہ کو لے لیجئے جن کے اعتماد پر آپ ایمان بالترتیب والشہود کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس فن کا کونسا شعبہ ایسا ہے جس کی تحقیقات کا مدار قوت اترجی قانون فطرت، مادہ، رشتہ، علت و معلول اور ایسے ہی دوسرے امور کے افراد اثبات پر نہیں ہے؟ کونسا عالم طبیعیات ایسا ہے جو ان چیزوں پر ایمان نہیں رکھتا؟ مگر کسی پر سے بڑے حکیم سے جا کر پوچھیے کہ ان میں سے کس کی حقیقت وہ جانتا ہے؟ کس کی کہ نہ اس کے حواس پہنچ سکتے ہیں؟ کس کے نفس و جو کا تجربہ و مشاہدہ اس نے کر لیا ہے؟ اور کس کے سوجھ بوجھ کا یقینی ثبوت وہ پیش کر سکتا ہے؟ پھر یہ غیب پر ایمان نہیں تو کیا ہے؟

ان الفاظ کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف ہی بات مانی جاتی ہے جس کا تمام انسانوں نے تجربہ و مشاہدہ کیا ہو اور جو نوع انسانی کے تمام افراد کے لیے شہود و حضور کا مرتبہ رکھتی ہو۔ لیکن ایسی بات جو کسی مرد و عاقل کی زبان سے نہیں نکل سکتی اس لئے کہ یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ تمام انسانی معلومات تمام افراد انسانی کو فرداً فرداً حاصل نہیں ہیں بلکہ ان کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس میں خصوصی معلومات اور مخصوص افراد کو اختصاص کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ ان خصوصی معلومات کا ہر شعبہ صرف اپنے مختص عالموں کے لئے حاضر اور باقی تمام انسانوں کیلئے غائب و قیام ہے اور جوہر کو اس شخص کا اُس جماعت پر ایمان بالغیب لانا پڑتا ہے جو اس شعبہ کا عالم ہو۔

تیسرا مفہوم اس قضیہ کلیہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کا ہر شخص صرف ہی بات مانتا ہے جو اس کے ذاتی تجربے یا مشاہدے میں آئی ہو اور ایسی ہی بات کو نہیں مانتا جو خود اس کے لیے غیب کا حکم کرتی ہو۔ لیکن یہ ایسی بات ہو کہ اس سے زیادہ حمل کوئی بات انسانی دماغ سے نکل نہیں سکتی۔ اس صفت کا کوئی آدمی نہ کبھی پایا گیا ہے نہ آج پایا جاتا ہے نہ قیامت تک اس کے پائے جانے کی امید ہے۔ اور اگر فی الواقع کہیں موجود ہو تو اس کی نشان دہی کرنے میں ہرگز تامل نہ کرنا چاہئے کیونکہ اکتشافات حاضریہ میں یہ اکتشاف سب سے زیادہ اہم ہو گا! غرض آپ خواہ کسی پہلو سے اس فقرہ کو دیکھیں اس میں کوئی صداقت آپ کو نظر نہ آئے گی خود تجربہ و مشاہدہ ہی اس پر گواہ ہے کہ یہ زمانہ بھی اسی طرح یومنون بالغیب کا ہے جس طرح گذشتہ زمانہ تھا اور ایمان بالغیب جس چیز کا نام ہے اس سے انسان کو نہ کبھی چھٹکارا ملا ہے نہ مل سکتا ہے ہر شخص اپنی زندگی کے ۹۹ فی ہزار بلکہ اس سے زیادہ معاملات میں ایمان بالغیب کا تلبہ اور لٹنے پر مجبور ہے۔ اگر وہ یہ عہد کرے کہ صرف اپنے تجربہ و مشاہدہ پر ہی ایمان لائیکا تو اس کو معلومات کا وہ تمام ذخیرہ اپنے دماغ سے خارج کر دینا پڑے جسے دوسرے پر اعتماد کر کے اُس نے مقام علم دلقین میں جگہ دی ہے، اکتسابِ علم کے اُن تمام ذرائع کا مطالعہ کر دینا پڑے جو خود اس کے اپنے تجربہ و مشاہدہ سے ماسوی ہیں اور یہ ایسی حالت ہو گی جس میں وہ زندہ ہی

نہ رہ سکے گا کجا کہ دنیا کا کوئی کام کر سکے پس ایمان بالغیب کی کلی نفی اور ایمان بالغیب تہ والشہود کا کلی اثبات نہ اس زمانہ میں ممکن ہو اور نہ اس سے بھی روشن کسی اور زمانہ میں ہونے کی توقع ہے لاحالہ ہر زمانے اور ہر حالت میں انسان مجبور ہے کہ اپنی ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے بغیر بہت سی باتیں محض دوسروں کے اعتماد پر مان لے کچھ باتیں اس کو خبر متواتر کی بنا پر ماننی پڑتی ہیں جیسے یہ کہ ٹکلیا کھانے سے آدمی مر جاتا ہے درانحالیکہ ہر شخص نے نہ خود ٹکلیا کھا کر اس کا تجربہ کیا نہ کسی کو کھا کر مرتے ہوئے دیکھا کچھ باتوں کو ایک یا چند معتبر آدمیوں کی روایت سے مان لینا پڑتا ہی جیسے عدالتوں کا شہادت پر اعتماد، اگر وہ ایسا نہ کریں تو قانون کی مشین ایک لمحہ کیلیے بھی حرکت نہ کر سکے کچھ باتیں صرف اس بنا پر تسلیم کر لینی پڑتی ہیں کہ ان کو ایک ماہر فن کہہ رہا ہے۔ یہاں لیت ہر درسد اور ہر کالج میں ہر طالب علم پر گزرتی ہے اگر وہ اپنے فن کے اکابر علماء و ماہرین کی تحقیقات اور ان کے اکتشافات و نظریات پر ایمان بالغیب لائے تو علم کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ کبھی ترقی کر کے اس مقام تک پہنچ سکتا ہی جہاں وہ خود ان علماء و ماہرین کی طرح حقایق علیہ کی تحقیق کرنے کے قابل ہو۔

اس سے ثابت ہوا کہ ہم ان تمام معاملات میں دوسروں پر ایمان بالغیب لاتے ہیں اور لانا ہی مجبور ہیں جن میں ہم نے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے اکتساب علم نہیں کیا ہو اور دوسرے لوگوں نے کیا ہو اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہو اور اسی پر فیصلہ کا انحصار ہے کہ کس معاملہ میں کس پر ایمان بالغیب لانا چاہئے؟ اصولاً یہ بات ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ ایسے ہر معاملہ میں صرف اس شخص یا جماعت پر ایمان لانا چاہئے جس کے متعلق ہم کو یہ اطمینان ہو کہ اسے اس معاملہ کا بہتر علم حاصل ہو اور اس کے پاس اس کے جاننے کے بہتر ذرائع موجود ہیں۔ اسی قاعدہ کلیہ کے تحت ایک مریض ڈاکٹر کو چھوڑ کر وکیل سے مشورہ نہیں کرتا، اور ایک اہل مقدمہ وکیل کو چھوڑ کر ججینس کے پاس نہیں جاتا، لیکن الدنیا و روحانیت کے مسائل میں یہ اختلاف واقع ہوتا ہے کہ آیا ان میں علماء فلسفہ و ماہرین علوم عقلیہ کی رائے تسلیم کی جائے یا عالم انسانی کے مذہبی روحانی

پیشواؤں کی؟ خدا اور طاغوت کی وحی والہام روح اور حیات بعد الموت عذاب ثواب آخرت اور ایسے ہی دوسرے امور غیب میں کانٹا اسپنسر آئن ٹسٹاٹن اور برگساں جیسے لوگوں کی بات مانی جائے یا ابراہیم اور موسیٰ عیسیٰ اور محمد علیہم السلام جیسے بزرگوں کی؟ حریت فکر و ضمیر کے معیوں کا رجحان پہلے گروہ کی جانب ہو اور وہ انہی کی دنیا کی ہوئی کسوٹی پر گروہ بسیار کی باتوں کو کس کر دیکھتے ہیں جو باتیں اس کسوٹی پر کھری نکلتی ہیں نہیں مان لیتے ہیں اس لیے نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے کسی ہیں بلکہ اس لیے کہ حکماء فلاسفہ نے ان کو شرف قبول عطا کیا ہو (اور قسمتی سے اسی باتیں بہت ہی کم بلکہ بالکل نہیں ہیں) اور جو باتیں اس کسوٹی پر کھوٹی نکلتی ہیں انکو وہ غیر معتبر قرار دے کر رو کر دیتے ہیں۔ برعکس اس کے قدماست پرستوں اور اسلاف پرستوں کا مسلک یہ ہے کہ نہ طبیعیات و عقلیات کی باتیں الہیات روحانیات والوں سے پوچھو اور نہ اس کے برعکس الہیات روحانیات کی باتیں عقلیات و طبیعیات والوں سے و دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں اور ایک علم میں دوسرے علم کے ماہر کی رائے دریافت کرنا پہلی اور بنیادی غلطی ہے حکماء و فلاسفہ اپنے عقلی علوم میں خواہ کتنی ہی عقلی بصیرت رکھتے ہوں لیکن علوم الہیہ میں ان کا مرتبہ ایک عامی سے زیادہ نہیں ہو اور وہ ان کے متعلق معلومات کے اتنے ہی ذرائع رکھتے ہیں جتنے ہر معمولی انسان رکھتا ہے۔ یہ علوم مخصوص ہیں بسیار علیہم السلام کے ساتھ دینی ان کے ماہر ہیں اور انہی کے پاس ان کے جاننے کے اصلی ذرائع ہیں اس لیے ان کے مسائل میں انہی پر ایمان بالغیب لانا چاہیے۔ آپ کے نئی بحث و کلام کی گنجائش اگر ہے تو وہ صرف اس امر میں ہے کہ آیا فی الواقع وہ سچے اور علوم الہیہ میں صاحب بصیرت تاملہ ہیں یا نہیں مگر جب یہ بات ثابت ہو جائے یا ثابت کر دی جائے کہ فی الحقیقت وہ ایسے ہیں تو پھر جو باتیں اپنی بصیرت اور اپنے علم کی بنا پر انہوں نے بیان کی ہیں وہ سب آپ کو ماننی پڑیں گی۔ ان سے انکار کرنا اور ان کے خلاف دلیل و حجت لانا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے ایک اندھا مورتی کے وجود سے انکار کر دے اور آنکھوں ملے کو جھٹلانے کے جی و جوہ شمس کے متنازع پر دلیل پیش کرے۔ ایسا شخص

اپنے زعم میں خواہ کتنا ہی بڑا فلسفی ہو، مگر جو اپنی آنکھوں سے سورج کو دیکھ رہا ہے وہ اس نابینا کے متعلق جو کچھ ملے قائم کرے گا اس کے بیان کی حاجت نہیں۔

آپ کہیں گے کہ انبیاء علیہم السلام نے امور غیب کے متعلق جو کچھ کہا ہی سکی تاہم جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ سے نہیں ہوتی، اس لیے لوگ ریب و تذبذب میں مبتلا اور ناچار مسلمان شو کی لعنت میں گرفتار ہو گئے ہیں مگر میں کہوں گا کہ ان علوم و اکتشافات میں وہ کون سے یقینیات ہیں جو اصول اسلام ٹکراتے ہیں؟ اگر میں تو انہیں پیش فرمائیے تاکہ ہم بھی غور کریں کہ آیا قرآن کو مانیں یا علوم جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ کو اور اگر نہیں ہیں اور ہرگز نہیں ہیں جیسا کہ خود آپ کے الفاظ ”ریب و تذبذب“ اور ”ناچار مسلمان شو“ سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر کیا علوم جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ کے اسلحہ خانے میں صرف ظنیات و قیاسات ہی وہ ہتھیار ہیں جن کے بل پر وہ مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہے ہیں اور جن کی کاٹ نہیں جھنچک دیکھ کر آج کل کے اربابِ حریت و فکر و ضمیر یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ مذہب ان کا نام سننے ہی ہم جاکا اور میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا؟ آپ ان علوم و اکتشافات کو خواہ کتنی ہی اہمیت دیں مگر یاد رکھیے کہ امور غیب میں وہ ہرگز مفید یقین نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کا یہ اثر ہو سکتا ہے کہ آپ ”ریب و تذبذب“ میں پڑ جائیں اور کہیں کہ ہم وحی و الہام، نبوت، بعد الموت، عذاب، ثواب، آخرت، فرشتوں کے وجود اور خود خدا کے وجود کے متعلق نفی یا اثبات کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کو ”ناچار مسلمان شو کی لعنت سے نکلنے اور کافروانی شدگی برکت سے مالا مال ہونے میں یہ علوم کچھ بھی مدد دے سکیں کیونکہ امور مذکورہ بالا سے قطعی انکار کر دینے کے لیے یہ علوم کوئی حجت فراہم نہیں کرتے اور کسی چیز کے عدم حکم لگانے کے لیے صرف اتنی حجت کافی نہیں ہے کہ اس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں پس ”ریب و تذبذب“ کا مقام وہ آخری مقام ہے جہاں آپ کے علوم جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ آپ کو بے جا کر ٹھیرا دیتے ہیں مگر عقلی و ذہنی حیثیت سے یہ ایک بدترین مقام ہے۔ جو علوم انسان کو یقین نہ بخش سکیں بجائے

ایک ایسے مقام پر متعلق چھوڑ دیں جہاں اس کو کوئی چلنے قرار نہ ملتی ہو جو اسے "کافر" نہ ماننا چاہا۔  
شو کی دلدل میں لے جا کر پھنسا دیں وہ یقیناً اہل سے بدتر ہیں۔

اس شکل سے اگر کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے تو وہ مرثا ایمان بالغیب ہے۔ ایک فوج آپ نے  
ایک شخص کو نبی مان لیا اور یہ سمجھ لیا کہ وہ علوم الہیہ میں کامل بصیرت رکھتا ہے اور یہ تسلیم کر لیا کہ وہ ہرگز  
جھوٹ نہیں بولتا، تو پھر آپ کے لیے اموغیب میں کسی تذبذب ریب کی گنجائش نہیں رہتی، اور آپ کا  
اعتقاد یقیناً اذعان کی ایک ایسی مضبوط بنیاد پر قائم ہو جاتا ہے جسے کسی علم جدید و الکشاف حاضر اور  
عمل و خیال کی کسی نئی طرح اور حریت فکر و ضمیر کی کسی گرم بازاری سے کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہی  
وجہ ہے کہ قرآن میں صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے متقین کیلئے اور متقین کی پہلی  
صفت یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (البقرہ - ۱)  
اسی ایمان بالغیب پر تذبذب کی پوری عمارت قائم ہے۔ اگر آپ نے اس اصل الاصول کو منہدم کر دیا تو پھر  
تذبذب کے ان بنیادی معتقدات کے متعلق جن کی حقیقت معلوم کرنے کا خود آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں  
ہے، آپ کسی ایسی رائے پر نہیں پہنچ سکتے جس کی صحت کا خود آپ کو یقین ہو اور جس کی صداقت کا  
آپ دوسروں کو یقین دلا سکیں۔

اب آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایک شخص کے متعلق یہ دریافت کرنے کا کونسا ذریعہ ہے کہ  
وہ نبی ہے اس کو علوم الہیہ میں کامل بصیرت حاصل ہے اور وہ اس مرتبہ کا صادق انسان ہے کہ اگر  
وہ امور غیب کے متعلق ہم کو ایسی باتیں سنائے جو ہماری عقل سے ماوراء اور ہمارے دائرہ علم سے باہر ہو  
تب بھی ہم اس کی بات پر ایمان لے آئیں اور یقین کے ساتھ کہہ سکیں کہ وہ ہرگز جھوٹا نہیں ہے؟ اس  
سوال کا تصفیہ منہصر ہے دو چیزوں پر۔ ایک یہ کہ ہم اس شخص کی ذاتی سیرت کو اس سخت سے سخت  
معیار پر جانچ کر دیکھیں جس پر کسی انسان کی سیرت جانچی جاسکتی ہے دوسرے یہ کہ ہم اس کی پیش کی ہوئی

باتوں پر نگاہ ڈالیں جو ہمارے دائرہ علم سے باہر نہیں ہیں اور جن میں قطعیت کے ساتھ ایک حکم عقلی لگا ہوا ہے یو ممکن ہے جب ان دونوں امتیازوں سے یہ ثابت ہوجائے کہ وہ اپنے صادق القول معنی میں مثالی ہے اور اسکے ساتھ زندگی کے تمام علی اور فکری شعبوں میں خیر و صلاح و حکمت کی ایسی کمال تعلیم دیتا ہے جس میں انسانی عقل کہیں سو کوئی عیب نہیں نکال سکتی، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسکو سچا نہ مانیں اور یہ بدگمانی کریں کہ اس نے کسی علم و واقفیت کے بغیر محض دنیا کو دھوکہ دینے کیلئے خدا اور فرشتوں اور عرش و کرسی اور وحی والہام اور بہشت و جنت اور دوزخ و جنت کا اتنا بڑا فریب لگھ کر رکھ دیا ہے۔

پس حضرت نیاز کی تیسری غلطی یہ ہے کہ وہ قرآن کے پہلے حصہ کو جسے ہم نے اپنی تقسیم میں دوسرا حصہ قرار دیا ہے قابل بحث نہیں سمجھتے اور مزید برآں یہ خیال کرتے ہیں کہ اس معاملہ میں تمام مذاہب تقریباً یکساں ہیں اور مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں ہے۔ برعکس اس کے ہم کہتے ہیں کہ انکی تعلیم کے مطابق قرآن کے دوسرے اور تیسرے حصے (یا باقی تقسیم کے مطابق پہلے حصے) کی صداقت کا فیصلہ منحصر ہی اس پر ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور قرآن مجید کے ان تمام حصول کی ناقذانہ چھان بین کریں جن کا تعلق امور غیبیہ نہیں ہے اور صرف اسی پر اکتفا نہ کریں کہ اسلام کی تعلیم کا یہ حصہ دوسرے مذاہب سے مختلف یا فروتر نہیں ہے بلکہ بدلائل یہ ثابت کریں کہ وہ تمام ان مذاہب سے جو غیر اسلام ہیں اعلیٰ و ارفع و اجل ہی جب تک بحث کا یہ مرحلہ طے نہ ہو جائے دوسرے مرحلے (یعنی امور غیبیہ کی بحث) میں قدم رکھنا اصولاً غلط ہے اور اس کے تصفیہ کے بغیر ان کا تصفیہ ممکن نہیں ہے۔ حضرت نیاز چاہتے ہیں کہ ہم معاد اور کلام الہی اور ان آیات سے بحث کریں جو عقائد اور قصص تعلق رکھتی ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس بحث کے دو پہلو ہیں اور وہ دو گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں ایک گروہ وہ ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور اس بنا پر ان میں شک کرتا ہے دوسرا گروہ وہ ہے جو آپ کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے مگر امور غیبیہ میں اس کو شکوک و شبہات

ان دونوں گروہوں سے بحث کرنے کے طریقے مختلف ہیں اور جب تک: بن معلوم نہ ہو کہ معترض کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے اس وقت تک ہم اس سے بحث نہیں کر سکتے۔

پہلے گروہ سے معاد اور کلام الہی اور دوسرے امور غیب پر بحث کرنا بالکل بے نتیجہ ہے کیونکہ اصل میں خلاف رہتی ہوئی فروع پر بحث کر کے نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہیں ہے ہم معاد اور کلام الہی حتیٰ کہ خود وجود و صفات الہی کے متعلق بھی جن باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اُن پر ہمارا ایمان یقین اس بنا پر نہیں ہے کہ ہماری اپنی عقلی تحقیق یا ہمارے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ نے اُن کے متعلق ہم کو کوئی ایسا قطعی اور یقینی علم بخشا ہو جس کے خلاف پر کوئی دلیل عقلی قائم نہ کی جاسکتی ہو اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ نبوت کی بحث سے بے نیاز ہو کر ان مسائل سے بحث کی جاسکتی تھی لیکن ان امور پر ہمارے قطعی ایمان اذعان کی بنیاد و اصل اس اعتقاد پر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق القول ہیں اور اپنی رسالت اور قرآن کے کلام الہی ہونے کے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا ہو وہ بالکل صحیح ہے اسی اصل سے یہ بات متفرع ہوتی ہو کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے منکر سے ہم اس بنیادی مسئلہ کو تسلیم نہ کرالیں گے اس وقت تک کسی فروعی مسئلہ سے بحث ہی نہ کریں گے۔

رہا دوسرا گروہ تو اس کے اس حق کو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو تسلیم بھی کئے اور پھر امور غیب پر اس جتنے کلام بھی کہے کہ قرآن میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ پیش کیا غلطی سے مبرا ہے۔ البتہ وہ اس پر وہ پہلوؤں سے کلام کر سکتا ہے ایک یہ کہ آیانی الواقع قرآن میں ایسا اور ایسا ارشاد ہوا ہے یا نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اور ایسا فرمایا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ قرآن اور سنت میں جو کچھ فی الواقع ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ آخر میں ایک بات مجھے در عرض کرنی ہے حضرت نیاز نے لئے دی ہے کہ ترجمان القرآن میں

ایک باب المناظرہ کھولا جائے اور ارادہ ظاہر فرمائیے کہ وہ اپنے شہادت و اعتراضات بھی پیش کریں گے۔ جہاں تک اصطلاحی مناظرہ کا تعلق ہے میں نے ہمیشہ اس سے دامن بچا یا ہے اور اب بھی بچانا چاہتا ہوں کیونکہ ایسی بحث کا میں ہرگز قائل نہیں ہوں جس کا مقصد محض دماغی ورزش یا عقلی کشتی ہو۔ رہا علمی مناظرہ جس کا مقصد حقائق و تحقیق ہو اور جس میں فریقین میں دلی خواہش کے ساتھ شریک ہوں کہ جو کچھ ان کے نزدیک حق ہے اس کا اظہار کریں گے اور جو کچھ حق ثابت ہو جائے گا اس کو تسلیم کر لیں گے تو اس کے لیے میں ہر وقت آمادہ ہوں نگار میں جن شہادت و اعتراضات کو پیش کیا جائے گا وہ بجنہ "ترجمان القرآن" میں نقل کیے جائیں گے اور پھر جواب دیا جائے گا۔ اسی طرح امید ہے کہ "ترجمان القرآن" کے جواب پر اگر حضرت نیاز کوئی تفتیہ فرمائیں گے تو اصل جواب بھی اس کے ساتھ نقل فرمائیں گے تاکہ دونوں رسالوں کے ناظرین بحث کے دونوں پہلوؤں سے واقف ہوں اور خود بھی کوئی رائے قائم کر سکیں صرف ایک پہلو پیش کرنا اور دوسرے پہلو کو پیش کرنے سے احتراز کرنا میرے نزدیک خود اپنی کمزوری کا اعتراف ہے +

(ترجمان القرآن، ربیع الاول ۱۳۵۲ھ، جولائی ۱۹۳۱ء)

(نوٹ:- یہ امر ناظرین کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا کہ اس مضمون کے جواب میں "ترجمان القرآن" کا تبادلاً جزیئرہ "نکار" سے بند ہو گیا اور آج تک بند ہے کچھ لوگ ہمارے نیم پختہ نوجوانوں کو چند ظاہر فریب باتوں سے بہکانے کا کام تو خوب کر لیتے ہیں مگر علمی طریقہ پر باقاعدہ اور اصولی بحث کا جب موقع آتا ہے تو ان کا پائے چوبیس میں سخت بے تمکین ثابت ہوتا ہے۔)

## ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی نقص

مسلم یونیورسٹی کورٹ نے اپنے گزشتہ سالانہ اجلاس (منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء) میں ایک ایسے اہم مسئلہ کی طرف توجہ کی ہے جو ایک عرصہ سے توجہ کا محتاج تھا یعنی دینیات اور علوم اسلامیہ کا نقص طرز تعلیم کی اصلاح اور یونیورسٹی کے طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی ضرورت جہاں تک جدید علوم و فنون اور ادبیات کی تعلیم کا تعلق ہے حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں اس کا بہتر سے بہتر انتظام موجود ہے کم از کم اتنا ہی بہتر جتنا خود ملی گڑھ میں ہے محض اس غرض کے لیے مسلمانوں کو اپنی ایک الگ یونیورسٹی قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ایک مستقل قومی یونیورسٹی قائم کرنے کا تخیل جن بنا پر مسلمانوں میں پیدا ہوا اور جس بنا پر اس تخیل کو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ صرف یہ ہے کہ مسلمان جدید علوم سے استفادہ کرنے کے ساتھ مسلمان بھی رہنا چاہتے ہیں۔ یہ غرض سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں پوری نہیں ہوتی اسی کے لیے مسلمانوں کو اپنی ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت ہے اگر ان کی اپنی یونیورسٹی بھی یہ غرض پوری نہ کرے اگر وہ اسے بھی ویسے ہی گزبھوٹ نکلیں جیسے سرکاری یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں اگر وہاں بھی محض "دیسی صاحب لوگ" یا ہندی وطن پرست یا اشتراکی ملاحدہ پیدا ہوں تو لاکھوں روپیہ کے صرف سے ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور چلانے کی کوئی خاص ضرورت ہے؟

یہ ایسا سوال تھا جس پر ابتدا ہی میں کافی توجہ کرنے کی ضرورت تھی جب تک یونیورسٹی قائم کی جا رہی تھی اس وقت سے پہلے اسی بات پر غور کرنا چاہیے تھا کہ ہم کو ایک عیسوی یونیورسٹی کی کیا ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کی کیا سبیل ہے مگر کسی نقاد نے آج کل کے مسلمانوں کی تعریف میں شاید

سچ ہی کہہ کر یہ کام پھیل گئے ہیں اور سوچتے بعد میں ہیں جن لوگوں کو یونیورسٹی بنانے کی دھن تھی انہیں بس یونیورسٹی ہی بنانے کی دھن تھی اس کا کوئی نقشہ ان کے ذہن میں نہ تھا۔ یہ سوال سرے سے پیش نظر ہی نہ تھا کہ ایک مسلم یونیورسٹی کیسی ہونی چاہئے اور کن خصوصیات کی بنا پر کسی یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی کہا جاسکتا ہے۔ اس عمل کا فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بس دیسی ہی ایک یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی قائم ہو گئی جیسی ایک آگرہ میں اور دوسری کھنویں اور تمیری ڈھاکہ میں ہے۔ لفظ مسلم کی رعایت سے کچھ دینیات کا حصہ بھی لٹا۔ میں شریک کر دیا گیا تاکہ جب کوئی دریافت کئے کہ اس یونیورسٹی کے نام میں لفظ مسلم کیوں لکھا گیا ہے تو اس کے سامنے قدوری اور منیلہ الصلتی اور ہدایہ بطور سند اسلامیّت پیش کر دی جائیں۔ مگر حقیقت یونیورسٹی کی تاسیس و تشکیل میں کوئی ایسی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی جس کی بنا پر وہ دوسری سرکاری یونیورسٹیوں سے ممتاز ہو کر حقیقی معنوں میں ایک اسلامی یونیورسٹی ہوتی۔

ممکن ہے کہ ابتدا میں تعمیہ کے شوق اور جوش نے صحیح اور مناسب نقشہ پر غور کرنے کی مہلت نہ دی ہو۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یونیورسٹی قائم ہوتے پندرہ سال ہو گئے اور اس دوران میں ہمارے تعلیمی ناخداؤں نے ایک مرتبہ بھی محسوس نہیں کیا کہ ان کی اصلی منزل مقصود کیا تھی اور ان کا راہ روپست بمنزل جا کھر رہا ہے۔ ابتداء سے حالات صاف بتا رہے ہیں کہ یہ درگاہ نہ اس ڈھنگ پر چل رہی ہے جس پر ایک اسلامی درگاہ کو چلنا چاہئے اور نہ وہ نتائج پیدا کر رہی ہے جو دراصل مطلوب تھے۔ اس کے طلبہ اور ایک سرکاری یونیورسٹی کے طلبہ میں کوئی فرق نہیں اسلامی کیے کٹر اسلامی اسپرٹ اسلامی طرز عمل مفقود ہے۔ اسلامی فکر اور اسلامی ذہنیت ناپید ہے۔ ایسے طلبہ کی تعداد شاید ایک فی صدی بھی نہیں جو اس یونیورسٹی سے ایک مسلمان کی سی نظر اور مسلمان کا سا نصب العین لے کر نکلے ہوں اور جن میں یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت نے یہ قابلیت پیدا کی ہو کہ اپنے علم اور اپنے قوائے عقلیت سے کام لے کر ملت اسلامیہ میں زندگی کی کوئی نئی روح چھونک دیتے، یا کم از کم اپنی قوم کی کوئی قابل ذکر علمی و عملی خدمت ہی انجام دیتے، نتائج کی نوعیت اگر محض سلبی

ہی رہتی تب بھی بسا فہمیت ہوتا مگر افسوس یہ ہے کہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور زیر تعلیم طلبہ میں ایک بڑی تعداد ایسے نوجوانوں کی پائی جاتی ہے جن کا وجود اسلام اور اسلامی تہذیب اور مسلمان قوم کے لیے نفع نہیں بلکہ الٹا نقصان ہے۔ یہ لوگ روح اسلامی کا آئینہ ہی نہیں بلکہ اس قطعاً مسخورت ہو چکے ہیں۔ ان میں مذہب کی طرف سے صرف سرومہری ہی نہیں بلکہ نفرت سی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچہ ایسا بنادیا گیا ہے کہ وہ تشکیک کی حد سے گذر کر انکار کے مقام پر پہنچ گئے ہیں اور ان اصول اولیہ کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔

حال میں خود مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نوجوانوں میں ایک صاحب جو محض اپنی سلامتِ طبع کی وجہ سے مرتد ہوتے ہوتے رہ گئے، اپنے ایک ایسٹ خط میں ہاں کے حالات کی طرف چند ضمنی اشارات کئے ہیں۔ یہ خط اشاعت کے لئے نہیں ہے اور نہ خصوصیت کے ساتھ علی گڑھ کی کیفیت بیان کرنے کے لئے لکھا گیا ہے اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یونیورسٹی کی باطنی کیفیت کا نہایت صحیح مرقع ہے صاحب خط نے خود اپنے ذہنی ارتقاء کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :-

”علی گڑھ میں مجھے اسلامی دنیا کے خارجی فتنے یعنی تفریح کی آخری تفریق تزلزلہ یعنی کمیونزم سے دوچار ہونا پڑا۔ میں پہلے مغربیت کو کوئی خطرناک چیز نہ سمجھتا تھا۔ لیکن علی گڑھ کے تجربات نے مجھے یہ روشناس کرا دیا۔ اسلامی ہند کے اس مرکز میں ایک خاص نداد ایسے افراد کی موجود ہے جو اسلام مرتد ہو کر کمیونزم کے پرچم میں مبلغ بن گئے ہیں۔ اس جماعت میں اساتذہ میں سے کافی لوگ شامل ہیں۔ اور یہ اساتذہ تمام ذہین اور ذکی نووارد طلبہ کو اپنے جال میں پھلانتے ہیں۔ ان لوگوں نے کمیونزم کو اس لیے اختیار نہیں کیا کہ وہ غریبوں اور کسانوں اور مزدوروں کی حمایت اور امداد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کی علمی مسرت نہ زندگیوں ان کی بناوٹی باتوں پر پانی پھیروتی ہیں۔ بلکہ انہوں نے اسے اس لیے اختیار کیا ہے کہ وہ ایک عالمگیر تحریک کے سایہ میں اپنی اخلاقی

کمزوریوں اور اپنے طحانہ رجحانات طبع اور اپنی (lose - thinking) کو (Justify) کر لیں کیونکہ ہم نے پہلے مجھے بھی دھوکہ دیا میں نے خیال کیا کہ یہ اسلام ہی کا ایک Unauthorised edition ہے لیکن غور مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام کے اؤ

اس کے بنیادی نصب العین میں زمین و آسمان کا فرق ہے :

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت صرف ناقص ہی نہیں ہے بلکہ اُن مقاصد کے بالکل برعکس نتائج پیدا کر رہی ہے جن کے لیے سید احمد خاں اور محسن الملک اور وقار الملک وغیرہم نے ایک مسلم یونیورسٹی کی ضرورت ظاہر کی تھی اور جن کے لیے مسلمانوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر جوش و خروش کے ساتھ اس درس گاہ کی تعمیر کا خیر مقدم کیا تھا ۔

آپ اس انجینئر کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جس کی بنائی ہوئی موٹر آگے چلنے کے بجائے پیچھے دوڑتی ہو؟ اور وہ انجینئر آپ کی نگاہ میں کیسا ماہر فن ہو گا جو اپنی بنائی ہوئی موٹر کو مسلسل اوپر پیہم الٹی حرکت کرتے دیکھتا ہے اور پھر بھی محسوس نہ کرے کہ اس کے نقشے میں کوئی خرابی ہے، غالباً ان صفات کا کوئی میکانیکل انجینئر تو آپ کو نہ مل سکے گا لیکن آپ کی قوم کے تعلیمی انجینئر جس درجہ کے ماہر فن ہیں اس کا اندازہ آپ اس امر واقعہ سے کر لیجئے کہ وہ ایک تعلیمی مشین بنانے بیٹھے تھے جس کو اسلامی نصب العین کی جانب حرکت دینا مقصود تھا، مگر جو مشین انہوں نے بنائی وہ بالکل جانب مخالفت میں حرکت کرنے لگی اور مسلسل پندرہ سال تک حرکت کرتی رہی اور ایک دن بھی اُن کو محسوس نہ ہوا کہ اُن کے نقشہ تعمیر میں کیا غلطی ہے بلکہ کوئی غلطی ہے بھی یا نہیں ۔

بعد از خرابی بسیار اب یونیورسٹی کورٹ کو یاد آیا ہے کہ :-

”مسلم یونیورسٹی کے مقاصد اولیہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں اسلامی روح

پیدا کرے“

اور اس غرض کے لیے اس نے سات اشخاص کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے کہ :-

”تمام صورت حال کا جائزہ لے اور دینیات و علوم اسلامیہ کی تعلیم کے لیے ایسے جدید اور ترقی یافتہ ذرائع اختیار کرنے کی سفارش کرے جو ضروریاتِ زمانہ سے مناسبت رکھتے ہوں اور جن سے اسلامی تعلیمات کو زیادہ اطمینان بخش طریق پر پیش کیا جاسکے“

بڑی خوشی کی بات ہے۔ نہایت مبارک بات ہے۔ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔ اگر اب بھی ہمارے تعلیمی انجینئروں نے محسوس کر لیا ہو کہ ان کی تعلیمی مشین غلط نقشہ پر بنی ہے اور اپنے مقصد ایجاد کے خلاف اس کے چلنے کی اصلی وجہ محض نجات و اتفاق نہیں بلکہ نقشہٴ تباہی و تخریب کی خرابی ہے تو ہم خوشی کے ساتھ یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ مضیٰ ماضیٰ، آؤ، اب اپنے پچھلے نقشے کی غلطیوں کو سمجھ لو اور ایک صحیح نقشہ پر اس مشین کو مرتب کرو۔ لیکن ہمیں شبہ ہے کہ اب بھی اپنی غلطی کا کوئی صحیح احساس ان حضرات میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ ابھی تک وہ اس امر کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان کے نقشے میں کوئی بنیادی خرابی ہے محض نتائج کی خوفناک ظاہری صورت ہی سے وہ متاثر ہوئے ہیں اور بالکل سطحی نگاہ سے حالات کو دیکھ رہے ہیں۔

خدا کرے کہ ہمارا یہ شبہ غلط ہو مگر پچھلے تجربات ہم کو ایسا ہی شبہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

پچھلی صدی کے وسط میں جب دو صدیوں کا پیہم انحطاط ایک خوفناک سیاسی انقلاب پر منہمی ہوا تھا، اس وقت مسلمانوں کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو سنبھالنے کے لئے پردہٴ غیب سے چند ناخدا پیدا ہو گئے تھے۔ وہ وقت زیادہ غور و غوض کا نہ تھا۔ یہ سوچنے کی ہمت ہی کہاں تھی کہ اس سکتہ جہاز کے بجائے ایک نیا اور پاؤں دار جہاز کس نقشہ پر بنایا جائے۔ اس وقت تو صرف یہ سوال درپیش تھا کہ یہ قوم جو ڈوب رہی ہے اس کو ہلاکت سے کیونکر بچایا جائے۔ ناخداؤں میں سے ایک گروہ نے فوراً

اپنے اُسے پرانے جہاز کی مرمت شروع کر دی، انہی پائے تختوں کو جوڑا، ان کے زخموں کو بھرا اور پٹے ہوئے بادبانوں کو نوکر کے جیسے تیسے بن پڑا ہوا بھرنے کے قابل بنالیا۔ دوسرے گروہ نے لپک کر ایک نیا ڈھانی جہاز کرایہ پر لے لیا اور ڈوبنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس پر سوار کرادیا۔ اس طریقے سے دونوں گروہ اس اچانک مصیبت کو ٹالنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر یہ دونوں تدبیریں صرف اس حیثیت سے کامیاب تھیں کہ انہوں نے فوری ضرورت کے لحاظ سے پارہ سازی کر دی اور ڈوبتوں کو ہلاکت سے بچالیا۔ ان میں سخت اور دانشمندی جو کچھ بھی تھی، صرف اسی حد تک تھی۔ اب جو لوگ اس ڈنکے ٹل جانے کے بعد بھی انہی دونوں تدبیروں کو ٹھیک ٹھیک انہی دونوں شکلوں پر باقی رکھنا چاہتے ہیں ان کا طرز عمل حکمت و دانش کے خلاف ہے۔ نہ تو پرانا بادبان یا جہاز اس قابل ہے کہ مسلمان صرف اُسی پر بیٹھ کر ان قوموں سے مسابقت کر سکیں جن کے پاس اس سے ہزار گنی زیادہ تیز رفتار سے چلنے والے کھدار جہاز ہیں۔ نہ کرایہ پر لیا ہوا ڈھانی جہاز اس لائق ہے کہ مسلمان اس کے ذریعہ سے اپنی منزل مقصود کو پہنچ سکیں، کیونکہ اس کا ساز و سامان تو ضرور نیا ہے اور اس کی رفتار بھی تیز ہے اور کھدار بھی ہے، مگر وہ دوسروں کا جہاز ہے، اس کا ڈیڑاٹن انہی کے مقاصد اور انہی کی ضروریات کے لیے موزون ہے اور اس کے رہنما اور ناخدا بھی وہی ہیں، لہذا اس جہاز سے ہم کبھی یہ امید نہیں کر سکتے کہ ہمیں اپنی منزل مقصود کی طرف لے جائے گا، بلکہ اس کی تیز رفتاری سے الٹا خطرہ یہ ہے کہ وہ ہمیں زیادہ سرعت کے ساتھ مخالف سمت پر لے جائے گا، اور وزیرِ وقت ہمیں اپنی منزل مقصود سے دور کرتا چلا جائے گا۔ فوری ضرورت کے وقت تو وہ لوگ بھی حق بجانب تھے جنہوں نے پرانے جہاز کی مرمت کی، اور وہ بھی غلطی پر نہ تھے جنہوں نے کرایہ کے جہاز پر سوار ہو کر جان کا پانی گرا بھری غلطی پر ہیں جو پرانے جہاز میں ڈٹے بیٹھے ہیں، اور وہ بھی غلطی پر ہیں جو اسی کرایہ کے جہاز پر جے ہوئے ہیں۔

اسی رہنما اور حقیقی مصلح کی تعریف یہ ہے کہ وہ اجتہاد و فکر سے کام لیتا ہے اور وقت اور موقع کے

لحاظ سے جو مناسب ترین تدبیر ہوتی ہے اسے اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس کا ابتلع کرتے ہیں وہ اندر سے مقلد بنتے ہیں جس طریقہ کو اس نے وقت کے لحاظ سے اختیار کیا تھا، اسی طریقہ پر یہ اُس وقت کے گزرنے کے بعد بھی آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں، اور اتنا نہیں سوچتے کہ ماضی میں جو نسب تھا حال میں ہی غیر النسب ہے، پچھلی صدی کے رہنماؤں کے بعد ان کے متبعین آج بھی اسی روش پر اصرار کر رہے ہیں جس پر ان کے رہنما انہیں چھوڑ گئے تھے، حالانکہ وہ وقت جس کے لیے انہوں نے وہ روش اختیار کی تھی، گزر چکا ہے اب اجتہاد و فکر سے کام لے کر نیا طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

بدقسمتی سے ہم کو دو دنوں گروہوں میں ایک بھی مجتہد نظر نہیں آتا۔ انتہائی جرأت کر کے پلنے جہاز والوں میں سے کوئی اگر اجتہاد کرتا ہے تو بس اتنا کہ اپنے اسی پلنے جہاز میں چند بجلی کے بلب لگاتا ہے، کچھ نئے طرز کا فرنیچر ہیا کر لیتا ہے، اور ایک چھوٹی سی دفاعی کل خرید لیتا ہے جس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ دُور سے سیٹی بجا بجا کر لوگوں کو یہ دھوکا دیتی رہے کہ یہ پُرانا جہاز اب نیا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے جہاز ڈالے اگرچہ دُوسروں کے جہاز پر بیٹھے ہیں اور تیزی کے ساتھ سمت مخالف پر بہہ چلے جا رہے ہیں مگر دو چار پرانے بادبان بھی لے کر بیسویں صدی کے اس آپ ٹوڈیٹ جہاز میں لگائے ہوئے ہیں تاکہ خود اپنے نفس کو اور مسلمانوں کو یہ دھوکا دے سکیں کہ یہ جہاز بھی اسلامی جہاز ہے اور لندن کے سترہ سے سچ کنبہ کو چلا جا رہا ہے۔

اندھی تقلید اور اس کے ساتھ اجتہاد کی یہ جھوٹی نمائش تائبگے؟ ایک طوفان گزر گیا۔ اب دُوسرا طوفان بہت قریب ہے، ہندوستان میں ایک دُوسرے سیاسی انقلاب کی بنا پڑ رہی ہے۔ ممالک عالم میں ایک اور بڑے انقلاب کے سامان ہو رہے ہیں جو بہت ممکن ہے کہ ہندوستان میں متوقع انقلاب کے بجائے ایک بالکل غیر متوقع اور ہزار درجہ زیادہ خطرناک انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آنے والے انقلابات شہر کے ہنگامے کی نسبت اپنی نوعیت اور اپنی شدت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اس وقت مسلمانوں

کی اعتقادی و ایمانی اور اخلاقی و عملی حالت جیسی کچھ ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم نہیں سمجھتے کہ وہ ان آنے والے طوفانوں کی ایک ٹیکر بھی خیر تیکے ساتھ سہ سکیں گے۔ ان کا پُرانا جہاز دور جدید کے کسی ہولناک طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا شاید ایک ہی تھپیڑے میں اس کے تختے بکھر جائیں اور اس کے بادبانوں کا تارتا الگ ہو جائے۔ رہا ان کا کرایہ کا جہاز تو وہ پُرانے جہاز سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جو لوگ اس پر سوار ہیں ہمیں خوف ہے کہ طوفانی دور کا پہلا ہی تھپیڑا ان کو ملت اسلامیہ سے جدا کر کے شاید ہمیشہ کے لیے ضلالت کے قعرِ عمیق میں لے جائے گا لَاقَدْ دَلَّ اللہُ پَس اب یہی وقت ہے کہ مسلمان اپنے جہاز سے بھی بھٹیں اور کرایہ کے جہاز سے بھی اتار دیں اور خود اپنا ایک جہاز بنائیں جس کے آلات اور کل پر نئے جدید ترین ہوں مشین موجودہ دور کے تیز سے تیز جہاز کے برابر ہو مگر نقشہ ٹھیکہ اسلامی جہاز کا ہو اور اس کے انجنیئر اور کپتان اور دیدبان سب اہل ہوں جو مٹرل کنبہ کی راہ و رسم سے باخبر ہوں۔

استعارہ کی زبان چھوڑ کر اب ہم کچھ صاف صاف کہیں گے۔ سر سید احمد خاں (رحمۃ اللہ علیہ) کی قیادت میں علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اٹھی تھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دور کی ضروریات کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں تعلیم جدید سے بہرہ مند ہو کر اپنی معاشی اور سیاسی حیثیت کو تباہی سے بچالیں اور ملک کے جدید نظم و نسق سے استفادہ کرنے میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہ جائیں اُس وقت اس سے زیادہ کچھ کہنے کا شاید موقع نہ تھا۔ اگرچہ اس تحریک میں فوائد کے ساتھ نقصانات اور خطرات بھی تھے مگر اس وقت اتنی جلد نہ تھی کہ غور و فکر کے بعد کوئی ایسی حکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی نہ اس وقت ایسے اسباب موجود تھے کہ اس نوع کی تعلیمی پالیسی کے مطابق عمل درآمد کیا جاسکتا۔ لہذا وقتی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو اسی طرز تعلیم کی طرف دھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا، اور خطرات سے بچنے کے لیے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔

یہ صرف ایک وقتی تدبیر تھی جو ایک آفتِ ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری طریق پر اختیار کر لی گئی تھی اب وہ وقت گزر چکا ہے جس میں فوری تدبیر کی ضرورت تھی۔ وہ فائدہ بھی حاصل ہو چکا ہے جو اس تدبیر سے حاصل کرنا مقصود تھا۔ اور وہ خطرات بھی واقف کی صورت میں نمایاں ہو چکے ہیں جو اس وقت صرف موبہم تھے اس تحریک نے ایک حد تک ہماری دنیا تو ضرور بنیادی، مگر حتمی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔ اس نے ہم میں کلمے فرنگی پیدا کیے۔ اس نے ہم میں "انیکلو محمدن" اور "انیکلو انڈین" پیدا کیے اور وہ بھی ایسے جن کے نفسیات میں محمدن اور انڈین کا تناسب بس بٹے نام ہی ہے۔ اس نے ہماری قوم کے طبقہ علیا اور طبقہ متوسط کو جو دو اصل قوم کے اعضاء تھے ریہہ میں باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ صرف اتنے معاوضے پر کہ چند عہدے چند خطاب چند کوساں آئے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمان سے ملنے جلتے ہوں یہ حال یہ ہے کہ کیا اب اُنہا ہماری یہی تعلیمی پالیسی رہنی چاہئے؟ اگر یہی ہماری اُمی پالیسی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ ہندوستان کے ہر رٹے مقام پر ایک علی گڑھ موجود ہے جہاں سے دھڑا دھڑا "انیکلو محمدن" اور "انیکلو انڈین" نکل رہے ہیں۔ پھر یہ بس بھری فصل کاٹنے کے لیے ہم کو اپنا ایک متعل فرارہ رکھنے کی حاجت ہی کیا ہے؟ اور اگر حقیقت اس حالت کو بدلنا مقصود ہے تو ذرا ایک حکیم کی نظر سے دیکھیے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور اس کو دور کرنے کی صحیح صورت کیا ہے۔

جدید تعلیم و تہذیب کے مزاج اور اس کی طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ اگر ہم اس کو جس نہی کے کراچی نوخیز نسلوں میں پھیلا دیں گے تو ان کو ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے کھودیں گے۔ آپ ان کو وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو ان

ہول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمران سے کبیر مختلف ہے۔ آپ ان کی تربیت تمام ایسی تہذیب کے زیر اثر کرتے ہیں جو اپنی رُوح اور اپنے مقاصد اور اپنے منہاج کے اعتبار سے کلینتہ اسلامی تہذیب کی ضد واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد کس بنا پر آپ امید رکھتے ہیں کہ ان کے اندر اسلامی نظر ہوگی؟ ان کی سیرت اسلامی سیرت ہوگی؟ ان کی زندگی اسلامی زندگی ہوگی؟ قدیم طرز پر قرآن و حدیث و فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے۔ اس قسم کے عمل تقسیم سے کوئی ٹھوگلا پھل حاصل نہ ہوگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے رنگی اسٹیم میں پائے با دو بان محض نمائش کے لیے لگا دی جائیں مگر ان با دو بانوں سے رنگی اسٹیم قیامت تک اسلامی اسٹیم نہ بنے گا۔

اگر فی الواقع علی گڑھ یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی بنانا ہے تو سب سے پہلے مغربی علوم و فنون کی تعلیم پر نظر ثانی کیجئے ان علوم کو جو ان کا توں لینا ہی درست نہیں ہے۔ طالب علموں کی لوح سادہ پر ان کا نقشہ اس طرح قلم رسم ہوتا ہے کہ وہ ہر مغربی چیز پر ایمان لاتے چلے جاتے ہیں تنقید کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی اور اگر پیدا بھی ہوتی ہے تو فی ہزار ایک طالب علم میں ذرا بے تحاشی ہونے کے بعد سالہا سال کے گہرے مطالعے کے بعد وہ زندگی کے آخری مرحلوں میں پہنچ جاتا ہے اور کسی عملی کام کے قابل نہیں رہتا۔ اس طرز تعلیم کو بدنام چاہئے۔ تمام مغربی علوم کو طلبہ کے سامنے تنقید کے ساتھ پیش کیجئے اور تنقید فارص اسلامی نظر سے ہوتا کہ وہ ہر ہر قدم پر ان کے ناقص اجزاء کو چھوڑتے جائیں اور صرف کارآمد حصوں کو اپنے چلنے پھرنے کے ساتھ علوم اسلامیہ کو بھی قدیم کتابوں سے جو ان کا توں نیچے بلکہ ان میں سے متاخرین کی آمیزشوں کو الگ کر کے اسلام کے دائمی اصول و حقیقی اعتقادات اور غیر متبدل قوانین لیجئے۔ ان کی اصلی اسپرٹ و ولوں میں اتاریے اور ان کا صحیح تدبیر دانوں میں پیدا کیجئے۔ اس نوحہ کے لیے آپ کو بنانا یا نصاب کمیشن ملے گا۔ ہر چیز از سر نو بنانی ہوگی۔ قرآن اور سنت رسول کی تعلیم سب پر مقدم بنے مگر تفسیر و حدیث کے پائے ذخیروں سے نہیں۔ ان کے پڑھانے والے ایسے ہوتے چاہئیں جو قرآن اور سنت کے مغز کو

پاچھ ہوں۔ اسلامی قانون کی تعلیم بھی ضروری ہے، مگر یہاں بھی پرانی کتابیں کام نہ دیں گی۔ آپ کو معاشرت کی تعلیم میں اسلامی نظم معیشت کے اصول، قانون کی تعلیم میں اسلامی قانون کے مبادی، فلسفہ کی تعلیم میں اسلامیہ کے نظریات، تاریخ کی تعلیم میں اسلامی فلسفہ تاریخ کے حقائق، اور اسی طرح ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلامی عنصر کو ایک غالب اور حکمران عنصر کی حیثیت سے داخل کرنا ہوگا۔

اچھے تعلیمی سہاٹ میں جو ملاحدہ اور متفرق بنجین بھر گئے ہیں ان کو نصرت کیجئے خوش قسمتی سے ہندوستان میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو چکی ہے جو علوم جدیدہ میں بصیرت رکھنے کے ساتھ دل و دماغ اور نظرو فکر کے اعتبار سے پورے مسلمان ہیں۔ ان کو بھرے ہوئے جواہر کو جمع کیجئے تاکہ وہ جدید آلات سے اسلامی نقشہ پر ایک اسٹیمر بنائیں۔

آپ کہیں گے کہ انگریز ایسی تعمیر کی اجازت نہ دے گا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر آپ اس سے پوچھئے کہ تو پورے مسلمان اور پورے کمیونسٹ میں سے کس کو زیادہ پسند کرتا ہے؟ ان دونوں میں سے ایک کو بہر حال تجھے قبول کرنا ہوگا۔ ۱۹۱۰ء کا انینکلو محمدان مسلمان اب زیادہ مدت تک نہیں پایا جاسکتا۔ اب اگر تو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو پورا کمیونسٹ دیکھنا چاہتا ہے تو اپنی قدیم اسلام دشمنی پر جبارہ۔ نتیجہ خود تیرے سامنے آجائے گا۔ اور اگر یہ منظور نہیں تو نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں کمیونزم کی بھتی ہوئی وبا کا مقابلہ صحیح نسب سائنڈول اور ریڈیو کے دیہاتی پروگرام سے نہیں کیا جاسکتا۔ اس وبا کو صرف ایک طاقت روک سکتی ہے اور وہ اسلام کی طاقت ہے +

(ترجمان اہلسنن - جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ اگست ۱۹۳۵ء)

## ملت کی تعمیر نو کا صحیح طریقہ

اصلاح اور انقلاب دونوں کا مقصد کسی بگڑی ہوئی حالت کا بدلنا ہوتا ہے لیکن دونوں کے محرکات اور طریق کار میں اساسی فرق ہوا کرتا ہے۔ اصلاح کی ابتدا غور و فکر سے ہوتی ہے، ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچ بچار کے انسان حالات کا جائزہ لیتا ہے، خرابی کے اسباب پر غور کرتا ہے، خرابی کے حدود کی پیمائش کرتا ہے، اس کے ازالہ کی تدبیریں دریافت کرتا ہے، اور اس کو دُور کرنے کے لیے صرف اسی حد تک تجزیہ ہی قوت استعمال کرتا ہے جس حد تک اس کا استعمال ناگزیر ہو۔ بخلاف اس کے انقلاب کی ابتدا غیظ و غضب اور جوش و خروش کی گرمی سے ہوتی ہے، خرابی کے جواب میں ایک دُوسری خرابی دیتا کی جاتی ہے جس سے اعتدالی سے بگاڑ پیدا ہوا تھا اس کا مقابلہ ایک دُوسری بے اعتدالی سے کیا جاتا ہے جو برائیوں کے ساتھ اچھائیوں کو بھی غارت کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات ایک اصلاح پسند کو بھی وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو ایک انقلاب پسند کرتا ہے۔ دونوں نشتر لے کر جسم کے مافوق حصہ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ اصلاح پسند پہلے اندازہ کر لیتا ہے کہ خرابی کہاں ہے اور کتنی ہے۔ پھر نشتر کو اسی حد تک استعمال کرتا ہے جس حد تک خرابی کو دُور کرنے کے لیے ضروری ہے اور نشتر کے ساتھ ساتھ مرہم بھی تیار رکھتا ہے لیکن انقلاب پسند اپنے جوش و غضب میں آنکھیں بند کر کے نشتر چلاتا ہے، اچھے بُرے کا امتیاز کئے بغیر کاٹتا چلا جاتا ہے اور مرہم کا خیال اس کے ذہن میں اگر آتا بھی ہے تو اس وقت جب خوب قطع و برید کر لینے اور جسم کے ایک اچھے حصے کو غارت کر چکنے کے بعد اسے اپنی غلطی احساس ہوتا ہے۔

عموماً جاہل خرابیاں حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں، وہاں لوگ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے کھو بیٹھتے

ہیں اور گریٹے ہونے حالات سے جو تکلیف ان کو پہنچی ہے وہ انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ ٹھنڈے دل سے غور فکر کر کے اصلاح کی کوشش کریں۔ اسی لئے ایسے حالات میں عام طور پر اصلاحی تحریکات کے بجائے انقلابی تحریکات کا زور ہوتا ہے۔ قدامت پسند اور انقلاب پسند جماعتوں میں سخت کشمکش برپا ہوتی ہے جس سے غضب انتقام کی آگ کو اور زیادہ ایندھن مل جاتا ہے۔ دونوں فریق صدا اور ہٹ دھرمی کے انتہائی سرور پر پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں حق اور صداقت کا گڑا کاٹتے ہیں۔ ایک طرف حق کے بجائے باطل کی مدافعت میں انتہائی قوت صرف کی جاتی ہے۔ دوسری طرف حق اور باطل کا امتیاز کئے بغیر سب پر اندھا دھند حملہ کیے جاتے ہیں۔ آخر کار جب انقلاب پسندوں کو فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ ہر اس چیز کو تباہ کر دیتے ہیں جو قدامت پسندوں کے پاس تھی خواہ وہ حق ہو یا باطل، صحیح ہو یا غلط۔ انقلاب ایک سیلاب کی طرح ٹھٹھکا ہے اور بلا امتیاز اچھے اور بُرے سب کو غارت کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر کافی تخریب کر چکے کے بعد جب عقل اپنے ٹھکانے پر واپس آتی ہے تو تعمیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر انقلابی ذہنیت اس میں بھی زلزلے انداز دھونڈ دھونڈ کر نکالتی ہے۔ ہر اس چیز کو چھوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے جو قدامت پسندوں کے پاس تھی خواہ کوئی چیز بچائے خود صحیح ہو لیکن انقلاب کی نگاہ میں کسی چیز کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں کہ وہ قدیم نظام کی طرف منسوب ہو اس طرح ایک کافی مدت تک نئے انقلابی اصولوں پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جب نئے نئے تجربوں اور ناکامیوں سے انقلابی دماغ تھک جاتا ہے تب کمبین حکمران اس عہدال کے نقشے پر آتا ہے جو ابتدا ہی سے اصلاح پسند کے پیش نظر تھا۔

انچھو دانا کس دکنڈ ناداں      لیک بعد از خرابی بسیار

موجودہ زمانے میں اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال بولشویک انقلاب ہے۔ نظام تمدن کی جو انتہائی بگڑی ہوئی حالت شہنشاہی روس میں قائم تھی وہ جب اہل ملک کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تو اس کے جواب میں ایک انقلابی تحریک رونما ہوئی۔ یورپ کے اکثر اکی اور جمہوری نظریات نے روس میں

فروغ پانا شروع کیا سلطنت اور اس کے پروردہ طبقوں نے اپنے ناجائز فوائد کی حفاظت کے لئے جابرانہ قوتیں استعمال کیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب پسندوں میں صرف شاہی مطلق العنانی اور دولت کی ناروا تقسیم ہی کے خلاف نہیں بلکہ اس پورے نظام تمدن کے خلاف جو صدیوں سے متوارث چلا آ رہا تھا غصہ کے جذبات بھڑکنے لگے۔ آخر کار ل مارکس کے بیرونی نے مینن کی صورت اختیار کی۔ زار کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا گیا اور اس کے ساتھ ان تمام سیاسی معاشی تمدنی، اخلاقی، مذہبی اصولوں کو بھی یکدم منادیا گیا جن پر انقلاب سے پہلے کی سوسائٹی قائم تھی۔ اس کا مل تخریب کے بعد باطل نے اشتراکی اصولوں پر ایک نئی سوسائٹی کی تعمیر شروع کر گئی، اور ان نئے سماروں نے اپنی تمام دماغی قوتیں اس کوشش میں صرف کر دیں کہ بورژوا طبقہ کے ترکے میں سے ایک چیز بھی ان کی نئی عمارت میں شامل نہ ہونے پائے حتیٰ کہ خدا کو بھی سوڈیٹ روس سے باہر نکل جانے کا نوٹس دے دیا گیا۔ لیکن اب جتنا جتنا زمانہ گزرتا جاتا ہے تعمیر عیقل انقلابی جنون کی جگہ یعنی جاتی ہے اور وہ انتہائی بولشویت جو انقلاب کی ابتدا میں کارفرما تھی اعتدال کے نقطہ کی طرف واپس ہوتی جا رہی ہے۔ ایسی ہی انتہا پسندی انقلاب فرانس کے زمانہ میں بھی رونما ہوئی تھی۔ اس وقت بھی جوش انقلاب میں اچھے اور بُرے سب کو ملانے کی کوشش کی گئی اور نئے نئے انقلابی اصول وضع کر کے ان کو رواج دیا گیا۔ لیکن اس شدید انقلابی بحران کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک فرانس کا سیاسی تمدنی اور اخلاقی مزاج پوری طرح اعتدال پر نہیں آ سکا ہے اور آج اکی قومی زندگی کو کسی شعبہ میں بھی ہتھکام نہ صیب نہیں ہو چکا۔ انگلستان کو حال ایک اور مثال ترکی انقلاب کی ہے جہاں اسی انقلابی ذہنیت نے کوشش کی کہ ایک قوم کو جادو کے زور سے آن کی آں میں ایک دوسری قوم بنادیا جائے۔ اس کوشش میں بھڑوں اور پھینسیوں پر نشر چلانے کے ساتھ جم کے اچھے خاصے تندرست حصوں کو بھی کاٹ پھینکا گیا، اور ان کی جگہ یورپ کے کچھ نئے اعضا منگو کر لگائے گئے، حتیٰ کہ پرانے دماغ کی جگہ بھی ایک نیا دماغ نئی ٹوپی کے ساتھ حاصل کیا گیا۔ لیکن اب مورد ایام کے ساتھ ساتھ انقلاب پسند ترکوں کو آہستہ آہستہ یہ سبق مل رہا ہے کہ ہر پرانی چیز کو بُرا اور ہر نئی چیز کو اچھا

سمجھنے کا جو فائدہ کلیہ انہوں نے بنالیا تھا، وہ درست نہیں ہے، چنانچہ اکثر نئے تجربوں سے کافی نقصان اٹھانے کے بعد ان کو افراط سے اعتدال کی طرف پسپا ہونا پڑا ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں میں بھی ایک انقلابی بحران رونما ہے اور اس بحران کے بڑے نتائج ظاہر ہونے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ قدامت پسند اور انقلاب پسند دونوں جماعتوں کو غور و فکر کی دعوت دیں۔

یہاں حالات کا بگاڑ وہی ہے جوڑکی اور دوسرے مسلم ممالک میں تھا اور ہے۔ صدیوں سے ہماری مذہبی رہنمائی جس گروہ کے ہاتھ میں ہے اس نے اسلام کو ایک جامد و غیر متحرک چیز بنا دیا ہے، غالباً چھٹی ساتویں صدی ہجری کے بعد سے اس گروہ کے ہاں جنتری بدلتی موقوف ہو گئی ہے۔ وہ اپنے فلسفے اور کلام کے مباحث میں تو یہی پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں عالم کے تغیر اور زمانہ کی نیرنگی اور وقت کے سیلان و تجدید سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں، دنیا بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ گئی، دنیا کے حالات، خیالات، رجحانات، نظریات بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے، تمدن کے معاملات اور مسائل نے کتنے ہی پلٹے کھائے مگر ہمارے پیشوا اپنے آپ کو ابھی تک اسی ماحول میں سمجھ رہے ہیں جو پانچ چھ سو برس پہلے پایا جاتا تھا۔ انہوں نے زمانہ کے ساتھ کوئی ترقی نہ کی، نہ تغیرات سے بے اثر ہے۔ زندگی کے نئے مسائل سے کوئی غرض نہ رکھی اور کوشش ہی کرتے ہیں کہ اپنی قوم کو بھی زمانہ کے ساتھ چلنے سے روک دیں، بلکہ مستقبل سے ماضی کی طرف کھینچ کر لے چلیں۔ یہ کوشش تھوڑی مدت تک کامیاب ہو سکتی تھی اور ہوئی، مگر دُعا ایسی کوششوں کا کامیاب ہونا مشکل ہے جو قوم دنیا کے ساتھ میل جول اور محلاتا رکھتی ہو وہ کب تک دنیا کے افکار اور زندگی کے نئے مسائل سے غیر متاثر رہ سکتی ہے؟ اگر اس کے رہنا اس کے آگے آگے چل کر نئی عقلی، علمی اور عملی راحول میں اس کی رہبری نہ کریں گے تو یہ بالکل فطری بات ہے کہ وہ ان کی قیادت کا جو اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے پر آمادہ ہو جائے گی۔

اس خرابی کی جڑ اصل ایک اور چیز ہے۔ ہماری مذہبی رہنما فروع میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ اول  
ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ پھر فروع نے اصول کی جگہ لے لی اور ان سے ہزار در ہزار فروع اور نکل آئے جو اصل  
اسلام قرار پا گئے، حالانکہ اسلام میں ان کی قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی۔ ملت اسلامی کی عمارت اصل میں ترتیب  
پر قائم ہوئی تھی کہ پہلے قرآن مجید پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پھر اہل علم و بصیرت کا اجتہاد۔  
لیکن بد قسمتی سے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا گیا، اور نئی ترتیب یوں قرار پائی کہ پہلے ایک خاص زمانہ کے  
اہل علم و بصیرت کا اجتہاد پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سے آخر میں قرآن یہی نئی ترتیب اس  
جمود کی ذمہ دار ہے جس نے اسلام کو ایک ساکن و غیر متحرک شے بنا دیا ہے۔

فقہاء و مفسرین اور محدثین رحمہم اللہ جمیع کے علم و فضل اور ان کی جلالت شان سے کون  
انکار کر سکتا ہے؟ مگر وہ انسان تھے اکتساب علم کے وہی ذرائع رکھتے تھے جو عام انسانوں کو حاصل ہیں۔  
ان کے پاس وحی نہیں آتی تھی بلکہ وہ اپنی عقل و بصیرت کے ساتھ کلام اللہ و سنت رسول اللہ میں غور و فکر  
کرتے تھے اور جو اصول ان کے نزدیک متحقق ہو جاتے تھے انہی سے وہ قوانین اور عقاید کے ذریعہ مستنبط  
کر لیا کرتے تھے۔ ان کے یہ اجتہادات ہمارے لیے مددگار اور رہنما بن سکتے ہیں۔ مگر بجائے خود اہل اؤ  
مبغ نہیں بن سکتے۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب علم کرے  
اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لیے دائمی قانون اور اہل قاعدہ نہیں بن سکتا،  
کیونکہ انسانی عقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم  
ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے فوہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اس علم کا فیضان قرآن  
کی آیات اور اس کے لائے والے کے سینے میں ہوا تھا۔ وہی حقیقت ایسا ماخذ اور سرچشمہ بن سکتا ہے  
جس سے ہمیشہ ہر زمانہ کے لوگ اپنے مخصوص حالات اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے علوم افکار اور قوانین

اخذ کرتے رہیں جب تک علماء اسلام اس اصل مانعہ و منبع سے اکتساب علم کرتے رہے اور صحیح غور و فکر سے کام لے کر اپنے اجتہاد سے علمی و علمی مسائل حل کرتے رہے اس وقت تک اسلام زمانہ کے ساتھ حرکت کرتا رہا مگر جب قرآن میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا گیا، جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہو گئی، جب انکھیر بند کر کے پچھلے مفسرین اور محدثین کی تقلید کی جانے لگی، جب پچھلے فقہاء اور متکلمین کے اجتہادات کو اہل او وائمی قانون بنایا گیا، جب کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب علم ترک کر دیا گیا، اور جب کتاب و سنت کے اصول کو چھوڑ کر بزرگوں کے نکلے ہوئے فروع ہی اصل بنالیے گئے تو اسلام کی ترقی و دفعتاً رک گئی، اس کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے حامل اور وارث علم و عمل کے نئے میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کرنے کے بجائے پرانے مسائل اور علوم کی شرح و تفسیر میں منہمک ہو گئے، جزئیات اور فروع میں جھگڑنے لگے، نئے نئے مذاہب نکالنے اور دور از کار مباحث میں فرقہ بندی کرنے لگے، اور اس دریا دلی کے ساتھ مسلمانوں میں کفر و فسق تقسیم کیا گیا کہ **يَذْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا** کی جگہ **يَخْرُجُونَ مِنْ دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا** کا متاثر دینا، دیکھا **أَشْذَاءُ عَلَى الْكُفَّارِ دُحُمَّا** اور **بَيْنَهُمْ** کی جگہ **دُحُمَّا عَلَى الْكُفَّارِ أَشْذَاءُ بَيْنَهُمْ** کے مناظر برطرف نمایاں ہوئے اور **تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقَلُوبُهُمْ شَتَّى** کی جو کیفیت منافقین اور کفار کے حق میں بیان ہوئی تھی، وہ مسلمانوں کا حال بن گئی۔ یہ اسی حرکت کی رحمت ہے جسے آج ہم ایک خوفناک انقلابی بحران کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ان کے مذہبی رہنما ان کی قیادت کا فرض انجام نہیں دیتے، بلکہ لگے بڑھانے کے بجائے انہیں الٹا پیچھے کھینچنے لگتے ہیں تو وہ ان کے قابو سے بچنے لگے، اور جیسا کہ ایک بن سری فوج کا حال ہوتا ہے انہوں نے ہرادی میں بھٹکنا شروع کر دیا۔ ایک گروہ نے مذہب کے علمبرداروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا سارا الزام خود مذہب پر تھوپا، اپنی ترقی کی راہ میں اسی کو سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا، اور علانیہ کینا شروع کیا کہ مذہب کو چھوڑ دو اور ترقی یافتہ قوموں کی تقلید کرو۔ ایک دوسرے گروہ

نے علما اور مذہبی پیشواؤں کو گالیاں دینا اپنا شعار بنالیا، گویا اب اسی سبب سے ستم اور زبان دمازی میں مسلمانوں کی فلاح و ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ ایک اور گروہ اٹھا اور اس نے مذہب کی قطع ویرید شروع کر دی، کبھی نے فقہاء اور ائمہ پر زبانِ طعن و راز کی، کبھی نے فقہ کے ساتھ حدیث کو بھی پیٹ میں لے لیا۔ کسی نے قرآن کے احکام و تعلیمات میں بھی ترمیم کی ضرورت سمجھی، کسی نے کہا کہ دین اور دنیا کو الگ الگ کر دو، دین کا فتنی صرف عقائد اور عبادات سے رہنا چاہئے باقی ہے دیوی معاملات تو ان میں مذہب اور اس کے قوانین کا کچھ دخل نہیں۔

اس طرح مختلف جماعتیں ان بگڑے ہوئے حالات کو بدلنے کے لیے کھڑی ہو گئی ہیں مگر ان کا رجحان اصلاح کی جانب نہیں بلکہ انقلاب کی جانب ہے۔ انہوں نے ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا کہ اصل خرابی کیا ہے؟ کہاں سے پیدا ہوئی؟ کس حد تک خرابی ہے؟ اور اسکی اصلاح کی صحیح صورت کیا ہے؟ محض تخمیناً یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خرابی ہے اور اس کو دور کرنے کے لیے دیوانہ وار شتر چلائے جا رہے ہیں چاہے اس مرض کے ساتھ مریض کا بھی کیوں نہ خاتمہ ہو جائے۔

آزاد ممالک میں تو کہا جا سکتا ہے، اور یہ کتنا ایک حد تک درست بھی ہے کہ کسی انقلابی حرکت کے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے کہ دہائیوں کے گروہ کے ہاتھ میں حکومت کا عملی اقتدار ہوتا ہے اور دوسرا گروہ اس قہدار کو مٹانے میں ایک شدید انقلابی حرکت کے بغیر مشکل سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ انقلاب کے رہنماؤں پر جب عملاً انتظامِ سلطنت کی ذمہ داری آن پڑتی ہے تو زمانے کے تجربات بہت جلدی ان کی عقل درست کر دیتے ہیں اور انہیں مجبوراً افراط کی روش چھوڑ کر اعتدال کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہم اس وقت غلامی کی حالت میں ہیں، اور ہماری حالت آزادی کے ممالک سے بالکل مختلف ہے یہاں اول تو کسی انقلابی حرکت کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ ایسی کسی شدید اور طاقتور مزاحمت کا خوف نہیں ہے جس کے مقابلہ میں ایک معتدل اصلاحی تحریک

کا میاب نہ ہو سکتی ہو۔ دوسرے اگر کوئی انقلابی حرکت جاری ہو اور وہ کامیاب ہو جائے تو مدتہائے دراز تک اس کے اعتدال پر آنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ انقلاب کے علمبرداروں پر سرے سے کسی ذمہ داری کا بوجھ ہی نہ ہو گا جو انکی افراط پسندی کو اعتدال کی طرف مائل کر سکتا ہو۔ لہذا یہاں کسی انقلابی حرکت بلکہ صحیح الفاظ میں بہت سی انقلابی حرکات کے دیر تک جاری رہنے کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہو گا کہ مسلم سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہو وہ سب کی سب متزلزل ہو جائیگی اور ان کی جگہ کوئی ایسی حکم بنیاد قائم نہ ہو سکے گی جس پر از سر نو ایک نظام جماعتی تعمیر کیا جاسکے۔ پھر غور کرنا چاہئے کہ جو قوم پہلے ہی غلامی اور کمزوری کی حالت میں ہو اس کے نظام اجتماعی کو اگر اس طرح منہدم کر کے پارہ پارہ کر دیا گیا تو وہ اخلاقی انحطاط کے کن گڑھوں میں جا بیگی۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ہم قدامت پسندوں کے زیادہ انقلاب پسندوں کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ورنہ جہاں تک گٹے ہوئے حالات کا تعلق ہے، انکو بدلنے کی ضرورت میں ہم بھی ان سے متفق ہیں، ہم بھی چاہتے ہیں کہ جو جو اسلام میں پیدا کر دیا گیا ہو اس کو حرکت سے بدل دیا جائے لیکن ہمارے نزدیک اس حرکت کے پیدا کرنے کی یہ کوئی صحیح تدبیر نہیں ہے کہ اسلامی شعائر کو چھوڑ کر فرنگیت اختیار کی جائے نہ اسکی یہ تدبیر ہے کہ علم و تحقیق اور غور و فکر کے بغیر مذہب کی قطع و برید شروع کر دی جائے نہ اسکی یہ تدبیر ہے کہ گذشتہ زمانے کے مجتہدین نے اپنی محنتوں اور کاوشوں سے جو عمارتیں قائم کی تھیں ان کو خواہ مخواہ ڈھا دیا جائے نہ اسکی یہ تدبیر ہے کہ حدیث کے سارے ذخیرہ کلاں میں جھونک دیا جائے نہ اسکی یہ تدبیر ہے کہ کلام الہی میں انسان اپنی عقل سے ترمیم و تنسیخ کر لے یہ سب تدبیریں تو اصلاح کی نہیں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ سخت فساد برپا کرنے کی تدبیریں ہیں صحیح علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو کہ جس ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے اسے پھر سے سیدھا کر دیا جائے۔ قرآن کو وہی پیشوائی کا مقام دیجئے جو وہ اصل اس کا مقام تھا حدیث کو وہی مرتبہ دیجئے جو عمدہ رسالت میں خود رسول اکرم اور آپ کے اصحاب اہل بیت آپ کے اقوال و اعمال کو دیتے تھے فقہاء متکلمین، مفسرین اور محدثین کے کارناموں کو وہی مرتبہ دیجئے جو خود ان بزرگوں نے دیا تھا۔ ان سے فائدہ اٹھائے جن چیزوں کے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے انہیں منظور نہ کیجئے مگر کبھی یہ نہ سمجھئے

کہ جو کچھ وہ کہہ گئے ہیں وہ اٹل قانون بنے یا انکی کتابوں نے ہم کو قرآن مجید میں غیور فکر اور احادیث نبوی کی تحقیق سے بے نیاز کر دیا ہے یا ان کے بعد کتاب سنت سے براہ راست اکتساب علم کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ یہ ترتیب اگر پھر سے قائم ہوتے تو اسلام کی رُکی ہوئی کارٹی پھر حرکت کرنے لگے گی، کیونکہ جمہود کی اصلی وجہ تو یہی ہے کہ انجن ریل سے کاٹ کر پیچھے کھڑا کر دیا گیا ہے ڈرائیور کو بھی انجن سے الگ کر کے کہیں پیچھے کے ڈبوں میں بٹھا دیا گیا ہے اور سب سے آگے کے ڈبے پر بھروسہ کر لیا گیا ہے کہ وہ خود بھی چلے گا اور ساری ریل کو بھی چلائے گا۔

مگر اس کام میں غصے اور عجز کی ضرورت نہیں غصہ تو وہاں ہو جہاں عہد کوئی ظلم کیا گیا ہو اور وہاں جو کچھ بھی ہو اسے عہد انہیں ہوتا ہے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ علماء نے کہیں کوئی کافر نس کر کے طے کیا تھا کہ ہم اسلام پر مجبور طاری کریں گے اور اس کی بڑھتی ہوئی کارٹی کو روکیں گے۔ یہ تو محض نتیجہ ہے اس انحطاط کا جو پچھٹی ساتویں صدی سے مسلمان قوموں کی سیاسی، فوجی، معاشی، اور تمدنی قوتوں کے ساتھ ان کی علمی، عقلی، اور فکری قوتوں میں رونما ہو رہا ہے اس انحطاط نے جس طرح مسلمانوں کی رُوح جہاد کو پشمرہ کیا اسی طرح ان کی رُوح اجتہاد کو بھی افسردہ کر دیا جس طرح زندگی کے جملہ مسائل کے متعلق مسلمانوں کے نظریے بدلے اسی طرح اُمور دینی و علمی کے متعلق بھی ان کے نظریے بدل گئے اور رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ان کی تمام ذہنی قوتوں پر مُردنی چھاتی چلی گئی۔ اس کا الزام نہ علماء کو دیا جاسکتا ہے نہ ان کے متبعین کو اگر آپ چاہیں تو فطرت پر اس کا الزام رکھ دیجئے مگر نہ الزام کہنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ غضب اور اس کے تحریجی جوش سے اصلاح کی صحیح صورت بس یہی ہے کہ ٹھنڈے دل سے خوابوں کے اسباب اور اُن کے حُود کو تلاش کیجئے اور حکمت کے ساتھ ان کو خوابوں سے بدل دیجئے۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ جولائی ۱۳۵۳ء)

## بغاوت کا ظہور

قوم دو طبقوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ ایک طبقہ عوام۔ دوسرا طبقہ خواص۔ طبقہ عوام اگرچہ کثیر العدد ہوتا ہے اور قوم کی مدد کی قوت اسے ہی ملتی ہے لیکن سوچنے اور رہنمائی کرنے والے و مدبر اس گروہ میں نہیں ہوتے نہ یہ لوگ علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں نہ ان کے پاس مالی قوت ہوتی ہے نہ یہ جاہ و منزلت رکھتے ہیں نہ حکومت کا اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے قوم کو چلانا ان لوگوں کا کام نہیں ہوتا، بلکہ حصّہ چلانے والوں کے پیچھے چلنا ان کا کام ہوتا ہے۔ یہ خود راہیں بنانے اور کمانے والے نہیں ہوتے بلکہ جو راہیں ان کے لئے بنادی جاتی ہیں انہی پر چل پڑتے ہیں۔ راہیں بنانے اور ان پر پوری قوم کو چلانے والے و اصل خواص ہوتے ہیں جن کی ہر بات اور ہر روش اپنی پشت پر دماغ، دولت، عزت اور حکومت کی طاقتیں رکھتی ہے اور قوم کو طوعاً و کرہاً انہی کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔ پس یہ کتنا بالکل صحیح ہے کہ قوم کی اصلی طاقت اس کے عوام نہیں بلکہ خواص ہوتے ہیں۔ انہی پر قوم کے بننے اور بگڑنے کا مدار ہوتا ہے ان کی راست روی پوری قوم کی راست روی پر اور ان کی گمراہی پوری قوم کی گمراہی پر منتج ہوتی ہے جب کسی قوم کی بہتری کے دن آتے ہیں تو ان میں ایسے خواص پیدا ہوتے ہیں جو خود راہ راست پر چلتے اور پوری قوم کو اس پر چلاتے ہیں۔ وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ۔ اور جب کسی قوم کی تباہی کا زمانہ آتا ہے تو اس کے بگاڑ کی ابتدا اس کے خواص سے ہوتی ہے جن کی گمراہی اور فساد اخلاق سے آخر کار ساری قوم ضلالت اور بے عملیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ وَإِذَا أَدْرَأْنَا أَنْ هَمَّكَ ذَرِيَّةً أَمْرَنَا مُّشْرِفَهَا فَسَقُّوا فِيهَا شَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فَدَخَرْنَاَهَا تَذْمِيرًا۔

قرآن کی اصطلاح میں خواص قوم کو مُشْرِفِينَ کہا گیا ہے یعنی وہ لوگ جن کو اس نے اپنی ذمہ داری

سے خوب سرفراز کیا ہو۔ خداوندِ عالم کی شہادت کے مطابق ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ پہلے یہ مترقین بستیوں میں فسق و فجور اور ظلم و عدوانخ تیار کرتے ہیں، پھر ساری کی ساری بستیاں بدی کی شکار ہو جاتی ہیں۔

اس شہاد کے صادق بننے میں کیا کلام ہے؟ ہماری اپنی قوم کا حال دیکھ لو۔ اس کا بچا بڑھی ہمارے مترقین ہی سے ہوا ہے ان لوگوں نے اس طریقے کو جو احکامِ الہی کے مطابق ہدایت کئے والے ائمہ کا طریقہ تھا چھوڑ دیا اور شیطانی طریقوں کی پیروی شروع کر دی۔ انہی نے نفس پرستی کے لیے شریعت کی بندشیں ڈھیل کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ انہی نے فراعزہ اور قیصر کی طرح خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرانی شروع کی اور اپنی قوم کو خدا پرستی کی جگہ بادشاہ پرستی اور اُمرا پرستی کا خوگر بنایا۔ انہی نے ان گردنوں کو بندوں کے آگے جھکنا سکھایا جنہیں صرف خدا کے آگے جھکنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ انہی نے خوشنابلہا سول اور شاندار محلوں میں معاصی اور جرائم کا ارتکاب کر کے اپنی قوم کے لئے معاصی و جرائم کو خوشنما بنایا۔ انہی نے حرام کے مال کھا کر اپنی قوم کو حرام کھانے اور حرام کھلانے کی عادت ڈالی انہی نے علم کو ضلالت کے لیے عقل و فکر کو شرارت کے لئے ذہانت کو مکرو فریب اور سازشوں کے لیے دولت کو ایمان خریدنے کے لئے حکومت کو ظلم و جور کے لئے اور طاقت کو استعمار کے لئے استعمال کیا۔ پھر یہی ہیں جنہوں نے حقوق اور منافع تک پہنچنے اور ترقی کرنے کے اکثر جائز راستے بند کر دیئے اور لوگوں کو مجبور کر دیا کہ خوشامد رشوت، جھوٹ سازش اور ایسے ہی دوسرے ذلیل راستوں سے اپنے مقاصد کو پہنچیں۔ غرض اخلاق و اعمال کا کوئی فساد ایسا نہیں ہے جس کا آغاز ان مترقین سے نہ ہوا ہو۔ ان کو اصرار ہے جو زمینیں عطا کی تھیں ان کو انہوں نے غلط طریقوں سے ہتھال کیا جو بھی بکڑے اور اپنے ساتھ اپنی قوم کو بھی بگاڑا۔ ضَلُّوا فَاصْطَلُّوا۔

یہ سب کچھ صدیوں سے ہو رہا تھا اور اخلاقی فساد کا گھن مسلمانوں کی قومی طاقت کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود دلوں میں کم از کم ایمان کی روشنی موجود تھی۔ احکامِ خدا اور رسول کی پابندی چاہے

نہ ہو مگر خدا اور رسول کی عظمت دلوں میں باقی تھی۔ قانون اسلام کی خلاف ورزی چاہے کتنی ہی کی گئی ہو مگر قانون کے احترام سے دل خالی نہ ہوتے تھے۔ اسلام کی حکومت سے رخراج خواہ کتنا ہی بڑھ گیا ہو مگر اس کے مقابلہ میں نفاذ کی جرأت کبھی نہ ہوئی تھی جس کو اسلام نے حق کہا تھا اس کو حق ہی مانا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کو چھوڑ کر ہلال کی پیروی میں کتنا ہی غلو کیوں کیا گیا ہو لیکن یہ حیرت کسی میں تھی کہ اسلام کے بتائے ہوئے حق کو بطل، باطل کو حق، فرض کو لغو و مہمل، جائز کو مکروہ، حرام کو حلال بلکہ تحسن اور گناہ کو ثواب کہا جاتا یا بھجا جاتا۔ گناہوں کا ارتکاب بیشک ہوتا تھا جرائم سے بلاشبہ دامن آلودہ ہوتے، شریعت کی حدود سے بہت کچھ تجاوز کیا جاتا۔ قوانین اسلامی کی خلاف ورزی سہل گزر جاتی۔ مگر دل ان پر شرمسار بھی ہوتے تھے، مذمت سے گردنیں جھک بھی جاتی تھیں، کم از کم دل اس کے معترف ہوتے تھے کہ وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کر رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ عقائد کی کمزوری اور اعمال کی خرابی کے باوجود مسلمانوں کی تہذیب انہی قوانین و ارکان پر قائم تھی جو اسلام نے تیسرے کئے تھے۔ یونان و ایران کے افکار کی درآمد نے اگرچہ بہت کچھ گمراہی پھیلائی لیکن انہیں کبھی اتنی کامیابی نہ ہوئی کہ مسلمانوں کے زاویہ نگاہ ہی کو پھیر دیتے، ان کی ذہنیت کے سانچے کو اسلام سے بالکل ہی منحرف کر دیتے، اور ان کی عقل و فکر و تمیز کی قوتوں کو یہاں تک متاثر کر دیتے کہ وہ مسلمان کی سی نظر سے دیکھنا اور مسلمان کے دماغ سے سوچنا بالکل چھوڑ ہی دیتے۔ اسی طرح تمدن تہذیب کا ارتقاء اگرچہ بیرونی اثرات کے تحت اسلام کی متعین کی ہوئی راہوں سے بہت کچھ منحرف ہوا لیکن جن اصولوں پر اس تہذیب تمدن کی بنا رکھی گئی تھی وہ بہت دور اُس کی بنیاد میں موجود تھے اور کسی دوسری مخالف تہذیب کے اصولوں نے ان کی جگہ نہ لی تھی مسلمانوں کی تعلیم کا نظام بہت کچھ بگڑا، مگر علوم دینی کو اس میں بہر حال ایک ممتاز جگہ حاصل تھی اور کوئی تعلیم یافتہ مسلمان اسلامی عقائد اور احکام شریعت اور ملی روایات کے کم از کم ابتدائی علم سے بے بہرہ نہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی عملی زندگی پر قانون اسلام کی بندشیں بہت کچھ دھیلی ہوئیں، مگر پھر بھی مسلمانوں کے جملہ معاملات پر ایک ہی قانون نافذ تھا، اور وہ اسلام کا قانون تھا غرض تمام خرابیوں کے

باد صفت مسلمانوں کے تخیلات، اخلاق اور اعمال پر اسلام کا ایک گہرا اثر تھا، اس کے اصولوں پر وہ مکیوں کے ساتھ ایمان رکھتے تھے، کم از کم ان کے ایمان کی سرحد میں مخالفت اسلام اصولوں کو داخل ہونے کا موقع نہ ملا تھا، اور اخلاق و اعمال کی جو قدریں (Values) اسلام نے متعین کی تھیں، وہ اس حد تک متغیر نہ ہوئی تھیں کہ باطل منقلب ہو جائیں اور ان کے خلاف کچھ دوسری قدریں ان کی جگہ لے لیتیں۔

لیکن انیسویں صدی میں حکومت کو ہاتھ سے کھو دینے کے بعد جرمنی قومی قوم کے مترفین نے دیکھا کہ حکومت کے ساتھ جاہ و منزلت، عزت و حرمت، مال و منال سب ہی کچھ ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں، اور غلامی کی حالت میں ان کو محفوظ رکھنے اور مافات کی تلافی کرنے کا کوئی ذریعہ بجز مغربی تہذیب اور علوم سے آہستہ ہونے کے نہیں ہے، تو ان کی روش میں ایک دُسر تغیر ہوا، جو صحیح معنوں میں محض تغیری نہیں بلکہ ایک انقلاب تھا، تغیر کے معنی محض بدلنے کے ہیں، مگر انقلاب الٹ جانے کو کہتے ہیں، اور فی الواقع اس دوسری کروٹ میں وہ ایسے الٹ گئے کہ ان کا قبیلہ مقصود الٹ گیا، ان کی ذہنیت الٹ گئی، ان کی تطلّیں الٹ گئیں، اور ان کا رخ اسلام سے فرگیت کی طرف پھر گیا جو اسلام کے عین مخالف سمت میں واقع ہوئی ہے۔

یہ انقلاب جب شروع ہوا تو وہ شرمساری اور ندامت آہستہ آہستہ خست ہونے لگی جو قوانین اسلامی سے انحراف کتنے وقت پہلے محسوس کی جاتی تھی، بلکہ سرے سے یہ احساس ہی مٹنے لگا کہ شریعت کی حدود سے تجاوز کر کے وہ کسی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ شرمندگی و ندامت کی جگہ ڈھٹائی اور بیجاہتی نے لے لی، علانیہ ہر قسم کی قانون شکنی کی جانے لگی اور شرم کے بجائے اس پر فخر کا اظہار ہونے لگا، مگر انقلاب کی رو اس حد پر بھی جا کر نہ رکی۔ اب جو باتیں فرنگیت ماب لوگوں کی مجلسوں میں سنی اور دیکھی جا رہی ہیں وہ بے حیائی سے گزر کر اسلام کے خلاف صریح بنادت کے آثار ظاہر کرتی ہیں۔ اب یہاں تک فحشیت پہنچ گئی ہے کہ ایک شخص جو اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنے جرم پر ادا ہونے کے بجائے الٹا اس شخص کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس پلٹے قانون کی اب تک پابندی کئے

جا رہا ہے۔ گویا اب مجرم اور گنہگار وہ نہیں ہے جو اسلامی قانون کو توڑتا ہے بلکہ وہ ہے جو اس کی پیروی کرتا ہے۔ اب صرف نماز روزے سے پرہیزی نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پر فریج بھی کیا جاتا ہے۔ ترک صوم و صلوٰۃ کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ روزے رکھنے اور نمازیں پڑھنے والوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ پابند صوم و صلوٰۃ لوگ (خصوصاً جبکہ وہ تعلیم یافتہ ہوں) اپنے فعل پر اسے شرمندہ ہوں گے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نماز روزے کو چھوڑنا نہیں بلکہ اس کی پابندی کرنا وہ عیب ہے جس پر کسی کو شرمندہ ہونا چاہئے۔ حد یہ ہے کہ اگر کسی نمازی کا کوئی عیب ظاہر ہوتا ہے تو بڑے طنز پر لے کر کہا جاتا ہے کہ آخر وہ حضرت نمازی ہیں، یعنی اس شخص سے عیب کے سرزد ہونے کا اصلی سبب کچھ اور نہیں بلکہ صرف وہ عمل ہے جس کو اس نے مانع فحشاٰ و منکر قرار دیا ہے اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اعمال سے افضل ٹھہرایا ہے!

یہ بیادوت صرف نماز روزے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قریب قریب زندگی کے تمام معاملات میں پھیل گئی ہے۔ اب اسلامی احکام کی پابندی کو "ملائیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور "ملائیت" ہمارے منہ زمانے کی اصطلاح میں تنگ نظری، تاریک خیالی، جہالت، دقیانوسیت اور بے عقلی کے سب سے زیادہ شدید مرکب کا نام ہے گویا یوں سمجھئے کہ راسخ العقیدہ اور متبع شریعت مسلمان کا نام "ملائے" اور "ملا" وہ ہے جو تہذیب اور روشن خیالی سے کوسوں دور ہو، مذہب و سوسائٹی میں کسی طرح کھپ ہی نہ سکتا ہو! یہ سوگالیوں کی ایک گالی ہے اور انہما رفرت کے پیچھے بہت سے الفاظ بولنے کے بجائے ہمارے "کلمے فرنگی" اپنے تمام جذبات کو سمیٹ کر صرف ایک لفظ "ملا" میں بھر دیتے ہیں جو تمام عیوب کا جامع ہے۔

آج کسی قول یا فعل کی تائید میں دلیل کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے مطابق ہے بغیر مسلم نہیں بلکہ ایک مسلمان جو قید ممتی سے "تعلیم یافتہ" اور "روشن خیال" ہو گیا ہے، بلا تکلف قرآن و حدیث کی سنکو رو کر دیتا ہے اور اس پر ذرا انہیں شرماتا، بلکہ توقع رکھتا ہے کہ اسلامی قانون کی سنگ لٹنے والے کو انکا شرمندہ ہونا چاہئے۔ قرآن و حدیث کا مستند ہونا تو دور کنار ہم نے تو یہ حال دیکھا ہے کہ جس بات کو اسلام

کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اس کے خلاف فوراً ایک تعصب پیدا ہو جاتا ہے۔ وہی بات اگر عقلی استدلال کے ساتھ پیش کی جائے یا کسی مغربی مصنف کے حوالے سے بیان کی جائے تو آمنتا و صدقنا۔ لیکن اسلام کا نام آئے ہی ہمارے فرنگیت مآتب سلمانوں کے دماغوں میں اس کے خلاف طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں اور انہیں شک ہو جاتا ہے کہ اس بات میں ضرور کوئی کمزوری ہوگی۔ گویا اب قرآن و حدیث کی سندان لوگوں کی نظر میں کسی بات کو قوی نہیں کرتی بلکہ اس کو الٹا کمزور اور محتاج دلیل بنا دیتی ہے!

چند سال پہلے تک یہ وہ باصرف ہمارے مردوں میں پھیلی ہوئی تھی اور ہماری عورتیں اس سے محفوظ تھیں۔ کم از کم اسلامی تہذیب کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ حرم وہ آخری جائے پناہ ہے جہاں اسلام اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کی حفاظت کرتا ہے۔ عورت کو جن مصلحتوں کی بنا پر اسلام نے حجاب شرعی میں رکھا ہے ان میں سے ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ کم از کم وہ سینہ تو نورایمان سے متور ہے جس سے ایک مسلمان بچہ دودھ پیتا ہے۔ کم از کم وہ گود تو کفر و فساد و انحلال و فساد اخلاق و اعمال سے محفوظ ہے جس میں ایک مسلمان بچہ پرورش پاتا ہے۔ کم از کم اس گہوارے کے ارد گرد تو قائل اسلامی فضا چھاٹی ہے جس میں مسلمان کی نسل اپنی زندگی کی ابتدائی منزل سے گزرتی ہے کم از کم وہ چار دیواری تو بیرونی اثرات سے محفوظ ہے جس میں مسلمان بچے کے سادہ دل و مانع پر تعلیم و تربیت اور مشاہدات کے اولین نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ پس حرم دراصل اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ مستحکم قلعہ ہے جس کو اس لئے تعمیر کیا گیا تھا کہ یہ تہذیب اگر کبھی شکست کھا کر پناہ بھی ہو تو یہاں پناہ مل سکے۔ مگر افسوس کہ اب قلعہ بھی ٹوٹ رہا ہے۔ فرنگیت کی وہ باب گھروں کے اندر بھی پہنچ رہی ہے۔ ہمارے فرنگیت آج مقررین اب اپنی خواتین کو بھی کھینچ کھینچ کر باہر لے رہے ہیں تاکہ وہ بھی انہی زہریلے اثرات سے متاثر ہوں جن سے وہ خود مسموم ہو چکے ہیں۔ ہماری قوم کی لڑکیاں اب ان تعلیم گاہوں میں گمراہی اور بد اعتقادی اور فساد اخلاق اور فرنگی تہذیب کے سبق لینے کے لیے بھیجی جا رہی ہیں جو اس سے پہلے ہمارے لڑکوں کو یہ سب کچھ سکھا کر اسلام سے باغی بنا چکی ہیں۔

یہ آخری حرکت ہمارے نزدیک اس انقلاب کی تکمیل کر دینے والی ہوگی جس کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہمارا صرف قیاس ہی نہیں ہے بلکہ تکمیل انقلاب کے آثار کو یہ بد نصیب انھیں دیکھ چکی ہیں اور یہ بد قسمت کائنات چکے ہیں۔ اب نوبت پہنچی ہے کہ ایک سلمان عورت قرآن و حدیث کے صریح احکام کی خلاف ورزی کر کے انبی زینت کا اظہار کرتی ہوئی نکلتی ہے، انگریزی ہوٹلوں میں جا کر لہج اور ڈنر کھاتی ہے، سینما ہال میں جا کر مردوں کے درمیان بیٹھتی ہے، بازاروں میں پھر کر شانہنگ کرتی ہے، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ قانون اسلامی کے خلاف یہ تمام فعال کرنے پر شرمندہ اور نادامہ ہونے کے بجائے فخر کے ساتھ اپنے ان کارناموں کو بیان کرتی ہے، اور اللہ اُس بیچارے عییفہ کو قابلِ ملامت ٹھیراتی ہے جس نے پہلے تو قانونِ اسلام کی پیروی میں حجاب شرعی کو چھوڑنے سے انکار کیا، اور جب اس کا شوہر اسے زبردستی کھینچ ہی لایا تو اس کو مردوں کے درمیان بے حجابانہ تماشاں مہی کر کے بے شرم آئی، اور اسے بازاروں کے چکر لگانا، تاج اور گرین کے منہ پہنچنا، میرگاہوں کی ہوائیں کھانا اُس چار دیواری کی بے لطیفوں کے مقابلہ میں پسند نہ آیا جس کی حدود میں بسنے کا اس کے خدا اور اس کے رسول نے اسے حکم دیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے خلاف بغاوت کی اسپرٹ مردوں سے گذر کر عورتوں تک بھی پہنچی جا رہی ہے۔ اور وہ بھی اسلام کے قوانین کی خلاف ورزی کو نہیں بلکہ اس کی پیروی کو اس بل سمجھنے لگی ہیں کہ ایک سلمان عورت اس پر شرمندہ و نادامہ ہو! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ خدا را بتاؤ کہ پرانی و بیدار خاتونوں کی گودوں میں پرورش پانے کے باوجود جب تمہارا یہ حال ہوگا ہے تو جب تمہاری عورتیں بھی غیرت ایمانی سے بیگانہ اور اطاعتِ خدا و رسول کی حدود سے باہر ہو جائیں گی تو ان سب کو کیا حشر ہوگا جو ان نئی فریفتہ تاب خواتین کی گودوں میں پرورش پا کر نکلیں گی؟ جو بچے آنکھ کھولتے ہی اپنے گرد و پیش فریفتہ ہی فریفتہ کے آثار دیکھیں گے، جن کی محصور نگاہیں اسلامی تہذیبِ تمدن کی کسی حالت سے آشنا ہی نہ ہوں گی، جن کے کانوں میں کبھی خدا و رسول کی باتیں پڑیں گی ہی نہیں جن کے دل دوماغ کی لوحِ سادہ پر ابتدا ہی سے فریفتہ کے نقوش ثبت ہو جائیں گے، کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے

جذباتِ خیالات، اخلاق، اعمال، غرض کسی حیثیت سے بھی مسلمان ہوں گے ؟

جرم کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کئے مگر اس کو جرم سمجھے اور اس پر شرمندہ ہو۔ اس قسم کا جرم محض اپنی حیثیت کے لحاظ سے سزا کا مستوجب تو ہے بلکہ توبہ اور انکارِ ندامت سے معاف بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ ایسا جرم صرف انسان کی کمزوری پر محمول کیا جائے گا۔

جرم کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرے اور اس کو عیب کے بجائے خوبی سمجھے اور فخر کے ساتھ اس کا علانیہ انکار کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس شخص کے دل میں اس قانون کا کوئی احترام نہیں ہے جو اس فعل کو جرم قرار دیتا ہے۔

جرم کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ انسان صرف ایک قانون کے خلاف جرم کا ارتکاب کرے بلکہ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرے قانون کے لحاظ سے اس جرم کو جائز اور عینِ صواب سمجھے اور جو قانون اس فعل کو جرم ٹھہراتا ہے اس کا مذاق اڑائے اور اس کی پیروی کرنے والوں کو خطا کار سمجھے۔ ایسا شخص صرف قانون کی خلاف ورزی ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کی تحقیر کرتا ہے اور اس کے خلاف بناوت کا مرتکب ہوتا ہے۔

ہر شخص جس میں تھوڑی سی عقل سلیم بھی ہوگی، یہ تسلیم کرے گا کہ جب انسان اس آخری مرتبہ پر پہنچ جاتے تو وہ اس قانون کی حدود میں نہیں رہ سکتا جس کے خلاف اس نے علانیہ بناوت کی ہے مگر کس قدر مردود ہے وہ شیطان جو تم کو یقین دلاتا ہے کہ تم اسلامی قانون کی تحقیر کر کے اس کا مذاق اڑا کر اس کی پیروی کو عیب ٹھہرا کر اور اس کی خلاف ورزی کو صواب قرار دیکر بھی مسلمان رہ سکتے ہو۔ ایک طرف تو تمہارا یہ حال کہ خدا و رسول جس کو اچھا کہیں اس کو تم بُرا کہو، وہ جس کو بُرا کہیں اس کو تم اچھا کہو، وہ جس کو گناہ ٹھہرائیں اس کو تم صواب قرار دو، وہ جس کو صواب ٹھہرائیں اس کو تم گناہ سمجھو، وہ جو حکم دیں اس کا تم مذاق اڑاؤ، وہ جو قانون بنائیں اس کی خلاف ورزی پر شرم نہ لے کے بجائے تم الٹا اس شخص کو شرم لانے کی کوشش کرو جو ان کے قانون کی پیروی کرتا ہے۔ دوسری طرف تمہارا یہ دعویٰ کہ تم خدا و رسول پر ایمان رکھتے ہو، اور ان کی عظمت تمہارے دل میں ہے، اور ان کے پسندیدہ دینی

یعنی اسلام کے تم پر دہو کیا کوئی صاحب عقل ان تسلیم کر سکتا ہے کہ اس طرز عمل کے ساتھ یہ دعویٰ صحیح ہے؟ اگر ایمان کے ساتھ انکا مزاج ہو سکتا ہے اگر تعظیم کے ساتھ تحقیر جمع ہو سکتی ہے اگر یہ ممکن ہے کہ کسی کا احترام بھی دل میں ہو اور ہنس کا مذاق بھی اڑایا جائے، اگر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ خلاف ورزی پر فخر کرنے والا اور پیروی کو ملامت کے قابل سمجھنے والا بھی پیر و اوستی ہو، تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ بناوت ہی عین اطاعت ہے اور تحقیر ہی عین تعظیم ہے اور انکار ہی کا نام ایمان ہے جو تمہیں ٹھوکر مارتا ہے وہی دراصل تمہاری تعظیم کرتا ہے جو تمہارا مذاق اڑاتا ہے وہی دراصل تمہارا احترام کرتا ہے اور جو تمہیں جھوٹا لگتا ہے وہی دراصل تمہاری تصدیق کرنے والا ہے!

اسلام جو اطاعت کے اور کسی چیز کا نام نہیں ہے، اور حقیقی اطاعت ایمان کے بغیر متحقق نہیں ہوتی، اور ایمان کا اولین اقتضاء یہ ہے کہ جب خدا اور رسول کا حکم کسی کو پہنچے تو اس کی گردن جھک جائے اور وہ اس کے مقابلے میں سر نہ اٹھاسکے :-

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا  
دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ  
أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا أُولَٰئِكَ هُمُ  
الْمُتَّقُونَ (النور - ۷)

مومنوں کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو بلایا جائے اسد اور  
اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کے  
تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی ایسے ہی لوگ

پھر یہ گردن جھکانا بھی بکراہت نہیں بطور ع و غیبت ہونا چاہئے، حتیٰ کہ حکم خدا و رسول کے خلاف  
دل میں بھی کوئی تنگی اور ناراضی چھپی ہوئی نہ ہو جس شخص کی گردن محض ظاہر میں جھک جائے مگر دل میں اس کے  
خلاف لگنی محسوس کر رہا ہو وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے :-

وَإِذْ أَقْبَلَ لَهُمْ نَعَالُوهُمَا  
أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتُ الْمُنَافِقِينَ

اور حبیان سے کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو امیر نے تمہارا  
ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو کہ منافقین تمہاری

يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا .....  
 فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُخَرِّجُوا  
 فِيمَا شَجَرَ بَيْنَكُم ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ  
 حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيَسْلُمُوْا  
 تَسْلِيمًا - (النساء :- ۹)

لطف لے لے لئے جی چراتے ہیں پس قسم ہے تیرے پروردگار  
 کی کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے اختلافات  
 میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کر لیں، پھر جو کچھ تو  
 فیصلہ کرے اس پر اپنے دلوں میں تسکین بھی نہ پائیں بلکہ  
 سر تسلیم خم کر دیں -

لیکن جو شخص علانیہ حکم نامے سے انکار کرتے، اور خدا، رسول کے قانون کو چھوڑ کر دوسرے قوانین  
 کی پیروی کئے اور انہی قوانین کو درست اور حق سمجھ اور ان کی پیروی کرتے ہوئے خدا و رسول کے قانون کا  
 مذاق اڑاتے اور اسکی اطاعت کو عیب ٹھہراتے، وہ تو کسی طرح بھی مومن نہیں ہو سکتا، خواہ وہ زبان سے اپنے  
 آپ کو مسلمان کہتا ہوا اور مسلمانوں کے سے نام سے موسوم ہوا اور مردم شماری میں اس کو مسلمان لکھا گیا ہو۔  
 انسان گناہ کے مومن رہ سکتا ہے بشرطیکہ گناہ کو گناہ سمجھے اور اس پر نادم ہو اور اس قانون کو تسلیم کرے جس  
 کے خلاف محض اپنی فطری کمزوری سے اس نے ایک فعل کا ارتکاب کیا ہے، لیکن جب گناہ کے ساتھ شرعی  
 اور دھناتی بھی ہو، اور اس پر فخر بھی کیا جائے، اور اس کو صواب ٹھہرا کر اس شخص کو ملامت بھی کی جائے جو  
 اس کا ارتکاب نہیں کرتا، تو خدا کی قسم ایسے گناہ کے ساتھ ایمان کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس مرتبے میں داخل  
 ہونے سے پہلے ہی آدمی کو قطعی فیصلہ کر لینا چاہئے کہ آیا وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے یا اسلام سے نکل کر اس  
 قانون کی اطاعت میں داخل ہو جانا پسند کرتا ہے جس کی پیروی میں اس کو شرح صدر حاصل ہو رہا ہے -

خدا کے فضل سے ابھی تک مسلمانوں کے عوام اس فریفت اور بے بنیادیت کی رو سے محفوظ رہیں  
 ابھی تک ان کے دلوں میں خدا اور رسول کے احکام کا احترام باقی ہے اور قوانین اسلامی کی پابندی تھوڑی  
 بہت انہی میں نظر آتی ہے لیکن خواص کی بدوش جس طرح پہلے ان کے اخلاق اور معاملات پر اثر انداز ہو  
 چکی ہے اسی طرح اندیشہ ہے کہ یہ نئی روش کمبیں ان کے ایمان پر بھی رفتہ رفتہ اپنا مہلک اثر نہ ڈال دے

عامۃ مسلمین میں جس فتنہ کے ساتھ ترک صوم و صلوٰۃ منکرات و منہیات کا ارتکاب فرنگی اطوار کی تقلید کا شوق اور فرنگی تہذیب کو خوشامایا کر دکھانے والے کھیل تماشوں کی طرف میلان بڑھ رہا ہے وہ دراصل اس آنے والے خطرے کا الارم ہے اگر ہمارے مترقین کے خیالات کی اصلاح نہ ہوئی اور اسلام کی ہر اہل مستقیم سے ان کا انحراف اسی طرح جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب ساری قوم اس ضلالت میں مبتلا ہو جائے گی اور اللہ کی بیعت پوری ہو کر ہے گی کہ اِذَا ارَدْنَا اَنْ نَّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَرْنَاهَا تَدْمِيرًا۔

(زبحان احسن۔ ذی القعدہ ۱۳۳۵ھ۔ فروری ۱۳۵۵ھ)

## اجتماعی فساد

قرآن مجید میں ایک قاعدہ کلیہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے کسی قوم کو خواہ مخواہ برباد کرنے اور انحالیکہ وہ صالح اور نیکو کار ہو۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ (ہود - ۱۰)

اور تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ظلم سے تباہ کر دے  
حالانکہ ان کے باشندے نیک عمل کرنے والے ہوں۔

ہلاک اور برباد کرنے سے مراد فحش نہیں کہ بستیوں کے طبقے الٹنے جائیں اور آبادیوں کو موٹے گھاٹ اتار دیا جائے۔ بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قوموں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے ان کی اجتماعی قوت توڑ دی جائے۔ ان کو محکوم و مغلوب اور ذلیل و خوار کر دیا جائے۔ قاعدہ مذکورہ کی بنیاد پر بربادی اور ہلاکت کی جملہ اقسام میں سے کوئی قسم بھی کسی قوم پر نازل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خیر و صلاح کے راستے کو چھوڑ کر شر و فساد اور سرکشی و نافرمانی کے طریقوں پر نہ چلنے لگے اور اس طرح خود اپنے اوپر ظلم نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر جہاں کہیں کسی قوم کو مبتلا سے عذاب کرنے کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس کا جرم بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ ان کی اپنی ہی شامت اعمال ہے جو ان کی دنیا اور آخرت دونوں کو خراب کرتی ہے فَكَلَّا أَخَذْنَا بِذُنُوبِهِ... وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ۔ ہر ایک کو ہم نے اس کے قصور ہی پر پکڑا..... اس ان پر ظلم کرنے والا نہیں بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔“

دوسری بات جو اس قاعدہ سے نکلتی ہے یہ ہے کہ ہلاکت و بربادی کا سبب انفرادی شر و فساد نہیں ہے بلکہ اجتماعی اور قومی شر و فساد ہے یعنی اعتقاد اور عمل کی خرابیاں اگر متفرق طور پر افراد میں پائی جاتی ہوں، لیکن مجموعی طور پر قوم کا دینی و اخلاقی معیار اتنا بلند ہو کہ افراد کی برائیاں اس کے اثر سے دبی رہیں تو خواہ ازاد و علیحدہ علیحدہ کتنے ہی خراب ہوں قوم بحیثیت مجموعی سنبھلی رہتی ہے اور کوئی فتنہ عام پر پانہیں ہوتا جو پوری قوم کی بربادی کا موجب ہو مگر جب اعتقاد اور عمل کی خرابیاں افراد سے گزر کر پوری قوم میں پھیل جاتی ہیں اور قوم کا دینی احساس اور اخلاقی شعور اس درجہ مادت ہو جاتا ہے کہ اس میں خیر و صلاح کے بجائے شر و فساد کو پھیلنے اور پھولنے کا موقع ملنے لگے، تو اس وقت امتدعالی کی نظر عنایت ایسی قوم سے پھر جاتی ہے اور وہ عزت کے مقام سے ذلت کی طرف گرنے لگتی ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ امت کا غضب اس پر بھڑک اٹھتا ہے اور اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں اس کی بکثرت مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

قوم نوح کو اس وقت برباد کیا گیا جب اعتقاد و عمل کی خرابیاں ان کے اندر بڑھ چکیں اور زمین میں پھیلنے لگیں اور یہ امید ہی باقی نہ رہی کہ اس شجر خبیث سے کبھی کوئی اچھا پھل بھی پیدا ہوگا۔ آخر کار مجبور ہو کر حضرت نوح نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا کہ :-

رَبِّ لَا تَذَرْنِي الْاَدْحٰى مِنْ  
الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْنِيْ  
يُعٰدِلُوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فٰجِرًا  
میرے پروردگار! زمین پر ان کا فرد میں سے ایک کو بھی نہ  
نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ  
کر دیں گے ان کی نسل سے جو پیدا ہوگا بدکار اور سخت کا فری  
کَفَّارًا - (نوح - ۲)

قوم عاد کو اس وقت تباہ کیا گیا جب شر اور فساد نے ان کے دلوں میں یہاں تک گھر کر لیا کہ شریر اور فساد اور ظالم ان کی قوم کے لیڈر اور حاکم بن گئے، اور اہل خیر و صلاح کے لیے نظام اجتماعی میں کوئی گنجائش باقی نہ رہی :-

وَنَزَّلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسَخَّرْنَا لَصَّاحِبِ الْمَدْيَنَ وَآيَاتِنَا لَكُم مَّا تَدْرِكُونَ  
اور یہ عادیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام سے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر قبیلہ دشمن حق کا ابتداء کیا۔

قوم بوط کو اس وقت ہلاک کیا گیا جب ان کا اخلاقی شعور ناکند ہو گیا اور ان میں حیثیاتی مہمان تک بڑھ گئی کہ علامتیہ مجلسوں اور بازاروں میں فواحش کا از نکاب کھیلانے لگا، اور فواحش کے فوجش ہونے کا احساس ہی باقی نہ رہا۔

أَنزَلْنَا نُوحًا بِآيَاتِنَا وَنَاوُودَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنَكَّرِ -  
(بوطے لکھا) کہ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پس جاتے ہو اور رستوں میں لوگوں کو چھپڑتے اور ساتے ہو اور اپنی مصلحتوں میں

(عزیمت - ۳) بدکاریاں کرتے ہو۔

اہل مدین پر اس وقت عذاب نازل ہوا جب یہی قوم فاش اور بد معاملہ اور بے ایمان ہو گئی کہ تم تو لانا اور زیادہ لینا کوئی عیب نہ رہا، اور قوم کا اخلاقی احساس یہاں تک فنا ہو گیا کہ جب ان کو اس عیب کی ملامت کی جاتی تو شرم سے سر جھک لینے کے بجائے وہ لانا اس ملامت کرنے والے کو ملامت کرتے، اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان میں کوئی ایسا عیب بھی ہے جو ملامت کے قابل ہو۔ وہ اپنی بدکاریوں کو برا نہ سمجھتے بلکہ جو ان حرکات کو برا کہتا اسی کو برسر غلط اور لائق سرزنش خیال کرتے :-

وَيَقُولُوا أَفَنُؤْمِنُ بِالْمَكِئِيلِ وَالْمِيزَانِ  
بالْقِسْطِ وَلَا يَنْخَسِرُوا النَّاسُ أَشْيَاءَهُمْ  
وَلَا تَعْمَلُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ .....  
قَالُوا يُشْعِبُ مَا نَفَقَ كَيْزًا مِمَّا  
نَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا وَلَوْ كَا  
رَهْطَكَ لَوَجَّهْنَاكَ (ہود - ۸)

اشعیب علیہ السلام نے کہا، اور اے میری قوم کے لوگو! انصاف کے ساتھ ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ ..... انہوں نے جواب دیا کہ اے اشعیب! جو باتیں تو کہتا ہے ان میں سے تو اکثر ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔ اور ہم تو تجھے اپنی قوم میں کمزور پتے ہیں اور اگر تیرا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے۔

نبی ہر اس کو ذلت و مسکنت اور غضب و لعنت الہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ اس وقت صادر ہوا جب انہوں نے بدی اور علم اور حرام خوری کی طرف پلکنا شروع کیا، ان کی قوم کے پیشوا مصلحت پرستی کے مرض میں مبتلا ہو گئے، ان میں گناہوں کے ساتھ رواداری پیدا ہو گئی، اور ان میں کوئی گروہ ایسا نہ رہا جو عیب کو عیب کہنے والا اور اس سے روکنے والا ہوتا۔

تو ان میں سے اکثر کو دیکھتا ہے کہ گناہ اور حدود الہی سے تجاوز اور حرام خوری کی طرف پکتے ہیں۔ یہ کسی بُری حرکتیں تھیں جو وہ کرتے تھے کیوں نہ ان کے مشلخ ادا علماء نے ان کو بُری باتیں کہنے اور حرام کے مال کھانے منع کیا؟ یہ بہت بُرا تھا جو وہ کرتے تھے۔

نبی ہر اس میں سے جن لوگوں کو کفر کیا ان پر داؤد و اعلیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کرائی گئی اس لئے کہ انہوں نے سرکشی کی اور وہ سدا گزر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بُرے افعال سے نہ روکتے تھے۔

اس آخری آیت کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث منقول ہیں وہ قرآن حکیم کے مقصد کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ بسبب روایات کا قلاصہ یہ ہے کہ حضور نے فرمایا۔

”نبی ہر اس میں جب بدکاری پھیلنی شروع ہوئی تو حال یہ تھا کہ ایک شخص اپنے بھائی یا دوست یا ہمسایہ کو برا کام کرنے دیکھتا تو اس کو منع کرتا اور کہتا کہ اے شخص خدا کا خوف کر۔ مگر اس کلمہ وہ اسی شخص کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتا اور یہ بدی کا مشاہدہ اس کو اُس بدکار شخص کے ساتھ میل جول اور کھپنے میں شرکت کرنے سے نہ روکتا جب ان کا یہ حال ہو گیا تو ان کے دلوں پر ایک دوسرے کا اثر

پڑا اور اسے بیکو ایکٹنگ میں لگے یا اور اسکے نبی داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی۔  
 رادی کہتا ہے کہ جب حضور سلسلہ تفرید میں اس مقام پر پہنچے تو جوش میں لے کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا۔  
 ”قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور  
 بدی سے روکو اور جس کو بُرا فعل کرتے دیکھو اس کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے راہِ راست کی طرف موڑ دو  
 اور جس معاملہ میں ہرگز رواداری نہ رہو۔ ورنہ اعدائے دلوں پر بھی ایک کُفر سے کاٹ ڈال دے  
 گا اور تم پر بھی اسی طرح لعنت کہے گا جس طرح بنی اسرائیل پر کی“

اعتقاد اور عمل کے فساد کا حال و باقی امراض کا سلسلہ۔ ایک باقی مرض ابتدا میں چند کمزور افراد  
 پر حملہ کرتا ہے۔ اگر آپ ہو اچھی ہو حفظانِ صحت کی تدابیر درست ہوں نجاستوں اور کثافتوں کو دور کرنے  
 کا کافی انتظام ہو اور مرض سے متاثر ہونے والے مریضوں کا بروقت علاج کر دیا جائے تو مرض واپس عام کی  
 صورت اختیار کرنے نہیں پاتا اور عام لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن اگر طبیب فاضل ہوں حفظانِ  
 صحت کا غمگین ہے پرواہ ہو صفائی کے منتظم نجاستوں اور کثافتوں کے روادار ہو جائیں تو رفتہ رفتہ مرض  
 کے جراثیم فضا میں پھیلنے لگتے ہیں اور آپ ہو امیں سرایت کہے اس کو اتنا خراب کر دیتے ہیں کہ صحت  
 کے بجائے مرض کے لئے سازگار ہو جاتی ہے۔ آخر کار جب بستی کے عام افراد کو ہوا، پانی، غذا، لباس مکان  
 فرض کوئی چیز بھی گندگی اور سمیت سے پاک نہیں ملتی تو ان کی قوتِ حیات جواب دینے لگتی ہے اور ساری  
 کی ساری آبادی واپس عام میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر قوی سے قوی افراد کے لیے بھی اپنے آپ کو مرض  
 سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خود طبیب اور صفائی کے منتظم اور صحتِ علم کے محافظ تک بیماری میں مبتلا ہو  
 جلتے ہیں اور وہ لوگ بھی ہلاکت سے محفوظ نہیں رہتے جو اپنی حد تک حفظانِ صحت کی جملہ تدبیریں اختیار  
 کرتے ہیں اور دواؤں سے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ہوا کی سمیت پانی کی گندگی و مسائل غذا کی خرابی  
 اور زمین کی کثافت کا ان کے پاس کیا علاج ہو سکتا ہے۔

اسی پر اخلاق و اعمال کے فساد اور اعتقاد کی گمراہیوں کو بھی قیاس کر لیجئے۔ علماء قوم کے طبیب ہیں۔ حکام اور اہل دولت صفائی و حفظانِ صحت کے ذمہ دار ہیں۔ قوم کی غیرت ایمانی اور جماعت کا حاتمہ اخلاقی بہتر اور قوت حیات (vitality) ہے۔ اجتماعی ماحول کی حیثیت یہی ہے جو ہوا، پانی، غذا اور لباس مکان کی ہے۔ اور یہ قومی میں دین و اخلاق کے اعتبار سے امر بالمعروف نہی عن المنکر کا وہی مقام ہے جو صحت جسمانی کے اعتبار سے صفائی و حفظانِ صحت کی تدابیر کا ہے جب علماء اور اولی الامر اپنے اصلی فرض یعنی امر بالمعروف نہی عن المنکر کو چھوڑ دیتے ہیں اور شر و فساد کے ساتھ روا داری رتنے لگتے ہیں تو گمراہی اور بد اخلاقی قوم کے افراد میں پھیلی شروع ہو جاتی ہے اور قوم کی غیرت ایمانی ضعیف ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا اجتماعی ماحول فاسد ہو جاتا ہے۔ قومی زندگی کی فضا خیر و صلاح کے لئے نامساعد اور شر و فساد کے لئے سازگار ہو جاتی ہے۔ لوگ نیکی سے بھاگتے ہیں اور بدی سے نفرت کرنے کے بجائے اس کی طرف کھینچنے لگتے ہیں۔ اخلاقی قدریں اُلٹ جاتی ہیں عیب نہیں جانتے اور نہ عیب اس فتنہ گراں سبب اور بد اخلاقیوں کو بھڑکتی چھو لیتی ہیں اور بھلائی کا کوئی بیج برگ و بار لسنے کے قابل نہیں رہتا۔ زمین ہوا اور پانی سب اس کو پرورش کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ ان کی ساری قوتیں اشجارِ خبیثہ کو نشوونما دینے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں جب کسی قوم کا یہ حال ہو جاتا ہے تو پھر وہ عذابِ آسمی کی مستحق ہو جاتی ہے اور اس پر ایسی عام تباہی نازل ہوتی ہے جس سے کوئی نہیں بچتا خواہ وہ خانقاہوں میں بیٹھا ہو اور استاذِ دین عبادت کر رہا ہو۔

اسی کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ :-

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُكَ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً (انفال - ۳)

بجو اس فتنہ سے جو صرف انہی لوگوں کو مبتلائے مصیبت نہ کرے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اس سے یہ ہے کہ بدی

کو اپنے سامنے نہ ٹھہرنے دو کیونکہ اگر تم بدی سے رواداری کرو گے اور اس کو پھیلنے دو گے تو اللہ کی طرف سے عذابِ عام نازل ہوگا اور اس کی پیٹ میں اچھے اور بُرے سب آجائیں گے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ :-

ان الله لا يعذب العاصي بعمل  
خاصته حتى يروا المنكرين ظهرا بينهم  
وهو قادر على ان يتركوه فلا ينكروه  
فاذا فعلوا ذلك عذب الله الخاصة  
والعامة -

اسد خاص لوگوں کے عمل پر عام لوگوں کو عذاب نہیں  
دیتا بلکہ جب وہ اپنے سامنے بدی کو دکھیں اور اس کو  
روکنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کو نہ روکیں  
تو اسد خاص اور عام سب کو مبتلائے عذاب کر دیتا  
ہے۔

قوم کی اخلاقی اور دینی صحت کو برقرار رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس کے ہر فرد میں غیرت  
ایمانی اور عائتہ اخلاقی موجود ہو جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع لفظ "جہاد" سے تعبیر فرمایا ہے جہاد  
ایمان کا ایک جز ہے جیسا کہ حضور نے فرمایا ہے ان الحیاء من الایمان۔ بلکہ ایک موقع پر جب حضور  
عرض کیا گیا کہ جہاد دین کا ایک جز ہے تو آپ نے فرمایا بل هو الدین کلہ یعنی وہ پورا دین ہے۔

جہاد سے مراد یہ ہے کہ بدی اور مصیبت سے نفس میں طبعی طرد پر انقباض پیدا ہوا ورل اس نفرت  
کرے جس شخص میں یہ صفت موجود ہوگی وہ نہ صرف قبايح سے اجتناب کرے گا بلکہ دُشمنوں میں بھی اس  
کو برداشت نہ کر سکے گا۔ وہ براہنوں کے دیکھنے کا روادار نہ ہوگا ظلم اور مصیبت سے مصالحت کرنا اس  
کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ جب اس کے سامنے قبايح کا ارتکاب کیا جائے گا تو اس کی غیرت ایمانی جوش میں  
آجائے گی اور وہ اس کو ہاتھ سے یا زبان سے مٹانے کی کوشش کرے گا یا کم از کم اس کا دل اس غم و شہش سے  
بچیں ہو جائے گا کہ اس بُرائی کو مٹائے۔

من دأى منكم منکرا فلیخبرہ  
تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے

میدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلك اضعف الايمان  
مٹا دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو زبان سے اس کا گریہ بھی  
نہ کر سکتا ہو تو دل سے اور یہ ضعیف ترین ایمان ہے۔  
جس قوم کے افراد میں عام طور پر یہ صفت موجود ہوگی اس کا دین محفوظ رہے گا اور اس کا اخلاقاً قیماً  
کبھی نہ گر سکے گا، کیونکہ اس کا ہر فرد دوسرے کے لئے محتسب اور نگران ہوگا اور عقیدہ و عمل کے فساد کو اس  
میں اقل ہونے کے لئے کوئی راہ نہ مل سکے گی۔

قرآن مجید کا مقصد و اصل ایسی ہی ایک آئیڈیل سوسائٹی بنانا ہے جس کا ہر فرد اپنے قلبی رجحان اور  
اپنی فطری غیرت و حیا اور خالص اپنے ضمیر کی تحریک پر احتساب اور نگرانی کا فرض انجام دے اور کسی اجرت  
کے بغیر خدائی فوجدار بننا پھرے۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا  
اور اس طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور متوسط امت بنایا  
لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ  
ہے تاکہ تم لوگوں پر نگران رہو اور رسول تم پر نگران  
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرہ: ۱۴۰)  
رہے۔

اسی لئے بار بار مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا تمہارا قومی خاصہ ہے  
جو ہر مومن مرد اور عورت میں متحقق ہونا چاہئے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ  
تم بہترین قوم جو ہے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے تم  
تَامُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ  
نیکی کا حکم کرتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اس پر ایمان  
وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران: ۱۱۲)  
رکھتے ہو۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ  
مومن مرد اور عورت ایک دوسرے کے مددگار  
أَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ  
میں نیکی کا حکم کرتے اور بدی سے روکتے ہیں  
يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ: ۹)

الْأَمْرُ دُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهِي عَنْ الْمُنْكَرِ وَالْحَفِظُونَ لِيَحْدُوَ اللَّهُ (قوبہ: ۱۱۲)

وہ نیکی کا حکم کرنے والے اور بدی سے روکنے والے اور  
حفظ الہی کی حفاظت کرنے والے ہیں -

الَّذِينَ أَنْ مَكَدُهُمْ فِي الْأَرْضِ قَامُوا  
یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم اگر زمین میں حکومت بخشیں گے  
تو یہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے  
وَهُوَ أَعَنِ الْمُنْكَرِ (ع: ۶)

اگر مسلمانوں کا یہ حال ہو تو ان کی مثال اس بتی کی سی ہوگی جس کے ہر باشندے میں صفائی اور  
حفظ ان صحت کا احساس ہو۔ وہ نہ صرف اپنے جسم اور اپنے گھر کو صاف پاک رکھے بلکہ بتی میں جہاں کہیں  
غفلت اور نجاست دیکھے اس کو دور کرے اور کسی جگہ گندگی و کثافت کے بہنے کا روادار نہ ہو۔ ہر سے کمر لپی  
بستی کی آب ہوا پاک صاف ہے گی۔ اس میں امراض کے جراثیم پرورش نہ پاسکیں گے اور اگر شاذ و نادر کوئی  
شخص کمزور اور بعض الطبع ہوگا بھی تو اس کا بروقت علاج ہو جائے گا یا کم از کم اس کی بیماری شخصی  
بیماری ہوگی دوسروں تک متعدی ہو کر وبائے عام کی صورت نہ اختیار کر سکے گی۔

لیکن اگر مسلمانوں کی قوم اس بلند درجہ پر نہ رہ سکے تو سوائے دینی و اخلاقی صحت کو برقرار رکھنے کے  
یہ کم از کم ایک ایسا گروہ تو ان میں ضرور موجود رہنا چاہئے جو ہر وقت اپنی خدمت پر مستعد رہے اور  
اعتقاد کی گندگیوں اور اخلاق و اعمال کی نجاستوں کو دور کرتا رہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى  
تَمَّ هُنَّ ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف  
الْخَيْرِ دِيَا مُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَهْمُونَ  
بلانے والی ہو نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔

عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)

یہ جماعت علماء اور اولو الامر کی جماعت ہے جس کا امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں منہمک رہنا  
اتنا ہی ضروری ہے جتنا شہر کے حکمہ صفائی و حفظان صحت کا اپنے فرائض میں مستعد رہنا ضروری ہے

اگر یہ لوگ اپنے فرض سے غافل ہو جائیں اور قوم میں ایک جماعت بھی ایسی باقی نہ رہے جو خیر و صلاح کی طرف دعوت دینے والی اور منکرات سے روکنے والی ہو تو دین و اخلاق کے اعتبار سے قوم کی تباہی اسی طرح یقینی ہے جس طرح حیم و جان کے اعتبار سے اس بستی کی ہلاکت یقینی ہے جس میں معافی و حفظانِ محنت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اگلی قوموں پر جو تباہیاں نازل ہوئی ہیں وہ اسی نئے ہوئی ہیں کہ ان میں کوئی گروہ بھی ایسا باقی نہ رہا تھا جو ان کو برائیتوں سے روکتا اور خیر و صلاح پر قائم رکھنے کی کوشش کرتا۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ  
أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ  
إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَجَيْنَا مِنْهُمْ (ہود: ۱۰)  
کہوں نہ ان کے علماء اور مشائخ نے ان کو بُری باتیں  
عَنْ قَوْلِهِمْ الْأَثَمُ وَأَكْلِهِمْ الشَّحْتِ (النمل: ۹)  
کہنے اور حرام خوری کرنے سے باز رکھا؟

پس قوم کے علماء و مشائخ اور اولی الامر کی ذمہ داری سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ وہ صرف اپنے ہی اعمال کے جواب دہ نہیں ہیں بلکہ پوری قوم کے اعمال کی جواب دہی بھی ایک بڑی حد تک ان پر عائد ہوتی ہے۔ ظالم جفاکار اور عیش پسند امراء اور ایسے امراء کی خوشامدیں کرنے والے علماء و مشائخ کا تو خیر کتنا ہی کیا ہے ان کا جو کچھ حشر خدا کے ہاں ہوگا اس کے ذکر کی حاجت نہیں لیکن جو امراء اور علماء و مشائخ اپنے محلول اور اپنے گھروں اور اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کی داد دے رہے ہیں وہ بھی خدا کے ہاں جواب دہ ہی سے نہیں بچ سکتے کیونکہ جب ان کی قوم پر ہر طرف سے گمراہی اور بد اخلاقی کے طوفان اٹے چلے آ رہے ہوں تو ان کا کام یہ نہیں ہے کہ گوشوں میں سر جھکائے بیٹھے رہیں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ مرید میدان بن کر نکلیں اور جو کچھ زور و اثر اُٹھانے ان کو عطا کیا ہے اس کو کام میں لگ کر اس طوفان کا مقابلہ کریں۔ طوفان کو دور کر دینے کی ذمہ داری بلاشبہ ان پر نہیں مگر اس کے مقابلہ میں

اپنی پوری امکانی قوت صرف کرنے کی ذمہ داری تو یقیناً ان پر ہے۔ اگر وہ اس میں دریغ کریں گے تو ان کی عبادت و ریاضت اور شخصی پرہیزگاری ان کو یومِ نفصل کی جواب دہی سے بری نہ کرے گی۔ آپ محکمہ صفائی کے اس افسر کو کبھی بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے جس کا حال یہ ہو کہ شہر میں تو دو پا پھیل رہی ہو اور ہزاروں آدمی ہلاک ہو رہے ہوں مگر وہ اپنے گھر میں بیٹھا خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کی تدبیر کر رہا ہو۔ عام شہری اگر ایسا کریں تو چنداں قابلِ اعتراض نہیں لیکن محکمہ صفائی کا افسر ایسا کرے تو اس کے مجرم ہونے میں شک نہیں کیا جاسکتا۔

ترجمانِ لہستان - ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ - مارچ ۱۹۳۵ء

## ایمان اور اطاعت

اجتماعی نظم خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو اور کسی غرض و غایت کے لئے ہو، اپنے قیام و استحکام اور اپنی کامیابی کے لئے دو چیزوں کا ہمیشہ محتاج ہوتا ہے، ایک یہ کہ جن ہولوں پر کسی جماعت کی تنظیم کی گئی ہو وہ اس پوری جماعت اور اس کے ہر ہر فرد کے دل و دماغ میں خوب بیٹھے ہوئے ہوں اور جماعت کا ہر فرد ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ جماعت میں سمع و طاعت کا مادہ موجود ہو، یعنی اس نے جس کسی کو اپنا صاحبِ امر تسلیم کیا ہو، اس کے احکام کی پوری طرح اطاعت کرے، اس کے مقرر کئے ہوئے ضوابط کی سختی کے ساتھ پابند رہے اور اس کے حدود سے تجاوز نہ کرے۔ یہ ہر نظام کی کامیابی کے لئے ناگزیر شرطیں ہیں۔ کوئی نظام خواہ وہ نظام عسکری ہو یا نظام سیاسی یا نظام عمرانی، یا نظام دینی، ان نوبل مشعوذ کے بغیر قائم ہو سکتا ہے نہ باقی رہ سکتا ہے اور نہ اپنے مقصد کو پہنچ سکتا ہے۔

دنیا کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے، آپ کو ایک مثال بھی ایسی نہیں ملے گی کہ کوئی تحریک تھروئے منافق، تافران اور غیر مطیع پیروں کے ساتھ کامیاب ہوئی ہو یا بدیرہ آخر چل سکی ہو۔ تاریخ کے صفحات میں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ خود اپنے گرد پیش کی دنیا ہی پر ایک نظر ڈال لیجئے، آپ اس فوج کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جو اپنی سلطنت کی دفاع اور اپنے سالار لشکر کی مطیع فرمان نہ رہے جس کے سپاہی فوجی ضوابط کی پابندی سے انکار کریں، پریڈ کا بجل نہجے تو کوئی سپاہی اپنی جگہ سے نہ ہلے، کمانڈر کوئی حکم دے تو سپاہی سنی اُن کی کرجائیں؟ کیا آپ سپاہیوں کے ایسے انہوہ کو فوج ٹکھہ سکتے ہیں؟ کیا آپ امید کر سکتے ہیں کہ ایسی بن سری فوج کسی جنگ میں کامیاب ہوگی؟ آپ اس سلطنت کے متعلق کیا کہتے ہیں جس کی رعایا میں قانون کا

احترام باقی نہ ہے جس کے قوانین علی الاعلان توڑے جائیں جس کے محکموں میں کسی قسم کا ضبط و نظم باقی نہ رہے جس کے کارکن اپنے مقتدر اعلیٰ کے احکام بجا لانا چھوڑ دیں؟ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی رعایا اور ایسے عمال ساتھ کوئی سلطنت دنیا میں قائم رہ سکتی ہے؟ آج آپ کی آنکھوں کے سامنے جرمنی اور اٹلی کی مثالیں موجود ہیں ہٹلر اور موسولینی نے جو عظیم شان و طاقت حاصل کی ہے تمام دنیا اس کی معترف ہے۔ مگر کچھ معلوم بھی ہے کہ اس کامیابی کے حساب کیا ہیں؟ وہی دو، یعنی ایمان اور اطاعت امر نازی اور فاشست جماعتیں ہرگز اتنی طاقت و راہنمائی کا مایاب نہیں ہو سکتی تھیں اگر وہ اپنے اصولوں پر اتنا پختہ اعتقاد نہ رکھتیں اور اپنے لیڈروں کی اس قدر سختی کے ساتھ مطیع نہ ہوتیں۔

یہ قاعدہ کلیہ ایسا ہے جس میں کوئی استثناء نہیں۔ ایمان اور اطاعت دراصل نظم کی جان ہے۔ ایمان جتنا راسخ ہوگا اور اطاعت جتنی کامل ہوگی، نظم اتنا ہی مضبوط اور طاقتور ہوگا اور اپنے مقاصد تک پہنچنے میں اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا۔ بخلاف اس کے ایمان میں جتنا ضعف اور اطاعت جتنا انحراف ہوگا، اسی قدر نظم کمزور ہوگا اور اسی نسبت سے وہ اپنے مقاصد تک پہنچنے میں ناکام رہے گا۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی عبادت میں نفاق، بدعتیہ گئی، انتشار خیال، خود سری، نافرمانی اور بے ضابطگی کے امراض پھیل جائیں اور پھر بھی اس میں نظم باقی رہے اور وہ کسی شبہ حیات میں زرقی کی طرف روانہ نظر آئے۔ یہ دونوں حالتیں ایک دوسرے کی نقیض ہیں؟ یقیناً جیسے آباد ہوئی ہے اس وقت سے آج تک ان دونوں کا کبھی اجتماع نہیں ہوا۔ اور اگر قانون فطرت اٹل ہے تو اس قانون کی یہ دفعہ بھی اٹل ہے کہ یہ دونوں حالتیں کبھی یکجا جمع نہیں ہو سکتیں۔ اب ذرا اس قوم کی حالت پر نظر ڈالئے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ نفاق اور بدعتیہ گئی کی کوئی قسم ایسی ہے جس کا ان ان نعت کر سکتا ہو اور وہ قانون میں موجود نہ ہو۔ اسلامی جماعت کے نظام میں لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے ناواقف ہیں اور اب تک جاہلیت کے عقائد پر جمے ہوئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اسلام کے اساسی اصولوں میں شک رکھتے ہیں اور کدک کی علامت تبلیغ

کہتے ہیں وہ بھی ہیں جو علی الاعلان انکار کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اسلامی عقائد اور شرع کا کھلم کھلا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو علانیہ مذہب اور مذہبیت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کی تعلیمات کے مقابلہ میں کفار سے حاصل کیے ہوئے تخیلات و افکار کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو خدا و رسول کے قانون پر جاہلیت کے رسوم یا کفار کے قوانین کو مقدم رکھتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو خدا و رسول کے شمول کو خوش کرنے کے لئے شعار اسلام کی توہین کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اپنے چھوٹے سے چھوٹے فائدے کی خاطر اسلام کے مصالح کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے کے لئے آادہ ہو جاتے ہیں جو اسلام کے مقابلہ میں کفر کا ساتھ دیتے ہیں، اسلامی اغراض کے خلاف کفار کی خدمت کرتے ہیں اور اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ان کو اتنا بھی عزیز نہیں کہ اس کی خاطر وہ ایک بال برابر بھی نقصان گوارا کر سکیں۔ راسخ الایمان اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کی ایک نہایت ہی قلیل جماعت کو چھوڑ کر اس قوم کی بہت بڑی اکثریت اسی قسم کے منافق اور فاسد العقیدہ لوگوں پر مشتمل ہے۔

یہ تو تھا ایمان کا حال۔ اب سمع و طاعت کا حال دیکھیے۔ آپ مسلمانوں کی کسی سستی میں چلے جایئے۔ آپ کو عجیب نقشہ نظر آئے گا۔ اذان ہوتی ہے مگر بہت سے مسلمان یہ بھی محسوس نہیں کرتے کہ مؤذن کس کو بلا رہا ہے اور کس چیز کے لیے بلا رہا ہے۔ نماز کا وقت آتا ہے اور گزر جاتا ہے مگر ایک قلیل عبادت کے سوا کوئی مسلمان اپنے کاروبار یا لہو و لعب کو یا خدا کے لیے نہیں چھوڑتا۔ رمضان کا زمانہ آتا ہے تو بعض مسلمانوں کے گھروں میں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ بہت سے مسلمان علانیہ کھاتے پیتے ہیں اور اپنے روزہ نہ رکھنے پر ذرہ برابر نہیں شرماتے، بلکہ بس چلتا ہے تو الٹا روزہ رکھنے والوں کو شرم دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جو لوگ روزہ رکھتے بھی ہیں ان میں سے بھی بہت کم ہیں جو احساس فرض کے ساتھ ایسا کرتے ہیں اور نہ کوئی محض رسم وادارہ کے لیے کوئی مہمت کے لیے مجبذ سمجھ کر رکھتا ہے اور کوئی روزہ رکھ کر وہ سب کچھ کرتا ہے جس سے خدا اور اس کے رسول نے منع

کیلئے زکوٰۃ اور حج کی پابندی اس سے بھی کم تر ہے۔ حلال اور حرام، پاک اور ناپاک کا امتیاز تو مسلمانوں میں سے اٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ کون سی چیز ہے جس کو خدا اور رسول نے منع کیا ہو اور مسلمان اس کو اپنے لیے مباح نہ کر لیتے ہوں۔ وہ کون سی حد ہے جو خدا اور رسول نے مقرر کی ہو اور مسلمان اس سے تجاوز نہ کرتے ہوں؟ کون سا ضابطہ ہے جو خدا اور رسول نے قائم کیا ہو اور مسلمان اس کو نہ توڑتے ہوں۔ اگر مردم شماری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمان کروڑوں ہیں، مگر ان کروڑوں میں دیکھیے کہ کتنے فی صدی نہیں کتنے فی ہزار بلکہ کتنے فی لاکھ خدا اور رسول کے احکام کو ماننے والے اور اسلامی ضوابط کی پابندی کرنے والے ہیں۔

جس قوم میں منافقت اور ضعف اعتقاد کا مرض عام ہو جائے جس قوم میں فحش کا احساس باقی نہ رہے جس قوم سے صبح و طاعت اور ضابطہ کی پابندی اٹھ جائے اس کا جو کچھ انجام ہونا چاہیے ٹھیک وہی انجام مسلمانوں کا ہونا ہے اور ہورہا ہے۔ آج مسلمان تمام دنیا میں محکوم و مغلوب ہیں۔ جہاں انکی اپنی حکومت موجود نہ ہو وہاں بھی وہ غیر روکے اخلاقی و ذہنی اور مادی تسلط سے آزاد نہیں ہیں۔ جہالت نفسی و رستہ عالی میں وہ ضرب المثل ہیں۔ اخلاقی لیبٹی نے ان کو حد درجہ ذلیل کر دیا ہے۔ امانت، صداقت اور وفائے عہد کی صفات جن کے لیے وہ کبھی دنیا میں ممتاز تھے اب ان سے دوسروں کی طرف منتقل ہو چکی ہیں اور انکی جگہ خیانت، جھوٹ، دغا اور بد مبالغہ نے لے لی ہے تقویٰ پرہیز گاری اور پاکیزگی اخلاق سے وہ عاری ہوتے جاتے ہیں۔ جماعتی غیرت و حمیت روز بروز ان سے مفقود ہوتی جاتی رہے کسی قسم کا نظم ان میں باقی نہیں رہا ہے۔ آپس میں ان کے دل پھٹے چلے جاتے ہیں انکی مشترک غرض کے لیے مل کر کام کرنے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی ہے۔ وہ غیروں کی نگاہوں میں ذلیل ہو گئے ہیں۔ قوموں پر سے ان کا اعتماد اٹھ گیا ہے اور اٹھنا جارہا ہے۔ ان کی قومی اور اجتماعی قوت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی قومی تہذیب و شائستگی ناپا ہوئی چلی جارہی ہے۔ اپنے حقوق کی وادعت اور اپنے شرف قومی کی حفاظت سے وہ عاجز ہوتے جا رہے ہیں۔ باوجودیکہ تعلیم ان میں بڑھ رہی ہو گز کویت اور پوسٹ گز کویت اور یورپ کے تعلیم یافتہ حضرات کا اضافہ ہو رہا ہے، بلکوں میں بہت سے لوگ

موٹوں پر چڑھنے والے سوٹ پہننے والے بٹے بٹے ناموں یاد کیے جانے والے بڑی سرکاروں میں سر فرانیہ پانے والے ان میں روز بروز بڑھتے جاتے ہیں لیکن جن اعلیٰ اخلاقی اوصاف کے وہ پہلے متصف تھے اب ان سے عاری ہیں اپنی ہمسایہ قوموں پر انکی جو ساکھ اور دھاک پہلے تھی وہ اب نہیں ہے جو عزت وہ پہلے رکھتے تھے وہ اب نہیں رکھتے جو اجتماعی قوت طاقت ان میں پہلے تھی وہ اب نہیں ہے اور اسلئے اس بھی زیادہ خراب نظر آتے ہیں۔

کوئی مذہب یا تہذیب یا کسی قسم کا نظام جماعت جو اس کے تعلق دہی طرز عمل انسان کے لیے معقول ہو سکتے ہیں اگر وہ اس میں اخل ہو تو اس کے اساسی اصول پر پورا پورا اعتقاد رکھے اور اس کے قانون ضابطہ کی پوری پوری پابندی کرے! ورنہ ایسا نہیں کر سکتا تو اس میں اخل نہ ہو یا ہو چکا ہے تو بلا اعلان اس میں سے نکل جائے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت معقول نہیں ہے۔ اس سے زیادہ نامعقول کوئی طرز عمل نہیں ہو سکتا کہ تم ایک نظام میں شریک بھی ہو اس کے ایک جز بھی بن کر رہو اس نظام کے تابع ہونے کا دعویٰ بھی کرو اور پھر اس کے اساسی اصول سے کلاً یا جزاً انحراف بھی کرو اس کے قانون کی خلاف ورزی بھی کرو اپنے آپ کو اس کے آداب اور اس کے ضوابط کی پابندی مستثنیٰ بھی کر لو۔ اس طرز عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم میں منافقانہ خصائل پیدا ہوں خلوص نیت سے تمہارے دل خالی ہو جائیں تمہارے قلوب میں کسی مقصد کے لیے گرم جوشی اور رسوخ عزم نہ پیدا ہو سکے ذوق شناسکی اتباع قانون اور باضابطگی کے اوصاف و تم عاری ہو جاؤ اور تم میں یہ صلاحیت باقی نہ رہے کہ کسی نظام جماعت کے کارآمد رکن بن سکو۔ ان کمزوریوں اور یزیدین عجیب کے ساتھ تم جس جماعت میں بھی شریک ہو گے اس کے لیے کلفت بجاؤ گے جس نظام میں بھی داخل ہو گے اسے درہم برہم کر دو گے جس تہذیب کے بسم میں داخل ہو گے اس کیلئے جہاد کے جراثیم ثابت ہو گے جس مذہب کے پیرو ہو گے اس کو مسخ کر کے چھوڑ دو گے ان اوصاف کے ساتھ تمہارے مسلمان ہونے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ جس گروہ کے اصولوں پر تمہارا دل ٹھکے اور جس گروہ کے طریقوں کی تم پوری طرح پیروی کر سکو اس میں جا شامل ہو۔ منافق مسلمان کے وہ کافر بہتر ہیں جو اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے دل سے معتقد ہوں اور اس کے ضوابط کی پابندی کریں۔

جو لوگ مسلمانوں کے مرض کا علاج تعلیم مغربی اور تہذیب جدید اور اقتصادیات کی اصلاح اور سیاسی حقوق کے حصول کو سمجھتے تھے وہ فعلی پر تھے اور اب بھی جو ایسا سمجھتے ہیں وہ فعلی کرتے ہیں۔ بخدا اگر مسلمانوں کا ہر ذہنی لئے اور پی ایچ ڈی اور بیسٹر ہو جائے، دولت و ثروت سے مالا مال ہو، مغربی فیشن سے از سر تا پیرا آ رہے ہو، اور حکومت کے تمام اہم دے اور کونسلوں کی تمام نشستیں مسلمانوں ہی کو مل جائیں، مگر ان کے دل میں نفاق کا مرض ہو، وہ فرض کو فرض نہ سمجھیں، وہ نافرمانی، سرکشی اور بے منابہلی کے خوگر ہوں، تو ایسی پستی اور ذلت اور کمزوری میں وہ اُس وقت بھی مبتلا رہیں گے جس میں آج مبتلا ہیں، تعلیم، فیشن، دولت و حکومت کوئی چیز ان کو اس گڑھے سے نہیں نکال سکتی، تبص میں وہ اپنی سیرت اور اپنے اخلاق کی ان بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے گر گئے ہیں۔ اگر ترقی کرنی ہو اور ایک طاقتور باعزت جماعت بننا ہے تو سب سے پہلے مسلمانوں میں ایمان اور اطاعت کے اوصاف پیدا کر دو کہ اس بغیر نہ تہا ہے افراد میں کس بل پیدا ہو سکتا ہے نہ تمہاری جماعت میں نظم پیدا ہو سکتا ہے اور نہ تمہاری اجتماعی قوت اتنی زبردست ہو سکتی ہے کہ تم دنیا میں سر بلند ہو سکو۔ ایک منتشر جماعت جس کے افراد کی اخلاقی اور معنوی حالت خراب ہو، کبھی اس قابل نہیں ہو سکتی کہ دنیا کی منظم اور مضبوط قوموں کے مقابلہ میں سرٹھاکے بھونس کے پولوں کا انبار خواہ کتنا ہی بڑا ہو کبھی قلعہ نہیں بن سکتا۔

اصلاح اور مسلمانوں کے بدترین دشمن وہ ہیں جو مسلمانوں میں عقیدگی اور نافرمانی پھیلاتے ہیں۔ یہ منافقوں کی سب سے زیادہ بُری قسم ہے، جو کچھ وہ مسلمان کیلئے حربی کا فروں بھی زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ باہر سے حملہ نہیں کرتے بلکہ گھر میں بیٹھ کر اندر ہی اندر ڈانٹنا مارنا پھینکتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کو دین و دنیا دونوں میں سوا کرنا چاہتے ہیں۔ وہی لوگ ہیں جن کو متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وہ تمہیں بھی ای طرح کا فریادنا چاہتی ہیں جس طرح وہ خود ہو گئے ہیں۔ وَدُّوا أَنْ تُكْفِرُوا لَمْ يَكُنْ لَهُمْ دِينٌ سِوَاكَ۔ ان کے شر سے بچنے کی تم سے کم تدبیر یہ ہے کہ جو لوگ مل میں مسلمان بننا چاہتی ہیں ان سے قطع تعلق کر لیں۔ فَلَا تَقْرَبُوا أَهْلَهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا أَهْلَهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا أَهْلَهُمْ۔ ورنہ قرآن مجید تو یہی آخری سزا یہ قرار دے کر ان جنگ کیجئے۔ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوا وَهُمْ دَاكِرٌ لَّهُمْ حَبِطَتْ وَجْهٌ مُنْمُوهُمْ +

(ترجمان مفسرین - رمضان ۱۴۲۵ھ - دسمبر ۲۰۰۳ء)

## ”مسلمان“ کا حقیقی مفہوم

ہماری روزمرہ کی بول چال میں بعض ایسے الفاظ اور فقرے رائج ہیں جن کو بولتا تو ہر شخص ہے، مگر سمجھتے بہت کم ہیں۔ کثرت استعمال نے ان کا ایک اجمالی مفہوم لوگوں کے ذہن نشین کر دیا ہے، بولنے والا ان الفاظ کو زبان سے نکالتا ہے تو وہی مفہوم ملا لیتا ہے اور سننے والا جب انہیں سنتا ہے تو اسی مفہوم کو سمجھتا ہے، لیکن وہ گہرے معانی جن کے لیے واضع نے ان الفاظ کو وضع کیا تھا، بھلا تو درکنار لپٹے خانے پٹھے کئے لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہوتے۔

مثال کے طور پر لفظ ”اسلام“ اور ”مسلمان“ کو لیجیے۔ کس قدر کثرت سے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں اور کتنی ہمہ گیری کے ساتھ انہوں نے ہماری زبانوں پر قبضہ کر لیا ہے؟ مگر کتنے بولنے والے ہیں جو ان کو سوچ سمجھ کر بولتے ہیں؟ اور کتنے سننے والے ہیں جو انہیں سن کر وہی مفہوم سمجھتے ہیں جس کے لیے یہ الفاظ وضع کیے گئے ہیں؟ غیر مسلموں کو جانے دیجئے۔ خود مسلمانوں میں ۹۹ فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ آدمی ایسے ہیں جو اپنے آپ کو ”مسلمان“ کہتے اور اپنے مذہب کو ”اسلام“ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، مگر نہیں جانتے کہ ”مسلمان“ بھوننے کے معنی کیا ہیں اور لفظ ”اسلام“ کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ آئیے آج تھوڑا سا وقت ہم انہیں الفاظ کی تشریح میں صرف کر دیتے، عقائد اور عمل کے لحاظ سے اگر آپ لوگوں کے احوال پر نگاہ ڈالیں گے تو عموماً تین قسم کے لوگ آپ کو ملیں گے :-

ایک قسم ان لوگوں کی جو علانیہ آزادی رائے اور آزادی عمل کے قائل ہیں۔ ہر معاملہ میں خود اپنی رائے پر اصرار کرتے ہیں۔ صرف اپنی عقل کے فیصلوں کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اور وہی طریق کار اختیار کرتے ہیں جو ان کے

اپنے خیال میں صحیح ہوتا ہے کسی مذہب کی پیروی سے ان کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

دوسری قسم ان لوگوں کی جو بظاہر کسی مذہب کو مانتے ہیں مگر حقیقت میں پیروی اپنے ہی خیالات کی کرتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد اور قوانین عمل کے لیے مذہب کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ خود اپنی طبیعت کے رجحان یا دلچسپی یا اغراض و حاجات کے لحاظ سے کچھ عقائد اپنے ذہن میں جمالیاتے ہیں عمل کے کچھ طو طریقے اختیار کر لیتے ہیں اور پھر کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کو ان کے مطابق ڈھال لیں۔ گویا حقیقت وہ مذہب کے پیرو نہیں ہوتے، بلکہ مذہب ان کا پیرو ہوتا ہے۔

تیسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو خود اپنی سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔ اپنی عقل کو محفل رکھتے ہیں اور انکھیں بند کر کے دوسروں کی تقلید کرتے گئے ہیں خواہ وہ ان کے باپ دادا یا ان کے ہم عصر۔

پہلا گروہ آزادی کے نام پر مرتا ہے مگر نہیں جانتا کہ اس کے صحیح حدود کیا ہیں؟ فکر و عمل کی آزادی بلاشبہ ایک حد تک صحیح ہے مگر جب وہ اپنی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو گمراہی بن جاتی ہے۔ جو شخص ہر معاملہ میں صرف اپنی رائے پر اکتفا کرتا ہے ہر مسئلے میں صرف اپنی عقل کو حکم بناتا ہے وہ اصل غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کے علم اور اس کی عقل نے دنیا بھر کے تمام امور کا احاطہ کر لیا ہے۔ کوئی حقیقت اور مصلحت اسکی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ ہر منزل کی راہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ باخبر ہے ہر مسئلہ کی پیدگیوں کا علم ہو کر رہنے کی انتہا کو بھی وہ اسی طرح جانتا ہے جس طرح اسکی ابتدا کو۔ یہ علم اور ہوشمندی کا زعم و حقیقت ایک زعمِ ہلکا ہے اور اگر انسان صحیح منہل میں خود اپنی عقل کو حکم بنائے تو خود عقل ہی یہ کہہ دیگی کہ میرا اندھا منہ کچھ کوجن مہاتما سے متصف سمجھتا ہے ان سے میں حقیقتہً متصف نہیں ہوں۔ مجھ کو اپنا واحد رہنما سمجھنے والا صرف میری رہنمائی میں تنہا کی راہ طے کرنے والا، ٹھوکر دوں لغزشوں گرا ہوں اور ہلاکتوں کی کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

اس قسم کی حریتِ فرد و عمل تمدن و تہذیب کے لیے بھی ہلکا ہے۔ حریت کا اتقنا یہ ہے کہ ہر شخص وہی عقائد رکھے جو خود اس کے اپنے خیال میں صحیح ہو اور اسی راہ پر چلے جو اس کی اپنی عقل کے مطابق

درست ہو۔ تمدن و تہذیب کا اقتضایہ ہے کہ ایک نظام تمدن میں جتنے لوگ ہوں سب چند بنیادی عقائد و افکار میں متفق ہوں اپنی علمی زندگی میں ان مخصوص اطوار و آداب و قوانین کی پیروی کریں جو حیات اجتماعی کی تنظیم کے لئے مقرر کر دیے گئے ہیں۔ پس حریتِ فکر و عمل اور تمدن و تہذیب میں کھلی ہوئی منافات ہے۔ حریتِ افراد میں خود مری بے قیدی اور انارکھی پیدا کرتی ہے۔ تمدن اُن سے اتباعِ پیروی اور تسلیم و اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ بھالِ کامل حریت ہوگی وہاں تمدن نہ ہوگا۔ اور جہاں تمدن ہوگا وہاں افراد کو ایک بڑی حد تک حریتِ فکر و عمل سے دست کش ہونا پڑے گا۔

دوسرے گروہ کا حال پہلے گروہ سے زیادہ بُرا ہے۔ پہلا گروہ صرف گمراہ ہے۔ دوسرا گروہ اس کے ساتھ جھوٹا منافق، دھوکہ باز اور بد طبیعت بھی ہے۔ اگر تاویل کے جائز حدود میں رہ کر ایک شخص اپنے مذہب اور اپنے خیالات و رجحانات میں موافقت پیدا کر سکتا ہو تو حریتِ فکر و عمل کے ساتھ مذہب کا اتباع ممکن ہے اگر انسان کے اپنے رجحانات مذہب کے خلاف ہوں اور اس کے باوجود وہ مذہب کے صحیح اور اپنے رجحانات کو غلط سمجھتا ہو تب بھی ایک حد تک اس کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا کہ وہ واقعی اس مذہب کو ماننا ہے جس کی پیروی کا وہ دعویٰ کر رہا ہے لیکن اگر مذہب کی واضح تعلیمات سے اس کے عقائد و اعمال مرتباً مختلف ہوں اور وہ اپنے خیالات کو صحیح اور مذہب کی تعلیم کو غلط سمجھتا ہو اور پھر وہ اپنے آپ کو مذہب کے دائرے میں شامل رکھنے کے لئے مذہبی تعلیمات کو اپنے خیالات اور طور طریقوں کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرے تو ایسے شخص کو ہم کو دُن نہیں کہیں گے کیونکہ کو دُن سے اتنی ہوشیاری کا کام کہاں بن آتا ہے؟ ہمیں مجبوراً اس کو بے ایمان کہنا پڑے گا۔ ہم یہ سمجھتے پر محمور ہوں گے کہ اس میں مذہب سے علانیہ بغاوت کرنے کے لیے کافی عقلی جرأت نہیں ہے اس لیے وہ منافقت کی راہ سے مذہب کا پیروں بنتا ہے۔ ورنہ کون سی چیز اس کے لئے ایک ایسے مذہب کو چھوڑ دینے میں مانع ہے جس کی تعلیمات اس کی عقل کے فیصلوں کے خلاف ہیں اس کے حقیقی افکار و عقائد کی ضد و واقع ہوئی ہیں اور اسے ان طریقوں پر چلنے سے روکتی ہیں جن پر وہ سچے دل سے چلنا

چاہتا ہے اور واقع میں چل بھی رہا ہے ؟

تیسرا گروہ اپنے مرتبہ عقلی کے لحاظ سے سب سے زیادہ فروتر ہے۔ پہلے دونوں گروہوں کی عقلی توجہ کہ عقل سے اتنا کام لیتے ہیں جتنا وہ نہیں کر سکتی۔ اور اس گروہ کی غلطی یہ ہے کہ برسرِ عقل سے کام ہی نہیں لیتا یا لیتا ہے تو اتنا کم کہ نہ لینے کے برابر۔ ایک صاحبِ عقل انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی عقیدہ کا مستعد ہو اور اس عقیدہ کے حق میں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی دلیل نہ ہو کہ اس کے باپ ادا بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے یا فلاں قوم جو بڑی ترقی یافتہ ہے وہ بھی اسی عقیدہ کی مستعد ہے ؟ اسی طرح جو شخص اپنے دینی یا دنیاوی معاملات میں بعض طریقوں کی صرف اس لئے پیروی کرتا ہو کہ باپِ ادلہ ہی طریقے چلے آئے ہیں یا بعض طریقوں کو صرف اس بنا پر اختیار کرتا ہو کہ اس کے عہد کی غالب قوموں میں وہی طریقے رائج ہیں وہ دراصل اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ خود اس کے جیسے میں مانع اور مانع میں سوچنے کی قابلیت نہیں ہے۔ اس کے پاس خود کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس سے وہ صحیح اور غلط میں تیز کر سکتا ہو۔ اتفاقاً وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہو گیا اس لیے ہندو مذہب کو صحیح سمجھتا ہے۔ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوتا تو اسلام کو برحق مانتا۔ اگر عیسائی کی اولاد ہوتا تو عیسائیت پر جان دیتا۔ اسی طرح یہ بھی اتفاق ہے کہ اس کے ہمد میں فرنگی قومیں برسرِ اقتدار ہیں اس لیے وہ فرنگی طور طریقوں کو معیارِ تہذیب سمجھتا ہے۔ اگر چینی برسرِ اقتدار ہوتے تو یقیناً اس کے نزدیک چینی طور طریقے معیارِ تہذیب ہوتے اور اگر آج دنیا پر افریقہ کے حبشیوں کا تسلط ہو جائے تو کوئی شک نہیں کہ یہ خفیف العقل انسانِ جنسیت کو انسانیت کا عطر سمجھنے لگا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لئے یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ بزرگوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے یا دنیا میں آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دنیا میں تو پہلے بھی حماقتیں ہوتی ہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ ہمارا کام ان حماقتوں کی انحصار دھند پیروی کرنا نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ انکھیر

بند کر کے قدم یا جدید زمانے کے ہر طریقے کی پیروی کرنے لگیں۔ ہر ردہ رو کے واسطے اس باندھ کر چل کھڑے ہوں خواہ وہ کانٹوں کی طرف جارہا ہو یا خندق کی طرف ہمیں خدا نے عقل اسی لئے دی ہے کہ دنیا کے اچھے اور بُرے میں تمیز کریں کھوٹے اور کھڑے کو پرکھ کر دیکھیں کسی کو مسہم بنانے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لیں کہ وہ کدھر لیجانے والا ہے۔

اسلام ان تینوں گروہوں کو غلط کار ٹھہراتا ہے:

پہلے گروہ کے متعلق وہ کتاب ہے کہ نہ تو یہ لوگ کسی روشنی ٹلے کو مادی وسوسہ مانتے ہیں نہ ان کے پاس خود ہی حق کا نور ہے کہ اس کے اُجاب میں راہ ملے کریں۔ انکی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو اندھیرے میں شخص امانتے اور اٹکل سے چل رہا ہو، ممکن ہے کہ کہیں سیدھے رستے چلے اور ممکن ہے کہ کہیں گڑھے میں جا پڑے، اس لئے کہ اندازہ کوئی یقینی چیز نہیں ہے اس میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے، بلکہ زیادہ تر امکان غلطی ہی کا ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۚ إِنَّ يَلْبِغُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۚ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْدَعُونَ (یونس - ۷)

جو لوگ خدا کے سوا دوسروں کو خدا کی کا حصہ اور ٹھہراتے اور ان کو پکارتے ہیں جتنے ہو کہ وہ کس چیز کے پیرو ہیں وہ وہ فرق گمان کے بڑے ہیں اور محض امانتے پر چلتے ہیں۔

وہ محض گمان پر چلتے ہیں اور گمان کا حال یہ ہے کہ وہ حق کی ہدایت سے ذرہ بابر بھی بے نیاز نہیں کرتا۔

وَمَا يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۚ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْدَعُونَ (البقرہ - ۱۷۰)

وہ گمان اور اپنے نفس کی خواہشات کے سوا کسی اور چیز کی پیروی نہیں کرتے حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف ہدایت پہنچی ہے کیا انسان کو وہی چیز حق ہے جسکی وہ تمنا کرے؟

أَفَرَأَيْتَ مِمَّنْ أَخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَمَّا لِلنَّاسِ مَتَاعِي (البقرہ - ۱۷۱)

کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنے نفس کی خواہشات کو اپنا خدا بنا لیا؟ یا جو جو دیکھ وہ علم رکھتا ہے مگر اس لئے گمراہ کہ

وَأَمَّا لِلنَّاسِ مَتَاعِي وَخَلَقَ عَلَيَّ سَمْعَهُ

وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ غَشَاوَةً فَمَنْ يَهْدِيهِ اللَّهُ فَبَدِّدْهُ (الباقیہ - ۳)

دیا اس کا تون اور اس کے دل پر گھلا دی اس کی آنکھوں پر وہ ڈال یا باب اللہ کے بعد کون ہی جو سکی رہنا ہی کر گیا اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہو گا جس نے اللہ کی ہدایت کے بجائے اپنے نفس کی خواہش کی پیروی کی؟ ایسے ظالم الظالمین (انقص - ۵)

لوگوں کو امد بھی ہدایت نہیں دیتا۔

نزل قرآن کے زمانے میں دوسرے گروہ کے نمائندے بنی اسرائیل تھے۔ اپنے آپ کو موسیٰ و متبع تورا کہا کرتے تھے۔ مگر عقائد اور معاملات میں اکثر و بیش تر موسیٰ علیہ السلام کے طریقے اور تورا کی تعلیم کے خلاف تھے۔ اس پر لطف یہ تھا کہ اپنے اس خلاف بردار نام بھی نہ تھے۔ بجائے اس کے کہ اپنے خیالات اور اعمال کو تورا کے مطابق ڈھالتے وہ تورا کے بنی غلطی و معنوی تحریفیں کر کے اس کو اپنے اذکار و اعمال کے مطابق ڈھال لیا کرتے تھے۔ تورا کی اصلی تعلیمات کو چھپا کر اپنے خیالات کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ گویا وہی اصل تورا کی تعلیمات ہیں۔ خدا کے جو بندے انہیں اس گمراہی پر متنبہ کرتے اور ان کی خواہشات کے خلاف کلام الہی کے اتباع کی دعوت دیتے تھے ان کو وہ گالیاں دیتے، جھوٹا قرار دیتے، حتیٰ کہ قتل تک کر دیتے تھے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے :-

يُحْزِنُونَ الْكَلِمَةَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَ نَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطْلُمُ عَلَىٰ خَائِفَةٍ مِنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ (المائدہ - ۳)

وہ الفاظ کو اپنے مواقع سے بچھڑاتے ہیں اور انہوں نے بہت سی ان نصیحتوں کو بھلا دیا ہے جو انہیں کی گئی تھیں۔ متبع براہ ان کی کسی نہ کسی چوری کی طرح مٹی رہتی ہے اس خیانت سے ان کے بہت کم آدمی بچے ہوئے ہیں۔

يَا هَلْ أَكْتَبَ لِيَوْمَ تَلْسُونُ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْمُونَ الْحَقَّ وَ أَنْتُمْ تَعْمُونَ (الاعلان - ۷)

اے اہل کتاب تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو اور کیوں جانتے ہو جیسے حق پر پردہ ڈالتے ہو؟

كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ  
أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ

(المائدہ : ۱۰)

جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ایسا پیغام لے کر آیا جو  
ان کے نفس کی خواہش کے مطابق نہ تھا، تو کسی کو انہوں  
نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا۔

اور پھر ان سے صاف کہہ دیتا ہے :-

لَسْمٌ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ  
وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ

(المائدہ : ۱۰)

تم ہرگز راہِ راست پر نہیں ہوتا وقتیکہ تورات اور انجیل  
کو قائم نہ کرو اور اس کتاب کو نہ مانو جو تمہارے رب کے پاس  
سے تمہاری طرف اتاری گئی ہے (یعنی قرآن)

تیسرے گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے :-

وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ  
اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا  
أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا  
يَهْتَدُونَ

(البقرہ : ۲۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ اس ہدایت پر چلو جو اس نے اپنی  
ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم  
اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا وہ اپنے باپ دادا ہی کی پیروی  
کرنے کے لیے وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں اور راہِ راست پر نہ ہوں؟

وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا  
أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا  
دَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا۔ أَوَلَوْ كَانَ  
آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا  
يَهْتَدُونَ

(المائدہ : ۱۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اتاری  
ہے اور آؤ رسول کی طرف تو انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے  
وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا وہ  
طریقہ اس صورت میں بھی انکے لئے کافی ہے جبکہ ان کے باپ  
دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور راہِ راست پر نہ ہوں؟

وَلَا تَطْعَمُ أَكْثَرُ مَنْ فِي الْأَرْضِ  
يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ۔ إِنْ يَتَّبِعُونَ

اور اگر تو نے بہت سے ان لوگوں کی پیروی کی جن میں  
میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے رستے سے ہٹا دیں گے وہ

اَلَا الظَّنَّ وَاِنَّهُمْ اِلَّا يَخْضَعُونَ - تو غمن گمان پر چلتے ہیں اور ان کا طریقہ بالکل اٹکل

اور اندازہ پر ہے -

(انعام - ۱۴)

جو لوگ خود اپنی عقل و فہم سے کام نہیں لیتے، خود کھوٹے اور کھرے کو نہیں پرکھتے، آنکھیں بند کر کے دُوسروں کی تقلید کرتے ہیں، ان کو قرآن اندھا، گونگا، بہرا، بے عقل قرار دیتا ہے۔ صُمُّ بُكْمٌ عُمْیٰ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (البقرہ - ۲۱) اور انہیں جانوروں سے تشبیہ دیتا ہے بلکہ ان سے بھی بدتر کہ وہ جانور تو عقل رکھتا ہی نہیں اور وہ عقل رکھتے ہیں مگر اس سے کام نہیں لیتے۔ اُولَٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلٰی هُمْ اَضَلُّ اُولَٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ (اعراف: ۲۲)

ان تینوں گروہوں کو جن کے طریقہ افراط اور تفریط پر مبنی ہیں، رو کر دینے کے بعد قرآن ایسے گول کا ایک گروہ بنانا چاہتا ہے جو اعتدال اور توسط کی راہ پر ہوں، اُمَّةٌ وَّسَطٌ ہوں، قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ ہوں۔

یہ اعتدال اور توسط کی راہ کیا ہے؟ یہ کہ پہلے تم ان سب پروں کو چاک کر دو جو قدیم روایات اور جدید تعلیمات نے تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈال رکھے ہیں عقل سلیم کی صاف روشنی میں آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ کیا چیز حق ہے اور کیا چیز باطل؟ وہ ہر تہ صبح ہے یا خدا پرستی؟ توحید صبح ہے یا شرک؟ انسان راہ راست پر چلنے کے لیے خدا کی ہدایت کا محتاج ہے یا نہیں ہے؟ انبیاء علیہم السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے تھے یا معاذ اللہ جھوٹے؟ قرآن جس طریقہ کو پیش کرتا ہے وہ سیدھا ہے یا لٹکھا؟ اگر تمہارا دل کاٹھی دے کہ خدا کو ماتا انسانی فطرت کا عین حقیقی ہے اور خدا حقیقت میں ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے اگر تمہارا ضمیر تسلیم کرے کہ انسان پر مبنی اپنے کے لئے خدا کی بخشی ہوئی روشنی کا یقیناً خارج ہے اور یہ روشنی وہی ہے جو نوبع بشری کے سچے رہبر انبیاء علیہم السلام کے کوٹنے ہیں اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کو دیکھ کر تم کو یقین آجائے کہ اس اعلیٰ سیرت کا انسان ہرگز دنیا کو دھوکا نہیں دے سکتا اور انہوں نے جب

رسول خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو وہ ضرور اپنے دعوے میں سچے ہیں، اگر قرآن کا مطالعہ کر کے تمہاری عقل پر فیصلہ کر دے کہ انسان کے لیے اعتقادِ داوِعل کا سیدھا راستہ وہی ہے جو اس کتاب نے پیش کیا ہے اور یہ کتاب یقیناً کلامِ الہی ہے تو تمام دنیا کی ملامت و مخالفت سے بیخوف ہو کر ہر نقصان کے ڈر اور فائدے کے لالچ سے دل کو پاک کر کے اُس چیز پر ایمان لے آؤ جس کی صداقت پر تمہارا ضمیر گواہی دے رہا ہے۔

پھر جب تم نے عقلِ سلیم کی مدد سے حق اور باطل میں تمیز کر لی، اور باطل کو چھوڑ کر حق پر ایمان لے آئے، تو عقل کے امتحان اور اس کی تنقید کا کام ختم ہو گیا۔ ایمان لانے کے بعد فیصلہ کرنے اور حکم دینے کا اختیار عقل سے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی طرف منتقل ہو گیا۔ اب تمہارا کام فیصلہ کرنا نہیں بلکہ ہر اُس حکم کے آگے سر جھکا دینا ہے جو خدا اور اس کے رسول نے تم کو دیا ہے۔ تم اپنی عقل کو ان احکام کے سمجھنے، ان کی باریکیوں اور حکمتوں تک پہنچنے، اور ان کو اپنی زندگی کے جزئیات پر منطبق کرنے میں استعمال کر سکتے ہو مگر کسی حکمِ خداوندی میں چون و چرا کرنے کا حق تم کو نہیں ہے۔ خواہ کسی حکم کی مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے خواہ کوئی حکم تمہاری عقل کے معیار پر پورا اترے یا نہ اترے خواہ اس کا کوئی فیصلہ تمہیں اپنی ذہنی و فنی اغراض کے لحاظ سے مفید نظر آئے یا غیر مفید خواہ اس کا ارشاد اور رسول کا فرمان دنیا کے رسم و رواج اور طور طریقوں کے مطابق ہو یا منافی، تمہارا کام ہر حال اس کے آگے سر جھکا دینا ہے کیونکہ جب تم نے خدا کو خدا مان لیا، رسول کو خدا کا رسول تسلیم کر لیا اور یقین کر لیا کہ خدا کا رسول جو کچھ پیش کرتا ہے، خدا کی طرف سے پیش کرتا ہے، اپنے دل سے گھڑی ہوئی کوئی بات پیش نہیں کرتا (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ مُّبِينٌ) تو اس یقین و اذعان کا عقلی نتیجہ یہ ہے کہ تم خود اپنی عقل کے فیصلوں پر کتابِ امداد و سنتِ رسول اور اس کے فیصلوں کو ترجیح دو، اور جو عقائد یا امر و نہی کے کام خدا کی طرف سے خدا کے رسول نے بیان کئے ہیں، ان کو اپنی عقل، اپنے علم، اپنے تجربات یا دوسرے اہل دنیا کے افکار و اعمال کے معیار پر جانچنا چھوڑ دو۔ جو شخص کتاب ہے کہ میں مومن ہوں، اور پھر چون و چرا بھی کرتا ہے وہ اپنے قول کی

آپ تردید کرتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ ایمان اور چوں و چرا میں کھلا ہوا تضاد ہے اس کو نہیں معلوم کہ کون  
صرف ملتے اور اطاعت کرنے سے قائم ہوتا ہے چوں و چرا کا دوسرا نام اتاری ہے۔  
اسی اعتدال اور توسط کے طریقہ کا نام اسلام ہے اور جو گروہ اس دستہ پر چلتا ہو اس کا نام مسلم  
ہے۔

اسلام کے معنی انقیاد اطاعت اور تسلیم کے ہیں۔ اور مسلم وہ ہے جو حکم دینے والے کے امر اور منع کرنے والے  
کی نہی کو بلا اعتراض تسلیم کرے پس یہ نام خود ہی اس حقیقت کا پتہ دے رہا ہے کہ ان تینوں گروہوں اور ان کے  
طریقوں کو چھوڑ کر یہ چہ تھا گروہ ایک نئے مسلک کے ساتھ اسی لئے قائم کیا گیا ہے کہ یہ خدا اور رسول کے حکم کو مانے  
اور اس کے آگے سر جھکا دے۔ اس گروہ کا کام یہ نہیں ہے کہ ہر معاملے میں صرف اپنی عقل کی پیروی کرے نہ  
یہ ہے کہ احکام الہی میں سے جو کچھ اسکی اغراض کے مطابق ہو اس کو مانے اور جو اغراض کے خلاف ہو اس کو رد  
کرنے نہ یہ کہ کتاب اور سنت رسول کو چھوڑ کر انسانوں کی اندھی تقلید کرے خواہ وہ انسان مردہ ہوں یا زندہ۔  
اس باب میں قرآن مجید کی تصریحات بالکل صاف ہیں۔ وہ کتنا ہے کہ جب کسی معاملہ میں خدا اور رسول  
کا حکم آجائے تو مومنوں کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ  
إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ  
لَهُمْ خِيَرَةٌ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ  
اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا۔  
کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں کہ جب کسی معاملہ  
میں اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کرے تو ان کے لئے اپنے  
اس معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے جس نے  
اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی  
میں مبتلا ہو گیا۔ (الاحزاب - ۵)

وہ کتنا ہے کہ کتاب اللہ میں سے کچھ کو ماننا اور کچھ کو رد کر دینا دنیا و آخرت میں رسوا کن ہے۔  
اَمْؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَكَفَرُوا بِبَعْضٍ  
کیا تم کتاب کی بعض باتوں کو ملتے ہو اور بعض کو نہیں

بَعْضٍ، فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ  
الْآخِزِي فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ  
يُؤْذَنُ إِلَى آثَارِ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ  
عَمَّا تَعْمَلُونَ (البقرہ - ۱۰)

مانتے ہا تم میں سے جو کوئی ایسا کرتا ہے اکی ستر اجر اس کے  
اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کی رسوائی ہو، اور اس وقت  
میں ایسے لوگ شدید ترین عذاب کی طرف پھرتے جائیں گے  
جو کچھ تم کرتے ہو اور اس سے غافل نہیں ہے۔

وہ کتاب ہے کہ فیصلہ صرف کتاب الہی کے مطابق ہونا چاہئے، خواہ وہ لوگوں کی خواہشات کے  
مطابق ہو یا نہ ہو :-

فَأَحْكُمُوا بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا  
تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ -  
(المائدہ - ۶)

تو ان کے درمیان اسی کتاب کے مطابق فیصلہ کر جاؤ گے  
آئی ہے اور جو کچھ تیرے پاس حق تعالیٰ کی طرف سے  
آیا ہی اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

وہ کتاب ہے کہ جو شخص کتاب اللہ کے موافق فیصلہ نہیں کرتا وہ فاسق ہے۔ وَمَنْ كَفَرَ  
بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ اور یہ فیصلہ جو کتاب الہی کے خلاف ہے جاہلیت کا  
فیصلہ ہے۔ أَفَحُكْمُ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ۔

وہ کتاب ہے کہ اسے ایمان لانے والو! اور اس کے رسول اور اپنے ادلی الامر کی اطاعت کرو  
اور اگر تم حقیقت میں اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو تو جس کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع پیدا ہو  
اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ یہی بہتر طریقہ ہے۔ اور انجام کے اعتبار سے بھی یہی اچھا  
ہے کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تیری جانب  
بھیجی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے بھیجی گئی تھیں مگر چاہتے ہیں کہ خدا کے نافرمان انسان کو اپنے  
معاملہ میں حکم بنائیں حالانکہ انہیں اس کے چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں  
بھٹکا کر راہ راست سے دُور ہٹا لیا جائے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ آؤ اس کتاب کی طرف جو اللہ نے نازل کی

ہے اور انہوں نے رسول کی طرف تو تو نے منافقین کو دیکھا کہ وہ تجھ سے کتنی کاٹ جاتے ہیں..... ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ حکم الہی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے..... نہیں! تیرے پروردگار کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ وہ اپنے باہمی اختلافات میں تجھ کو حکم نہ بنائے اور یہ بھی کافی نہیں ہے ضروری ہے کہ جو فیصلہ تو کرے اس پر وہ اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور بے چون و چرا اس کے آگے سر جھکا دیں“ (النساء ۸-۹)

ان تصریحات سے ”اسلام“ اور ”مسلم“ می وہ تسمیہ معلوم ہو گئی۔ اب ہم سب لوگوں کو جنہوں نے مردم شماری میں اپنے آپ کو مسلمان لکھوا یا بے غور کرنا چاہیے کہ ہم پر لفظ ”مسلم“ کا اطلاق کس حد تک ہوتا ہے اور جس طریقہ پر ہم چل رہے ہیں اس کو ”اسلام“ سے تعبیر کرنا کہاں تک درست ہے؟  
(ترجمان القرآن۔ رجب ۱۴۲۲ھ۔ نومبر ۲۰۰۱ء)

## مسلمان کی طاقت کا اصلی منبع

دوسری صدی ہجری کی ابتدا کا واقعہ ہے کہ بھجستان و رنج کے فرمانروائے جس کا خاندانی لقب رنبیل تھا بنی امیہ کے عمال کو خراج دینا بند کر دیا۔ یہیم چڑھائیاں کی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔ یزید بن عبد اللہ اموی کے عہد میں جب اس کے پاس طلب خراج کے لئے سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمانوں کے سفراء سے دریافت کیا کہ نہ۔

”وہ لوگ کہا گئے جو پہلے آیا کرتے تھے ہاں کے پیٹ فاقہ زدوں کی طرح چٹخے ہوئے ہوتے تھے پشانیوں پر سیاہ گٹے پٹے بہتے تھے اور کھجوروں کی چلیں پہنا کرتے تھے؟“  
 کہا گیا کہ وہ لوگ تو گدز گئے۔ رنبیل نے کہا :-

”اگرچہ تمہاری موتیں ان سے زیادہ شان دار ہیں مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے اور تم سے زیادہ طاقتور تھے“

موتخ لکھتا ہے کہ یہ کہہ کر رنبیل نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا اور تقریباً نصف صدی تک وہ اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

یہ اس عہد کا واقعہ ہے جب تابعین تبع تابعین کثرت سے موجود تھے۔ ائمہ مجتہدین کا زمانہ تھا۔ بنی صلی علیہ وسلم کے وصال کو صرف ایک صدی گزری تھی مسلمان ایک زندہ اور طاقتور قوم کی حیثیت سے دنیا پر چھائے جا رہے تھے۔ ایران کو روم مصر افریقہ اسپین وغیرہ ممالک کے وارث ہو چکے تھے۔ اور سازو سامان کثان و شوکت اور دولت و ثروت کے اعتبار سے اس وقت دنیا کی کوئی قوم ان کی ہم پلہ نہ تھی۔

یہ سب کچھ تھا۔ دلوں میں ایمان بھی تھا۔ احکام شریعت کی پابندی اسے بہت زیادہ تھی۔ سمجھ و طاقت کا نظام قائم تھا۔ پوری قوم میں ایک زبردست دسپن پایا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی جو لوگ عہد صحابہ کے فائق کشنہ حال صحرائیہوں سے زور آزمائی کر چکے تھے انہوں نے ان سرو سامان والوں اور ان کے سرو سامانوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق محسوس کیا۔ یہ کس چیز کا فرق تھا؟ فلسفہ تاریخ والے اس کو محض بداد و حقارت کے فرق پر محمول کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ پہلے بادیہ نشین زیادہ جفاکش تھے اور بعد کے لوگوں کو دولت اور تمدن نے عیش پسند بنا دیا تھا۔ مگر میں کہوں گا کہ یہ فرق دراصل ایمان، خلوص نیت، اخلاق اور اطاعت خدا و رسول کا فرق تھا۔ مسلمانوں کی اصلی قوت یہ چیزیں تھیں۔ ان کی قوت نہ کثرت تعداد پر مبنی تھی۔ نہ اسباب آلات کی افراط پر۔ نہ مال و دولت کی فراوانی پر۔ نہ علوم و صناعات کی ہمارت پر۔ نہ تمدن و حضارت کے لوازم پر۔ یہ صرف ایمان و عمل صالح کے بل پر ابھرے تھے۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں سر بلند کیا تھا۔ اسی نے قوموں کے دلوں میں ان کی دھاک اور ساکھ بٹھائی تھی۔ جب قوت و عزت کا یہ سرمایہ ان کے پاس تھا تو یہ کثرت تعداد اور بے سرو سامانی کے باوجود طاقت ور اور مغرور تھے۔ اور جب یہ سرمایہ ان کے پاس کم ہوتا گیا تو یہ کثرت تعداد اور ساز و سامان کی فراوانی کے باوجود کمزور اور بے وقعت ہوتے چلے گئے۔

ترتیب نے ایک دشمن کی حیثیت سے جو کچھ کما وہ دوستوں اور ناصحوں کے ہزار و غطلوں سے زیادہ سبق آموز ہے۔ اس نے دراصل حقیقت بیان کی تھی کہ کسی قوم کی اصلی طاقت اس کی آہستہ فوجیں اس کے آلات جنگ اس کے خوش خور و خوش پوش سپاہی اور اس کے وسیع ذرائع و وسائل نہیں ہیں بلکہ اس کے پاکیزہ اخلاق، اس کی مضبوط سیرت، اس کے صحیح معاملات اور اس کے بلند تخیلات ہیں۔ یہ طاقت وہ روحانی طاقت ہے جو مادی وسائل کے بغیر دنیا میں اپنا سکھلا دیتی ہے۔ خاک نشینوں کو تخت نشینوں پر غالب کر دیتی ہے۔ صرف زمینوں کا وارث ہی نہیں بناتی بلکہ دلوں کا مالک بھی بنادیتی

ہے۔ اس طاقت کے ساتھ کھجور کی چھپیاں پہننے والے، سوکھی ہڈیوں والے بے رونق چہروں والے چھتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواریں رکھنے والے لوگ دنیا پر وہ رعب و سطوت و جبروت و قدر و منزلت و اعتبار و اقتدار جماتے ہیں جو اس طاقت کے بغیر شان و ارباباں پہننے والے بٹے، بیل ڈول والے یا رونق چہروں والے اور کچی بارگاہوں والے بڑی بڑی صنعتیں اور مولانا کی دیار رکھنے والے نہیں جاسکتے۔ اخلاقی طاقت کی فراوانی مادی وسائل کے فقدان کی تلافی کر دیتی ہے، مگر مادی وسائل کی فراوانی اخلاقی طاقت کے فقدان کی تلافی بھی نہیں کر سکتی۔ اس طاقت کے بغیر محض مادی وسائل کے ساتھ اگر غلبہ نصیب ہو بھی گیا تو ناقص اور عارضی ہوگا، کامل اور پائدار ہوگا۔ دل بھی سحر نہ ہوں گے، صرت گردنیں جھک جائیں گی اور وہ بھی اکٹلنے کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے مستعد رہیں گی۔

کسی عمارت کا استحکام اس کے رنگ و روغن، نقش و نگار، زینت و آرائش، صحن و چمن اور وظاہری خوشنمائی سے نہیں ہوتا۔ نہ مکینوں کی کثرت، ساز و سامان کی اذراط اور اسباب آلات کی فراوانی اس کو مضبوط بناتی ہے۔ اگر اس کی بنیادیں کمزور ہوں، دیواریں کھوکھلی ہوں، ستونوں کو گھٹن لگ جائے، کڑیاں اور تختے بوسیدہ ہو جائیں، تو اس کو گرنے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی خواہ وہ مکینوں سے خوب ممد ہو اور اس میں کروڑوں روپے کا مال و سباب بھرا پڑا ہو اور اس کی سجاوٹ، لطروں کو لہجاتی اور دلوں کو موہ لیتی ہو۔ تم صرت ظاہر کو دیکھتے ہو۔ تمہاری نظریں منظر پر اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ مگر حوادث زمانہ کا معاملہ ناماشی مظاہر سے نہیں بلکہ اندرونی حقائق سے پیش آتا ہے۔ وہ عمارت کی بنیادوں سے تیز و آزاں ہوتے ہیں۔ دیواروں کی پختگی کا امتحان لیتے ہیں، ستونوں کی استواری کو جانچتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں مضبوط اور مستحکم ہوں تو زمانے کے حوادث ایسی عمارت سے ٹکرا کر پلٹ جائیں گے اور وہ ان پر غالب آجائے گی، خواہ وہ زینت و آرائش سے یکسر محروم ہو۔ ورنہ حوادث کی ٹکریں آخر کار اس کو پاش پاش کر کے رہیں گی اور وہ اپنے ساتھ اپنے مکینوں اور اپنے سباب زینت کو بھی لے بیٹھے گی۔

ٹھیک یہی حال حیاتِ قومی کا بھی ہے۔ ایک قوم کو جو چیز زندہ اور طاقت ور اور سر بلند بناتی ہے وہ اس کے مکان، اس کے لباس، اس کی سواریاں، اس کے اسبابِ عیش، اس کے فنونِ بطقہ، اس کے کافلانے، اس کے کالج نہیں ہیں بلکہ وہ اصول ہیں جن پر اس کی تہذیب قائم ہوتی ہے اور پھر ان اصولوں کا دلوں میں اسخ ہونا اور اعمال پر حکمران بن جانا ہے۔ یہ تین چیزیں یعنی اصول کی صحت، ان پر توجہ ایمان اور عملی زندگی پر لگی کامل فرمانروائی، حیاتِ قومی میں ہی حیثیت رکھتی ہیں جو ایک عمارت میں کسی مستحکم بنیادوں، اس کی سچت دیواروں اور اس کے مقبوضہ سطحوں کی ہے جس قوم میں یہ تین چیزیں بدرجہ اتم موجود ہوں وہ دنیا پر غالب ہو کر رہے گی، اس کا کلمہ بلند ہوگا، خدا کی زمین میں اس کا سکھ چلے گا، دلوں میں اس کی دھاک بیٹھے گی گرتیز اس کے حکم کے آگے جھک جائیں گی اور اس کی عزت ہوگی، خواہ وہ جھوٹیلوں میں رہتی ہو، چھٹے پرلے پرلے پہنچتی ہو، فاقوں سے اس کے پیٹ پٹھے تھمتھے ہوئے ہوں، اس کے ہاں ایک بھی کلچ نہ ہو، اس کی بستیدیں میں ایک بھی دھواں اڑانے والی جہنی نظر نہ آئے، اور علوم و صناعات میں وہ بالکل صفر ہو۔ تم جن چیزوں کو سامانِ ترقی سمجھ رہے ہو وہ محض عمارت کے نقش و نگار ہیں، اس کے قوائم و ارکان تمہیں ہیں کچھو کھلی دیواروں پر اگر تم سونے کے پترے بھی چڑھا دو گے تو وہ ان کو گرنے سے نہ بچا سکیں گے۔

یہی بات ہے جس کو قرآن مجید بار بار بیان کرتا ہے۔

وہ اسلام کے اصولوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اس اُٹل اور غیر متغیر فطرت کے مطابق ہیں جن نے انسان کو پیدا کیا ہے اس لیے جو دین ان اصولوں پر قائم کیا گیا ہے وہ دینِ قیم ہے، یعنی ایسا دین جو معاش و معاد کے جملہ معاملات کو ٹھیک ٹھیک طریقوں پر قائم کرنے والا ہے۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (الروم - ۴)

پھر وہ کہتا ہے کہ اس دینِ قیم پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ، اس پر ایمان لاؤ اور اس کے مطابق

عمل کرو۔ اس کا نتیجہ خود بخود یہ ظاہر ہو گا کہ دنیا میں تم ہی سر بلند ہو گے تم ہی کو زمین کا وارث بنایا جائیگا۔  
 تم ہی قلمتِ خلافت سے سرفراز ہو گے۔ اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (انبیاء: ۱۰۰)  
 وَاَنْتُمْ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران: ۱۴) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ  
 عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (النور: ۵) وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَ  
 الَّذِيْنَ اٰمَنُوا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (المائدہ: ۸)

بجائے اس کے جو لوگ بظاہر دین کے دائرے میں داخل ہیں مگر دین نہ تو ان کے دلوں میں  
 بیٹھا ہے اور نہ ان کی زندگی کا قانون بنا ہے، اُن کے ظاہر تو بہت شاندار ہیں؛ وَاِذَا دَاۤءٰیهُمْ  
 نَجْحُكُ اَجْسَامُهُمْ، اور ان کی باتیں بھی بہت مزیدار ہیں، وَاِنْ يَتَوَلَّوْا تَسْمَعُ لِقَوْلِهِمْ  
 مگر حقیقت میں وہ لکڑی کے کندے ہیں جن میں جان نہیں۔ کَاٰتَهُمْ خُشْبٌ مَّسَدَةٌ۔ وہ خدا  
 سے بڑھ کر ان لوں سے دُتے ہیں۔ يَحْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً۔ ان  
 کے اعمال سرب کی طرح ہیں کہ دیکھتے ہیں پانی نظر آئیں مگر حقیقت میں کچھ نہیں۔ اَعْمَالُهُمْ  
 كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمَانُ مَاءً حَتّٰى اِذَا جَاۤءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا۔ ایسے لوگوں  
 کو اجتماعی قوت کبھی نصیب نہیں ہو سکتی، کیونکہ ان کے دل آپس میں پٹے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ غلوں  
 نیت کے ساتھ کسی کام میں شراکِ عمل نہیں کر سکتے۔ بَاۤسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدًا تَخْشَوْنَهُمْ  
 جَمِيعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتٰى۔ ان کو وہ قوت ہرگز نہ حاصل نہیں ہو سکتی جو صرف مومنین صالحین  
 کا حصہ ہے۔ لَا يَقٰنَتُوْكُمْ جَمِيعًا اِلَّا فِيْ فَوْىٍ مُّخْتَصِمَةٍ اَوْ مِنْ دَرَاۤءٍ جَدْرٍ۔ ان کو دنیا  
 کی امامت کا منصب کبھی نہ ملے گا۔ قَالَ لَا يَنْتٰلُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ۔ ان کیلئے ہجر اس کے اور کوئی  
 انجام نہیں کہ دنیا میں بھی لت و تھاری اور آخرت میں بھی عذابِ نقاب۔ لَمْ يَمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ  
 وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔

آپ تعجب کریں گے کہ قرآن نے مسلمانوں کی ترقی و روان کے ایک حکمران جہات بننے اور سب کا لب آجانے کا ذریعہ صرف ایمان و عمل صالح کو قرار دیا، اور کہیں یہ نہیں کہا کہ تم یونیورسٹیاں بناؤ، کالج کھولو، کارخانے قائم کرو، جہاز بناؤ، کمپنیاں قائم کرو، بینک کھولو، سائنس کے آلات ایجاد کرو اور لباس، معاشرت، انداز و اطوار میں ترقی یا فتنہ قوموں کی نقل کرو۔ نیز اس نے تنزل و انحطاط اور دنیا و آخرت کی دولت و رُسو کا واحد سبب بھی نفاق کو ٹھہرایا نہ کہ ان حساب کے فقدان کو جنہیں آج کل دنیا اسباب ترقی سمجھتی ہے۔

لیکن اگر آپ قرآن کی اسپرٹ کو سمجھ لیں تو آپ کا یہ تعجب و رفع ہو جائے گا۔ سب سے پہلی بات جس کا سمجھنا ضروری ہے یہ ہے کہ مسلمان جس شہنام، ہجاس کا قوام، جزا اسلام کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مسلم ہونے کی حیثیت اس کی حقیقت صرف اسلام سے متحقق ہوتی ہے۔ اگر وہ اس پیغام پر ایمان رکھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور ان قوانین کو اتباع کے جبکہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے سے نازل کیا گیا ہے تو اس کا اسلام متحقق ہو جائے گا۔ خواہ اُن چیزوں میں سے کوئی چیز اس کے ساتھ شامل نہ ہو جو اسلام کے ماسوا میں۔ بخلاف اس کے اگر وہ اُن تمام یوروں سے آرتہ ہو جو ریت حیات دنیا کے قبیل سے ہیں مگر ایمان اس کے دل میں نہ ہو اور قوانین اسلامی کے اتباع سے اس کی زندگی خالی ہو تو وہ گویا جو بیٹ ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ہو سکتا ہے، کارخانہ دار ہو سکتا ہے، بینکر ہو سکتا ہے، جنرل یا ابراہم ہو سکتا ہے، مگر مسلمان نہیں ہو سکتا۔ پس کوئی ترقی کسی مسلمان شخص یا قوم کی ترقی نہ ہوگی جب تک کہ سب چیزوں سے پہلے اس شخص یا قوم میں حقیقت اسلامی متحقق نہ ہو جائے۔ اس کے بغیر ترقی خواہ وہ کیسی ہی ترقی ہو مسلمان کی ترقی نہ ہوگی، اور ایسی ترقی ظاہر ہو کہ اسلام کا نصب العین نہیں ہو سکتی۔

پھر ایک بات تو یہ ہے کہ کوئی قوم سرے سے مسلمان نہ ہو اور اس کے افکار و اخلاق اور نظام اجتماعی کی اساس اسلام کے سوا کسی اور چیز پر ہو۔ ایسی قوم کے لیے بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ وہ ان اخلاقی، سیاسی، معاشی اور عمرانی اصولوں پر کھڑی ہو سکے جو اسلام سے مختلف ہیں اور اس ترقی کے منہما کو پہنچ جائے جس کو وہ اپنے نقطہ نظر سے ترقی سمجھتی ہو۔ لیکن یہ بالکل ایک امر دیگر ہے کہ کسی قوم کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت

میشیت اور سیاست کی بنیاد اسلام پر ہو اور اسلام ہی میں وہ عقیدے اور عمل و دونوں کے لحاظ سے ضعیف ہو۔ ایسی قوم مادی ترقی کے وسائل خواہ کتنی ہی کثرت اور فراوانی کے ساتھ جیا کرے، اس کا ایک مضبوط اور طاقتور قوم کی حیثیت سے اٹھنا اور دنیا میں سر بلند ہونا قطعاً غیر ممکن ہے۔ کیونکہ اس کی قومیت اور اس کے اخلاق اور تہذیب کی اساس جس چیز پر ہے وہی کمزور ہے اور اساس کی کمزوری ایسی کمزوری ہے جس کی تلافی محض اوپری ترینت کے سامان کبھی نہیں کر سکتے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ علوم و فنون اور مادی ترقی کے وسائل کی جائز اہمیت سے انکار ہے مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان قوم کے لئے یہ تمام چیزیں ثانوی درجہ میں ہیں۔ اساس کا استحکام ان سب پر مقدم ہے وہ جب مستحکم ہو جائے تو مادی ترقی کے وہ تمام وسائل اختیار کئے جاسکتے ہیں اور کئے جانے چاہئیں جو اس بنیاد ساتھ مناسبت رکھتے ہوں لیکن اگر وہی مضمحل ہو کر اس کی جڑیں کمزور ہوں اور زندگی پر اسی کی گرفت ڈھیلی ہو تو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے قوم کے اخلاق کا فاسد ہونا، سیرت کا بگڑ جانا، معاملات کا فساد ہو جانا، نظام اجتماعی کی بندشوں کا مست ہو جانا، اور قوتوں کا پر اگندہ ہو جانا ناگزیر ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ قوم کی طاقت کمزور ہو جائے اور بین الاقوامی قوتوں کے ترازو میں اس کا پلٹا روز بروز ہلکا ہوتا چلا جائے یہاں تک کہ دوسری قومیں اس پر غالب آجائیں۔ ایسی حالت میں مادی اسباب کی فراوانی اور سدا یافتہ فتنہ لاء کی افراط اور خارجی تربیت ترینت کی چمک دکھائی کام نہیں آ سکتی۔ ان سب سے بڑھ کر ایک اور بات بھی ہے قرآن حکیم نہایت وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ تم ہی سر بلند ہو گے اگر تم مومن ہو۔ اور اس کی پارٹی وٹلے ہی غالب ہوں گے۔ اور جو لوگ ایمان و عمل صالح سے آ رہتے ہوں گے ان کو زمین کی خلافت ضرور ملے گی۔ اس وثوق کی بنیاد کیسے ہے؟ کس بنا پر یہ دعویٰ کیا گیا جو کہ دوسری قومیں خواہ کیسے ہی مادی وسائل کی مالک ہوں ان پر مسلمان صرف ایمان اور عمل صالح کے اسلحہ سے غالب آجائیں گے؟ اس عقیدے کو خود قرآن حل کرتا ہے :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضَرْبٌ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا  
لَكَرِ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ  
يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ وَ إِنْ  
يَسْأَلُهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْفِذْهُ  
مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ مَا  
قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنْ اللَّهَ لَقَرَوْى  
عَزَّ وَجَلَّ (ع - ۱۰)

لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔ اس کو غور سے سنو۔ خدا کو  
چھوڑ کر تم جن چیزوں کو پکارتے ہو وہ ایک کبھی تک کو پیدا کرنے  
پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ سب اس کام کے لئے مل کر زور  
لگا دیں اگر ایک کبھی اس کوئی چیز چھینے تو اس وہ چیز بھڑائیے  
کی قدرت بھی نہیں ملے گی۔ یہی ضعیف طالب و سرک طالب بھی ضعیف ان  
لوگوں نے اللہ کی قدر ہی کی جیسی کہ فی چاہتے تھی۔ حالانکہ وہ حقیقت  
اللہ ہی قدرت اور عزت والا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ أَخَذُوا مِنَ دُونِ  
اللَّهِ أُولِيَاءَ كَمَا مَثَلُ الْعَنْكَبُوتِ اتَّخَذَتْ  
بَيْتًا وَإِنْ أَوْهَنَ الْيُوتُ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ  
(عنكبوت - ۴)

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو کارماں ٹھہرایا، ان کی  
مثال ایسی جیسے مکڑی کہ وہ گھر بناتی ہے، حالانکہ ب  
گھر سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نادانوں یا قوتوں پر اعتماد کرتے ہیں ان کا اعتماد و سب الہی چیزوں پر ہے جو بذات خود  
کسی قسم کی بھی قوت و قدرت نہیں رکھتیں۔ ایسے بے زوروں پر اعتماد کرنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود بھی  
ویسے ہی بے زور ہو جاتے ہیں جیسے ان کے سہارے بے زور ہیں۔ وہ اپنے نزدیک جو حکم قطعے نیتے ہیں وہ  
مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہیں۔ ان میں کبھی یہ طاقت ہو ہی نہیں سکتی کہ ان لوگوں کے مقابلہ میں سر اٹھا  
سکیں جو حقیقی قدرت و عزت رکھنے والے خدا پر اعتماد کر کے اٹھیں۔

وَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ  
بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى  
لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرہ - ۳۴)

جو طافوت کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آیا اس نے  
مضبوط دسی تھام لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

قرآن و دعویٰ کے ساتھ کتنا ہے کہ جب کبھی اہل ایمان اور اہل کفر کا مقابلہ ہوگا تو غلبہ اہل ایمان ہی کو حاصل ہوگا :-

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوْا  
الْذِّبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا  
سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَكِنْ  
يَحْدِلْ سَنَّةَ اللَّهِ يَتَدِيلًا (الفتح - ۳)

اور اگر وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے تم سے جنگ کر بیٹھے  
تو ضرور پٹھ پھیر جائیں گے اور کوئی یار و مددگار نہ پائیں گے  
یہ اس کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے اور تم کبھی  
اس کی سنت میں تفریق نہ پاؤ گے۔

سَنَلْقَى فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا  
الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَهُمْ بِنُزُولِ  
يَوْمِ سُلْطَانًا - (آل عمران : ۷۶)

ہم کافروں کے دلوں میں عذاب ڈال دیں گے، کیونکہ انہوں نے  
خدا کی باتوں میں ان چیزوں کو شریک کر لیا ہے جن کو خدا  
نے کوئی ممکن نہیں بخشا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص خدا کی طرف سے لڑتا ہے اس کے ساتھ خدائی طاقت ہوتی ہے اور  
جس کے ساتھ خدائی طاقت ہو اس کے مقابلے میں کسی کا زور چل ہی نہیں سکتا۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا  
وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَى لَهُمْ (مجادلہ)  
وَعَادِمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ  
رَحْمَى - (الفسال : ۲)

یہ اس لئے کہ ایمان داروں کا مددگار تو اللہ ہے اور کافروں کا  
مددگار کوئی نہیں۔  
جب تو نے تیرے بھینکا تو وہ تو نے نہیں بھینکا بلکہ  
خدا نے بھینکا۔

یہ تو مومن صالح کی سلطوت کا حال ہے۔ دوسری طرف بھی خدا کا قانون ہے کہ جو شخص ایماندار ہو جائے  
جس کی سیرت پاکیزہ ہوتی ہے جس کے اعمال نفاہیت کی آلودگیوں سے پاک ہوتے ہیں، جو بولے نفس اور غرض  
نفسانی کے بجائے خدا کے مقرر کئے ہوئے قانون کی ٹھیک پیروی کرتا ہے اس کی محبت دلوں میں بٹھ جائے  
دل آپ ہی آپ اس کی طرف کھینچے لگتے ہیں، نگاہیں اس کی طرف احترام سے اٹھتی ہیں معاملات میں اس پر

اعتماد کیا جاتا ہے، دوست تو دوست دشمن تک سہ کو امین و صادق سمجھتے ہیں اور اس کے عدل اس کی عفت اور اس کی وفا شکاری پر بھروسہ کرتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ  
سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا (مریم: ۶)  
يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ  
الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ  
(ابراہیم: ۱۲)

جو کوئی ایمان لے آئے اور یہ انہوں نے نیک عمل کیے، اللہ  
ان کی محبت دلوں میں ڈال دے گا۔  
ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کے ساتھ  
جما دیتا ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں  
بھی۔  
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ  
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰٓةً طَيِّبَةً وَّ  
لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا  
يَعْمَلُونَ (النحل: ۱۳)

مگر یہ سب کس چیز کے نتائج ہیں؟ محض زبان سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہنے کے نہیں مسلمانوں کے  
نام رکھ لینے اور معاشرے کے چند مخصوص اطوار اختیار کرنے اور چند گنی چنی ریتیاں ادا کر لینے کے نہیں۔ قرآن  
حکیم ان نتائج کے ظہور کے لیے ایمان اور عمل صالح کی شرط لگاتا ہے اس کا منشا، یہ ہے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی حقیقت  
تمہارے قلب و شعور میں اس قدر جا گزیر ہو جائے کہ تمہارے خیالات و افکار اور اخلاق و معاملات سب اسی کا غلبہ ہو  
تمہاری ساری زندگی اسی کلمہ طیبہ کے معنوی قالب میں پھل جائے۔ تمہارے ذہن میں کوئی ایسا خیال راہ نہ پاسکے  
جو اس کلمہ کے معنی سے مختلف ہو۔ اور تم سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جو اس کلمہ کے معنی کے خلاف ہو۔ لَا إِلَهَ  
إِلَّا اللَّهُ کو زبان سے ادا کرنے اور قلب سے اسکی تصدیق کرنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ تمہاری زندگی میں اس کے  
ساتھ ہی ایک انقلاب برپا ہو جائے۔ تمہاری رگ رگ میں تقویٰ کی روح سرایت کر جائے۔ اللہ کے سوا تمہاری

گردن کسی طاقت کے آگے نہ جھکے۔ اللہ کے سوا تمہارا ہاتھ کسی کے آگے نہ پھیلے۔ اللہ کے سوا کسی کا خوف تمہارا دل میں نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو راضی کرنے کی خواہش تمہارے قلب میں باقی نہ ہے۔ تمہاری محبت اور تمہارا فیض اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نہ ہو۔ اللہ کے قانون کے سوا تمہاری زندگی پر کسی اور کا قانون نافذ نہ ہو۔ تم اپنے نفس اور ساری خواہشوں اور اس کے تمام مرغوبات و محبوبات کو اللہ کی خوشنودی پر قربان کر دینے کے لیے ہر وقت تیار ہو۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مقابلہ میں تمہارے پاس مِمَّعْتَا وَاَطْعَنَا کے سوا کوئی اور قول و فعل نہ ہو جب ایسا ہو گا تمہاری قوت صرف تمہارے اپنے نفس اور جسم کی قوت نہ ہو گی بلکہ اس احکم الحاکمین کی قوت ہو گی جس کے آگے زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سر بسجود ہے اور تمہاری ذات اُس تَوَدُّ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ کے جلووں سے منور ہو جائے گی جو تمام عالم کا حقیقی محبوب و معشوق ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں یہی چیز مسلمانوں کو حاصل تھی پھر اس کا نتیجہ کچھ ہوا، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اس زمانہ میں جس نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہا اس کی کو باپٹ گئی۔ مسخام سے یکایک وہ کندن بن گیا۔ اس کی ذات میں کوشش پیدا ہوئی کہ دل اس کی طرف کھینچنے لگے۔ اس پر جس کی نظر پڑتی وہ محسوس کرتا کہ گویا تقویٰ اور پاکیزگی اور صداقت کو مجھ دیکھ رہا ہے۔ وہ ان پڑھ، مغفل، فاقہ کش، پشیمند پوش اور بویا نشین ہوتا، مگر پھر بھی اس کی سمیت دل میں ایسی بیٹھتی کہ بڑے بڑے شان و شوکت والے فرمانرواؤں کو نصیب نہ تھی۔ ایک ایک مسلمان کا وجود گویا ایک چراغ تھا کہ جودھروہ جاتا اس کی روشنی اطراف اکناف میں پھیل جاتی اور اس ایک چراغ سے سینکڑوں ہزاروں چراغ روشن ہو جاتے۔ پھر جو اس کی روشنی قبول نہ کرتا اور اس سے ٹکرانے کی جرأت کرتا تو اس کو جلائے اور فنا کر دینے کی قوت بھی اس میں موجود تھی۔

ایسی ہی قوت ایمانی اور طاقت اور سمیت رکھنے والے مسلمان تھے کہ جب وہ ساٹھ تین سو سے زیادہ نہ تھے تو انہوں نے تمام عرب کو مقابلہ کا چیلنج دے دیا، اور جب وہ چند لاکھ کی تعداد کو پہنچے تو ساری دنیا

کو مسخر کر لینے کے غم سے اٹھ کھڑے تھے اور جو قوت ان کے مقابلے پر آئی پاش پاش ہو گئی۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے مسلمان کی اصلی طاقت یہی ایمان اور سیرت صالحہ کی طاقت ہے جو صرف ایک لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی حقیقت دل میں بیٹھ جانے سے حاصل ہوتی ہے لیکن اگر حقیقت دل میں جاگزین نہ ہو مگر زبان پر بلا لفاظ جاری ہوں مگر ذہنیت اور عملی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہ ہو لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہنے کے بعد بھی انسان ہی کا وہی ہے جو اس سے پہلے تھا اور اس میں اور کچھ لالہ لالہ لالہ کا انکار کرتے والوں میں اختلافی و علمی حیثیت سے کوئی فرق نہ ہو وہ بھی انہی کی طرح غیر اس کے آگے گردن جھکات اور ہاتھ پھیلاتے انہی کی طرح غیر خدا سے ڈستے اور غیر خدا کی رضا پسندے اور غیر خدا کی محبت میں گرفتار ہوا انہی کی طرح ہوش نفس کا بندہ ہوا اور قانونِ آسمی کو چھوڑ کر انسانی قوانین یا اپنے نفس کی خواہشات کا اتباع کرے اس کے خیالات اور ارادوں اور ذہنوں میں بھی ہی گندگی ہو جو ایک غیر مومن کے خیالات اور ادوات اور نیت میں ہوتی ہے اور اس کے اقوال و افعال و معاملات بھی ایسے ہی ہوں جیسے ایک غیر مومن کے ہوتے ہیں تو پھر مسلمان کو نا مسلمان پر فوقیت کس پر ہو؟ روح ایمان اور روح تقویٰ نہ ہونے کی صورت میں ایک مسلمان دلیا ہی ایک بشر تو ہے جیسا ایک نا مسلمان اس کے بعد مسلم اور غیر مسلم کا مقابلہ صرف جسمانی طاقت اور مادی وسائل ہی کے اعتبار سے ہوگا اور اس مقابلہ میں جو طاقت ہوگا وہ کمزور پر غالب آجائے گا۔

ان دونوں حالتوں کا فرق تاریخ کے صفحات میں اتنا نمایاں ہے کہ ایک نظر میں دیکھا جاسکتا ہے یا تو مٹھی بھر مسلمانوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیے تھے اور ان کے کنارے سے لے کر انانک کے سوا حل تک سلام پھیلادیا تھا۔ یا اب کروڑوں مسلمان اس دنیا میں موجود ہیں اور غیر مسلم طاقتوں سے دبے ہوئے ہیں جن آبادیوں میں کروڑوں مسلمان بستے ہیں اور ان کو بیتے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں وہاں اب بھی کفر و شرک موجود ہے۔

(ترجمان القرآن - شوال ۱۳۵۵ھ - جنوری ۱۹۳۵ء)

## کیش مران کہ مذہب گو سفندان

مشہد سود پر میرے مضامین کو دیکھ کر ایک خیال کا بار بار اٹھا رہا گیا ہے۔ وہ خیال یہ ہے کہ: موجودہ زمانہ میں سرمایہ داری نظام سیاسی طاقت کے ساتھ ہمارے گرد و پیش کی پوری معاشی دنیا پر تسلط ہو چکا ہے، معیشت کی گاڑی اصول سرمایہ داری کے پہیوں پر چل رہی ہے سرمایہ داری اس کو چلا رہی ہے اور وہی قومیں اس کے ذریعہ سے منزل ترقی کی طرف بڑھ رہی ہیں جن کے لئے پیدائش دولت اور صرف دولت کے باب میں کوئی مذہبی یا اخلاقی قید نہیں ہے۔ دوسری طرف ہماری اجتماعی قوت منتشر ہے۔ دنیا کے نظم معیشت کو بدلنا تو درکنار ہم خود اپنی قوم میں بھی اسلامی نظم معیشت کو از سر نو قائم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اب اگر ہماری مذہبی قیود ہم کو زمانے کے چلتے ہوئے نظام معاشی میں پورا پورا حصہ لینے سے روک دیں تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہماری قوم معاشی ترقی و خوشحالی کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائے گی۔ ہم مفلس ہوتے جائیں گے اور ہمسایہ قومیں دولت مند ہوتی چلی جائیں گی۔ پھر ہماری یہ معاشی کمزوری ہم کو سیاسی اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بھی ذلیل اور پست کر دیگی۔ محض وہم اور اندیشہ نہیں ہے بلکہ واقعات کی دنیا میں نتیجہ ہم کو نظر آ رہا ہے۔ رسول نظر آ رہا ہے اور مستقبل میں ہمارا جو کچھ انجام ہونے والا ہے اس کے آثار کچھ ایسے دھندلے نہیں ہیں کہ ان کو نہ دیکھا جاسکتا ہو۔ پس ہم کو محض شریعت کا قانون بنانے سے کیا فائدہ؟ اسلام کے معاشی اصول بیان کرنے سے کیا حاصل؟ ہم کو یہ بتاؤ کہ ان حالات میں اسلامی قانون کی پابندی کے ساتھ ہمارے لیے اپنی معاشی حالت کو نبھانے اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ اگر نہیں ہے تو دو صورتوں میں ایک صورت یقیناً پیش آئے گی۔ یا تو مسلمان بالکل

تباہ ہو جائیں گے۔ یا پھر وہ بھی دوسری قوموں کی طرح مجبور ہوں گے کہ ایسے تمام قوانین کی پابندی سے آزاد ہو جائیں جو زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔“

یہ سوال صرف مسئلہ سود ہی تک محدود نہیں ہے۔ ورنہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگر زندگی کے تمام شعبوں میں سے محض ایک معیشت کا ہی شعبہ ایسا ہوتا جس پر ایک غیر اسلامی نظام مسلط ہو گیا ہوتا تو شاید معاملہ نسبتاً بہت ہلکا ہوتا۔ مگر واقعات کی شہادت کچھ اور ہے۔ اپنے گرد پیش کی دنیا پر نظر ڈالیں خود اپنے حالات کا جائزہ لے کر دیکھیے۔ زندگی کا کونسا شعبہ ایسا پایا جاتا ہے جس پر غیر اسلام کا تسلط نہیں ہے؟ کیا اعتقادات اور افکار و خیالات پر الحاد و دہریت یا کم از کم شک و شبہ کا غلبہ نہیں؟ کیا تعلیم پر نافذ شناسی کی حکومت نہیں؟ کیا تمدن و تہذیب پر فکریت کا استیلا نہیں؟ کیا معاشرت کی جڑوں تک میں مغربیت اثر نہیں گئی ہے؟ کیا اخلاق اس کے غلبہ سے محفوظ ہیں؟ کیا معاملات اس کے تسلط سے آزاد ہیں؟ کیا قانون اور سیاست اور حکومت کے اصول و فروع، نظریات اور عملیات میں کوئی چیز بھی اس کے اثر سے پاک ہے؟

جب حال یہ ہے تو آپ اپنے سوال کو معیشت اور اس کے بھی صرف ایک پہلو تک کیوں محدود رکھتے ہیں؟ اس کو وسیع کیجیے۔ پوری زندگی پر پھیلا دیجیے۔ یوں کہیے کہ زندگی کے دریا نے اپنا رخ بدل دیا ہے۔ پہلے وہ اُس رستہ پر بہ رہا تھا جو اسلام کا رستہ تھا۔ اب وہ اُس رستہ پر بہ رہا ہے جو غیر اسلام کا رستہ ہے۔ ہم اس رخ کو بدلنے کی قوت نہیں رکھتے۔ ہم میں اتنی قوت بھی نہیں کہ اس کی رو کے خلاف تیر سکیں۔ ہم کو ٹھہرنے میں بھی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اب ہمیں کوئی ایسی صورت تباہ کہ ہم مسلمان بھی ہیں اور اس ربا کے بہاؤ پر اپنی کشتی کو چھوڑ بھی دیں، عازم کعبہ بھی رہیں اور اُس قافلہ کا ساتھ بھی نہ چھوڑیں جو ترکستان کی طرف جا رہا ہے، ہم اپنے خیالات، نظریات، مقاصد، اصول، حیات اور منہاج عمل میں نا مسلمان بھی ہوں اور پھر مسلمان بھی ہوں۔ اگر ان اعضاء کو جمع کرنے کی کوئی صورت تم نے نہ نکالی تو نتیجہ یہ ہو گا کہ یا تو ہم

اسی دریائے ساحل پر کہیں مر رہے ہیں گئے، یا پھر یہ اسلام کا لیل جو ہماری کشتی پر لگا ہوا ہے ایک دن کھرچ ڈالا جائے گا اور یہ کشتی بھی دوسری کشتیوں کے ساتھ دریائے دھماے پر بہتی نظر آئے گی۔

ہم اے روشن خیال! اور تجھ دلپند حضرات جب کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہیں تو ان کی آخری جہت جو ان کے نزدیک سب سے قوی حجت ہے، یہ ہوتی ہے کہ زمانے کا رنگ یہی ہے۔ ہوا کا رخ اسی طرف ہے دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ پھر ہم اس کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں اور مخالفت کر کے زندہ کیسے رہ سکتے ہیں! اخلاق کا سوال ہو۔ وہ کہیں گے کہ دنیا کا معیار اخلاق بدل چکا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ مسلمان اس پرانے معیار اخلاق پر کیسے قائم رہیں؟ پرے پر بحث ہو۔ ارشاد ہو گا کہ دیلے پردہ اٹھ چکا ہے۔ مراد یہ ہوتی کہ جو چیز دنیا سے اٹھ چکی ہے اس کو مسلمان کیسے نہ اٹھائیں! تعلیم پر گفتگو ہو۔ ان کی آخری دلیل یہ ہو گی کہ دنیا میں اسلامی تعلیم کی مانگ ہی نہیں۔ مدعا یہ کھلا کہ مسلمان بچے وہ جنس بن کر کیسے نکلیں جس کی مانگ نہیں ہے اور وہ مال کیوں نہیں جس کی مانگ ہے! سود پر تقریر ہو ٹیپ کا بند یہ ہو گا کہ اب دنیا کا کام اسے بغیر نہیں چل سکتا۔ گویا مسلمان کسی ایسی چیز سے راستہ ترک کیسے کر سکتے ہیں جو اب دنیا کا کام چلنے کے لئے ضروری ہو گئی ہو؟ غرض کہ تمدن معاشرت اخلاق تعلیم معیشت قانون سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں سے جس شعبے میں بھی وہ اصول اسلام سے ہٹ کر ذریت کا تبار کرنا چاہتے ہیں، اُس کے لئے زمانے کا رنگ اور ہوا کا رخ اور دنیا کی رفتار وہ آخری حجت ہوتی ہے جو اس عقیدہ مغربی یا وحقیقت امر کی ازاد کے جواز پر برہان قاطع سمجھ کر پیش کی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عمارت اسلامی کے اجزاء میں سے ہر اُس جز کو ساقط کر دینا فرض ہے جس پر اس دلیل سے حکمہ کیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ شکست و ریخت کی یہ تجویزیں جن کو متفرق طور پر پیش کرتے ہو، ان سب کو ملا کر ایک جامع تجویز کیوں نہیں بنا لیتے؟ مکان کی ایک ایک پوار ایک ایک کمرے اور ایک ایک لان کو گرنے کی علیحدہ علیحدہ تجویزیں پیش کرنے، اور ہر ایک پر فرداً فرداً بحث کرنے میں فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔

کیوں نہیں کہتے کہ یہ پورا مکان گرائینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا رنگ مٹانے کے رنگ سے مختلف ہے اس کا  
 رخ ہوا کے رخ سے پھرا ہوا ہے اور اس کی وضع اُن مکانوں سے کسی طرح نہیں ملتی جواب یتا میں نے کیا  
 جن لوگوں کے حقیقی خیالات یہی ہیں ان کو بحث کرنا فضول ہے۔ ان کے لیے توصات اور سیدھا  
 جواب یہی ہے کہ اس مکان کو گرنے اور اس کی جگہ دوسرا مکان بنانے کی رحمت آپ کیوں اٹھاتے ہیں، جو دوسرا  
 خوش وضع خوشما خوش رنگ مکان آپ کو پسند آئے اس میں تشریف لیجائیے۔ اگر دیا کے دھائے پڑے  
 کا شوق ہے تو اس شتی کا لیل کھرچنے کی تکلیف بھی کیوں اٹھائیے جو کشتیاں پہلے سے بہ رہی  
 ہیں انہی میں سے کسی میں قتل مقام فرمایا جیسے جو لوگ اپنے خیالات اپنے افلاک اپنی معاشرت اپنی  
 معیشت اپنی تعلیم غرض اپنی کسی چیز میں بھی مسلمان نہیں ہیں اور مسلمان رہنا نہیں چاہتے ان کے برائے نام  
 مسلمان بنے نہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے۔ وہ خدا پرست نہیں ہوا پرست  
 ہیں اگر دنیا میں بُت پرستی کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ بتوں کو پوجیں گے اگر دنیا میں برہمنی کا رواج  
 عام ہو جائے تو یقیناً وہ اپنے کپڑے اتار بھینکیں گے اگر دنیا نجاستیں کھانے لگے تو یقیناً وہ کہیں گے  
 کہ نجاست ہی پاکیزگی ہے اور پاکیزگی تو سراسر نجاست ہے۔ ان کے دل اور دماغ غلام ہیں اور غلامی  
 ہی کے لیے گھڑے کئے ہیں۔ آج فرنگیت کا غلبہ ہے اس لیے اپنے باطن سے لیکر ظاہر کے ایک ایک گوشے  
 تک فرنگی بنا چاہتے ہیں کل اگر حبشیوں کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ حبشی بنیں گے اپنے چہروں پر سیاہی  
 پھیریں گے اپنے ہونٹ موٹے کریں گے اپنے بالوں میں حبشیوں کے گھونگر پیدا کریں گے ہر اُس شے کی  
 پوجا کرنے لگیں گے جو حبش سے ان کو پسند آئے گی۔ ایسے غلاموں کی اسلام کو قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ بخدا  
 اگر کروڑوں کی مردم شماری میں سے ان سب منافقوں اور غلام فطرت لوگوں کے نام کٹ جائیں اور  
 دنیا پر صرف چند ہزار وہ مسلمان رہ جائیں بن کر تریف یہ ہو کہ یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ اِذْ لَکَ عَلٰی  
 الْمُؤْمِنِیْنَ اَعْدَۃٌ عَلٰی الْکَافِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یُخَافُوْنَ لَوْمَۃً

لَا شَيْءَ تَوَاسَلَامَ اسے بدرجہا زیادہ طاقت دے ہوگا، اور ان کروڑوں کا نکل جانا اس حق میں ایسا ہوگا جیسے کسی مریض کے جسم سے پریا ور کچھ ہونکل جائے۔

فَخَشِيَ أَنْ يُصِيبَهُ نَادَاً شَرًّا۔ ”ہم کو خوف ہے کہ ہم پر مصیبت آجائے گی“

یہ آج کوئی نئی آواز نہیں ہے۔ بہت پرانی آواز ہے جو ہمیشہ منافقوں کی زبان سے بلند ہوتی رہی ہے یہی آواز نفاق کی اس بیماری کا پتہ دیتی ہے جو دلوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اسی آواز کو بلند کرنے والے ہمیشہ مخفیینِ اسلام کے کیمپ کی طرف پھٹتے رہے ہیں۔ ہمیشہ سے انہوں نے اللہ کی قائم کی ہوئی حدود کو پاؤں کی بیڑیاں اور گلے کا طوق ہی سمجھا ہے ہمیشہ سے ان کو احکامِ خدا و رسول کا اتباع گراں ہی گزرتا رہا ہے۔ اطاعت میں جان و مال کا زیاں اور نافرمانی میں حیاتِ دنیا کی ساری کامرانی! ہمیشہ سے ان کو تپڑا تپ رہی ہیں پس اُن کی خاطر خدا کی شریعت کو نہ ابتدا میں بدلا گیا تھا، نہ اب بدلا جا سکتا ہے اور نہ کبھی بدلا جائے گا۔ یہ شریعتِ بزدلوں اور نامردوں کے لیے نہیں اُتری ہے نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اُتری ہے۔ ہوا کے رُخ پر اُڑنے والے خُش و خاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشراتِ الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اُتری ہے۔ یہ ان بہادر شیروں کے لیے اُتری ہے جو ہوا کا رُخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں جو دریا کی روانی سے لٹنے اور اس بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہوں جو صفتِ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اُسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ سبکی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس رستہ پر رواں کرے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہِ راست ہے، صراطِ مستقیم ہے۔ اگر ورنہ اپنا رخ اُس رستہ سے

لے وہ اللہ کے محبوب و ارادگار کا محبوب ہو، مسلمان کے لیے نرم اور کافروں پر سخت ہوں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا انہیں خوف نہ ہو۔

پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوے میں وہ شخص جھوٹا ہے جو اس بے ہمتے رُخ پر بننے کے لیے راضی ہو جائے حقیقت میں جو یہی مسلمان ہے وہ اس غلط رویہ کی رفتار سے رٹے گا، اس کا رخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کرے گا، کامیابی اور ناکامی کی اس کو قطعاً پرواہ نہ ہوگی، وہ ہر اس نقصان کو گوارا کرے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے رٹتے رٹتے اس کا بازو ٹوٹ جائے، اس کے جڑ بندھیں، ہوجائیں اور پانی کی موجیں اس کو نیم جان کر کے کسی کنائے پر پھینک دیں تب بھی اس کی روح ہر شے کو کھائے گی ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کی روی پر ہنسنے والے کا فوٹو اور منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔

قرآن تمہارے سامنے ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں تمہارے سامنے ہیں۔ ابتداء سے کرا آج تک کے علمبرارانِ اسلام کی زندگیاں تمہارے سامنے ہیں۔ کیا ان سب کے تم کو یہی تعلیم ملتی ہے کہ ہوا جدھر اڑا اُڑھاڑ جاؤ؟ پانی جدھر بہا اُڑھاڑ جاؤ؟ زمانہ جو رنگ اختیار کرے اسی رنگ میں رنگ جاؤ؟ اگر تدعا یہی ہوتا تو کسی کتاب کے زول اور کسی نبی کی ہمت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہوا کی موجیں تمہاری ہدایت کے لیے اُور حیاتِ نیا کا بہاؤ تمہاری رہنمائی کے لیے اور زلزلے کی زنگیاں تمہیں گرگٹ کی روش سکھانے کے لیے کافی تھیں۔ خدا نے کوئی کتاب ایسی ناپاک تعلیم دینے کے لئے نہیں بھیجی اور نہ اس غرض کے لیے کوئی نبی مبعوث کیا۔ اس امت حق کی طرف توجہ پوچھنا بھی آیا ہے اس لیے آیا ہے کہ دنیا جن غلط راستوں پر چل رہی ہے ان سب کو چھوڑ کر ایک سیدھا راستہ مقرر کر کے اس کے خلاف جتنے رستے ہوں ان کو مٹائے اور دنیا کو اُن سے ہٹانے کی کوشش کئے ایمان داروں کی ایک جماعت بنائے جو نہ صرف خود اس سیدھے راستہ پر چلیں بلکہ دنیا کو بھی اسکی طرف کھینچ لائے کہ کوشش کریں۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین نے ہمیشہ اسی غرض کے لیے جہاد کیا ہے۔ اس جہاد میں اوتیں اُٹھاتی ہیں نقصان برداشت کیے ہیں اور جانیں دی ہیں ان میں سے کسی نے مصائب کے خوف یا منافع کے لالچ سے رفتار زمانہ کو کبھی اپنا مقدمہ نہیں بنایا۔ اب اگر کوئی شخص

یا کوئی گروہ ہدایت آسمانی کے بتائے ہوئے رستہ پر چلنے میں نقصان اور مشکلات اور خطرات دیکھتا ہے اور اس سے خوف نہ وہ ہو کر کسی ایسے رستہ پر جانا چاہتا ہے جس پر چلنے والے اس کو خوشحال کامیاب اور سر بلند نظر کرتے ہیں تو وہ شوق سے اپنے پسندیدہ راستہ پر چلے۔ مگر وہ بزدل اور حلیص انسان اپنے نفس کو اور دنیا کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کیوں کرتا ہے کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے نبی کے بتائے ہوئے طریقہ کو چھوڑ کر بھی اس کا پیرو ہے؟ نافرمانی خود ایک اُجڑم ہے۔ اس پر چھوٹا اور فریب اور منافقت کا اضافہ کر کے آخر کیا فائدہ اٹھا ناقص ہو؟ یہ خیال کہ زندگی کا دریا جس رخ پر بہ گیا ہے اس سے وہ پھیر نہیں جاسکتا، عقلاً بھی غلط ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی اس کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ دنیا میں ایک نہیں سینکڑوں انقلاب ہوتے ہیں اور ہر انقلاب اپنے اس دریا کے رخ کو بدلا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال خود اسلام ہی میں موجود ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے تو زندگی کا یہ دریا کس رخ پر بہ رہا تھا؟ کیا تمام دنیا پر کفر و شرک کا غلبہ نہ تھا؟ کیا استبداد و ظلم کی حکومت نہ تھی؟ کیا انسانیت کو طبقات کی ظالمانہ تقسیم نے داغدار نہ بنا رکھا تھا؟ کیا اخلاق پر فوجش معاشرت پر نفس پرستی ہمیشہ پر ظالمانہ جاگیر داری سرمایہ داری اور قانون پر بے اعتدالی کا تسلط نہ تھا؟ مگر ایک ترقی یافتہ انسان نے اٹھ کر تمام دنیا کو جلیج دے دیا۔ تمام ان غلط خیالات اور غلط طریقوں کو روک دیا جو اس وقت دنیا میں رائج تھے۔ ان سب کے مقابلہ میں اپنا ایک عقیدہ اور اپنا ایک طریقہ پیش کیا، اور چند سال کی مختصر مدت میں اپنی تبلیغ اور جہاد سے دریا کے رخ کو پھیر کر اور زمانہ کے رنگ کو بدل کر چھوڑا۔

سناہ ترین مثال اشتراکی تحریک کی ہے۔ انیسویں صدی میں سرمایہ داری کا تسلط اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ کوئی بزدل مرغ یا دغا من وقت یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ جو نظام ایسی ہولناک سیاسی اور جنگی قوت کے ساتھ دنیا پر مسلط ہے اس کو الٹ دینا بھی ممکن ہے۔ مگر انہی حالات میں ایک شخص کارل مارکس نامی اٹھا اور اس نے اشتراکیت کی تبلیغ شروع کی۔ حکومتوں نے اس کی مخالفت کی۔ وطن سے نکالا

گیا۔ ملک ملک کی خاک چھتا پھرا تنگدستی اور مصیبت سے دوچار ہوا مگر مرنے پہلے اشتراکیوں کی ایک طاقتور عجمت پیدا کر گیا جس نے پالیس سال کے اندر نہ صرف روس کی سب سے زیادہ خوفناک طاقت کو الٹ کر رکھ دیا، بلکہ تمام دنیا میں سرمایہ داری کی جڑیں ہلا دیں اور اپنا ایک معاشی اور تمدنی نظریہ اس قوت کے ساتھ پیش کیا کہ آج دنیا میں اس کے متبعین کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، اور ان مالک کے قوانین بھی اس سے متاثر ہو رہے ہیں جن سرمایہ داری کی حکومت گہری جڑوں کے ساتھ جچی ہوئی ہے۔

مگر انقلاب یا ارتقا ہمیشہ قوت ہی کے اثر سے رونما ہوتا ہے۔ اور قوت ٹھل جانے کا نام نہیں ٹھال دینے کا نام ہے۔ مگر جانے کو قوت نہیں کہتے، مگر دینے کو کہتے ہیں۔ دنیا میں کبھی نام دروں اور بزدلوں کو قوتی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ جو لوگ اپنا کوئی اصول کوئی مقصد حیات کوئی نصب العین نہ رکھتے ہوں جو کسی بلند مقصد کے لیے قربانی دینے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں جو خطرات و مشکلات کے مقابلے کی ہمت نہ رکھتے ہوں جن کو دنیا میں محض آسائش اور سہولت ہی مطلوب ہو جو ہر سانچے میں ٹھل جانے اور ہر دباؤ سے دب جانے والے ہوں ایسے لوگوں کا کوئی قابل ذکر کا زمانہ انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ تاریخ بنانا صرف بہادر مردوں کا کام ہے انہی نے اپنے جہاد اور اپنی قربانیوں سے زندگی کے دریا کا رخ پھیر لیا۔ دنیا کے خیالات بدلے ہیں، منہاج عمل میں انقلاب برپا کیا ہے۔ زمانے کے رنگ میں رنگ جانے کے بجائے زمانے کو خود اپنے رنگ میں رنگ کر چھوڑا ہے۔ پس یہ کہو کہ دنیا جس ہستہ پر جا رہی ہے اُس سے وہ پھیری ہی نہیں جاسکتی اور زمانے کی جو روش ہے اس کا اتباع کیے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ جمہوری کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے بجائے تم کو خود اپنی کمزوری کا سچا اعتراف کرنا چاہئے۔ اور جب تم اس کا اعتراف کرو گے تو تم کو یہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کمزور کے لیے دنیا میں کوئی مذہب ہو سکتا ہے، کوئی اصول اور نہ کوئی ضابطہ۔ اس کو تو ہر زور آور سے دبا پڑے گا۔ ہر طاقت کے آگے جھکنا پڑیگا۔ وہ کبھی اپنے کسی اصول اور کسی ضابطہ کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی مذہب اس کے لیے اپنے اصول بدلتا چلا جائے تو وہ سرے سے کوئی مذہب ہی نہ رہے گا۔

یہی ایک ہو گا ہے کہ اسلام کی قیود تمہاری خوشحالی اور ترقی میں مائع ہیں۔ آخر تم اسلام کی کس قید کی پابندی کی ہے ہو؟ کوئی قید ہے جس سے تم آزاد نہیں ہوئے؟ اور کوئی حد ہے جس کو تم نے نہیں توڑا؟ تم کو جو چیزیں تباہ کر رہی ہیں ان میں سے کس کی اجازت اسلام نے تم کو دی تھی؟ تم تباہ ہو رہے ہو اپنی فصولِ نیچے جوشن جن کے لیے کروڑوں روپیہ سالانہ کا سود تمہاری جیبوں سے ساہوکاروں کے خزانے میں جا رہا ہے اور کروڑوں روپے کی جائیدادیں تمہارے قبضہ سے نکلتی جا رہی ہیں۔ کیا اسلام نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ تم کو خود تمہاری اپنی بڑی فادیں تباہ کر رہی ہیں۔ اس غصی کی حالت میں بھی سینما اور کھیل تماشے تمہاری آبادی سے بھرے ہوتے ہیں۔ تم میں کا ہر شخص لباس اور زینت و آرائش کے سامانوں پر اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ تمہاری جیبوں سے ہر جینے لکھو کا روپیہ بیہودہ زہموں اور نمائشی افعال اور جاپلانہ اشغال میں صرف ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کس کو اسلام نے تمہارے لیے حلال کیا تھا؟ سب سے بڑی چیز جس نے تم کو تباہ کر دیا ہے وہ ادائے زکوٰۃ میں غفلت اور آپس کی معاوضت سے بے پروا ٹی ہے۔ کیا اسلام نے یہ چیز تم پر فرض نہ کی تھی؟ پس حقیقت یہ ہے کہ تمہاری معیشت کی بربادی اسلامی قیود کی پابندی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان سے آزادی کا نتیجہ ہے۔ رہی ایک سود کی پابندی تو وہ بھی کہاں قائم ہے؟ حکم ازکم ۹۵ فی صدی مسلمان بغیر کسی حقیقی مجبوری کے سود پر قرض لیتے ہیں۔ کیا اسلامی احکام کی پابندی اسی کا نام ہے؟ مالدار مسلمانوں میں سے بھی ایک بڑا حصہ کسی نہ کسی شکل میں سود کھا ہی رہا ہے۔ باقاعدہ ساہوکار نہ کی تو کیا ہوا۔ بینک اور بیمہ اور سرکاری بانڈس اور پراویڈنٹ فنڈس کا سود تو اکثر و بیشتر مالدار مسلمان کھاتے ہیں۔ پھر وہ حرام سود کی قید کہاں ہے جس پر تم اپنی معاشی خستہ حالی کا الزام رکھتے ہو؟ عجیب پر لطف استدلال ہے کہ مسلمانوں کی عزت اور قومی طاقت کا دار و دولت مندی پر اور دولت کا دار و معاشی ترقی و خوشحالی کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے پر ہے اور ان سب کا دار و سود جواز پر ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ابھی تک یہ خبر نہیں کہ عزت اور طاقت کا دار و دراصل ہے کس چیز پر مجھ دولت

ہرگز وہ چیز نہیں ہے جو کسی قوم کو معززا اور طاقتور بناتی ہو۔ تمہارا ایک ایک شخص اگر کچھ تہی اور کروڑ تہی بن جائے  
مگر تم میں کیر کڑ کی طاقت نہ ہو تو یقین رکھو کہ دنیا میں تمہاری کوئی عزت نہ ہوگی۔ تجلات اس کے اگر تم میں در  
اسلامی سیرت موجود ہو تم صادق اور امین ہو کر لالچ اور خوف سے پاک ہو کر اپنے اصول میں سخت اور اپنے معاملہ  
میں کھرے ہوؤ حق کو حق اور فرض کو فرض سمجھنے والے ہو کر حرام و حلال کی تمیز کو ہر حال میں ملحوظ رکھنے والے ہو  
اور تم میں اتنی اضافی قوت موجود ہو کہ کسی نقصان کا خوف اور کسی فائدے کی طمع تم کو رستی سے ہٹا نہ سکے  
اور کسی قیمت پر تمہارا ایمان نہ خریدا جاسکے تو دنیا میں تمہاری ساکھ قائم ہو جائے گی، دلوں میں تمہاری  
عزت بٹھ جائے گی تمہاری بات کا وزن کچھ تہی کی پوری دولت سے زیادہ ہوگا، تم جھوٹوں میں نہ رہ کر  
اور پیوند لگے کپڑے پہن کر بھی دولت سراؤں میں رہنے والوں سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھے جاؤ گے اور  
تمہاری قوم کو ایسی طاقت حاصل ہوگی جس کو کبھی نیچا نہیں دکھایا جاسکتا۔ حمد صحابہ کے مسلمان کس قدر مغلس تھے  
جھوٹوں اور کھیل کے خیموں میں رہنے والے۔ تمدن کی شان و شوکت سے نا آشنا۔ نہ ان کے لباس درست  
نہ غذا درست نہ ہتھیار درست نہ سواریاں شاندار۔ مگر ان کی جو دھاک اور ساکھ دنیا میں تھی وہ نہ اموی  
میں مسلمانوں کو نصیب ہوئی، نہ عباسی عہد میں اور نہ بعد کے کسی عہد میں۔ ان کے پاس دولت نہ تھی مگر  
کیر کڑ کی طاقت تھی جس نے دنیا میں اپنی عزت و عظمت کا سکھ بٹھا دیا تھا۔ بعد والوں کے پاس دولت آئی  
حکومت آئی، تمدن کی شان و شوکت آئی، مگر کوئی چیز بھی کیر کڑ کی کمزوری کا بدل فراہم نہ کر سکی۔

تم نے تاریخ اسلام کا سبق تو فراموش ہی کر دیا ہے۔ مگر دنیا کی جس قوم کی تاریخ چاہو اٹھا کر دیکھ  
لو تم کو ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ کسی قوم نے محض سہولت پسندی اور آرام طلبی اور منفعت پرستی سے  
عزت اور طاقت حاصل کی ہو۔ تم کسی ایسی قوم کو معززا اور سر بلند نہ پاؤ گے جو کسی اصول اور کسپن کی پابند  
نہ ہو کسی بڑے مقصد کے لیے تنگی اور شقت اور سختی برداشت نہ کر سکتی ہو اور اپنے اصول و مقاصد کے لیے  
اپنے نفس کی خواہشات کو اور خود اپنے نفس کو بھی قربان کر دینے کا جذبہ نہ رکھتی۔ یہ ڈسپلن اور اصول کی پابندی

اور بڑے مقاصد کے لیے راحت و آسائش اور منافع کی قربانی کسی نہ کسی رنگ میں تم کو ہر جگہ نظر آئے گی اسلام میں اس کا رنگ کچھ اور ہے اور دوسری ترقی یافتہ قوموں میں کچھ اور یہاں سے نکل کر تم کسی اور نظام تمدن میں جاؤ گے تو وہاں بھی تم کو اس رنگ میں نہی دوسرے رنگ میں ایک ایک ضابطہ کا پابند ہونا پڑے گا ایک ایک سپن کی گرفت برداشت کرنی ہی ہوگی چند مخصوص اصولوں کے شکنجے میں بہر حال تم جکڑے جاؤ گے اور تم کسی مقصد اور کسی اصول کی خاطر قربانی کا مطالبہ ضرور کیا جائے گا۔ اگر اس کا حوصلہ تم میں نہیں ہے اگر تم صرف ترقی اور کشادگی اور ٹھاس ہی کے متوالے ہو اور کسی سختی کسی کڑواہٹ کو گوارا کرنے کی طاقت تم میں نہیں ہے تو اسلام کی قید و بند سے نکل کر جہاں چاہو جا کر دیکھ لو۔ کہیں تم کو عزت کا مقام نہ ملے گا۔ اور کسی جگہ طاقت کا خزانہ تم نہ پاسکو گے۔ قرآن نے اس قاعدہ کلید کو صرف چار لفظوں میں بیان کیا ہے اور وہ چار لفظ ایسے ہیں جن کی صداقت پر پوری تائید عالم گواہ ہے۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ یُسْرًا دُہن ہر حال میں عُسْر کے ساتھ وابستہ ہے جس میں عُسْر کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں وہ کبھی یُسْر سے کم نہیں ہو سکتا +

ترجمان القرآن۔ صفر ۱۳۵۵ھ بمطابق ۱۹۳۶ء

# مسلمانوں کے لیے جدید تعلیمی پالیسی اور عمل

[نوٹ ہے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مجلسِ نصابِ نیات کے ہتھکڑی سے  
جواب میں بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ اس میں نصابِ نظامِ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہے لیکن اصل اس  
خطابِ مسلمانوں کے تعلیمی ادارات ہیں جس تعلیمی پالیسی کی توضیح اس نوٹ میں کی گئی ہے اسے لفظاً  
کرنا مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہے علی گڑھ ہو یا دیوبند یا ندوہ یا جامعہ ملیہ سب کا طریق کار نافذ  
المیاد ہو چکا ہے اگر یہ اس پر نظر ثانی نہ کریں گے تو اپنی افادت بالکل کھو دیں گے]

مسلم یونیورسٹی کورٹ اس امر پر تمام مسلمانوں کے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے اپنے ادارہ کے بنیادی  
مقصد یعنی طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی طرف توجہ کی اور اس کو ردِ عمل لانے کے لیے آپ کی مجلس کا  
تقریر کیا۔ اس سلسلہ میں جو کائنات یونیورسٹی کے دفتر سے بھیجے گئے ہیں ان کو میں نے پوسٹ غور و محض کے  
ساتھ دیکھا جہاں تک نیات اور علوم اسلامیہ کے موجودہ طریقِ تعلیم کا تعلق ہے اس کے ناقابلِ اطمینان  
ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جو نصاب اس وقت پڑھایا جا رہا ہے وہ یقیناً ناقص ہے لیکن مجلس کے معزرا کا  
کی جانب سے جو سوالات مرتب کیے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مجلس کے پرنسپل  
صرف ترمیمِ نصاب کا سوال ہے اور غالباً یہ سمجھا جا رہا ہے کہ چند کتابوں کو خارج کر کے چند و سری کتابیں  
لکھ دینے سے طلبہ میں اسلامی اسپرٹ پیدا کی جاسکتی ہے، اگر میرا قیاس صحیح ہے تو میں کہوں گا کہ یہ صلی صورت  
حال کا بہت ہی نامکمل اندازہ ہے، اصل ہم کو اس سے زیادہ گہرائی میں جا کر یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآنِ حدیث  
فقہ اور عقائد کی اس تعلیم کے باوجود جو اس وقت دی جا رہی ہے طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا نہ ہونے  
کی وجہ کیا ہے، اگر محض موجودہ نصابِ نیات کا نقص ہی اس کی وجہ ہے تو اس نقص کو دور کر دینا بلاشبہ اس

خرابی کو رفع کرنے کے لیے کافی ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس کے اسباب زیادہ وسیع ہیں اگر آپ کی پوری تعلیمی پالیسی میں کوئی اساسی خرابی موجود ہے تو اصلاح حال کے لئے محض نصابِ دینیات کی ترمیم ہرگز کافی نہ ہوگی اس کے لیے آپ کو اصلاحات کا دائرہ زیادہ وسیع کرنا ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی محنت طلب اور مشکلات سے لبریز ہو۔ میں نے اس مسئلہ پر اسی نقطہ نظر سے غور کیا ہے اور جن نتائج پر میں پہنچا ہوں انہیں امکانی اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

میرا یہ بیان تین حصوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلے حصہ میں یونیورسٹی کی موجودہ تعلیمی پالیسی پر تنقیدی نظر ڈال کر اسکی اساسی خرابیوں کو واضح کیا جائے گا اور یہ بتایا جائے گا کہ مسلمانوں کے حقیقی مفاد کے لئے اب ہماری تعلیمی پالیسی کیا ہونی چاہئے۔ دوسرے حصہ میں اصلاحی تجاویز پیش کی جائیں گی۔ اور تیسرے حصہ میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر سے بحث کی جائے گی۔

(۱)

اس وقت مسلم یونیورسٹی میں جو طرزِ تعلیم رائج ہے وہ تعلیمِ جدید اور اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں۔ دو بالکل متضاد اور بے جوڑ تعلیمی عنصروں کو جوڑنا تو نے کہ ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ ان میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کی گئی کہ ایک مرکبِ علمی توت بن کر کسی ایک کچھ کی خدمت کر سکیں۔ یکجائی و اجتماع کے باوجود یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ ہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالفت سمیتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے قطع نظر، خالص تعلیمی نقطہ نگاہ سے بھی اگر دیکھا جائے تو یہ کتنا پڑے گا کہ تعلیم میں اس قسم کے متباہن اور متضاد عناصر کی آمیزش اصلاً غلط ہے اور اس کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہ آمیزش اور بھی زیادہ قیاحت کا سبب بن گئی ہے کیونکہ اول تو خود آمیزش ہی درست نہیں پھر اس پر مزید خرابی یہ ہے کہ یہ آمیزش بھی مساویانہ نہیں ہے۔ اس میں مغربی عنصر بہت

طاقتور ہے اور اسلامی عنصر اس کے مقابلہ میں نہایت کمزور ہے۔ مغربی عنصر کو پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہے کہ وہ ایک عصری عنصر ہے جس کی پشت پر زرقار زمانہ کی قوت اور ایک عالمگیر حکمران تمدن کی طاقت ہے۔ اس کے بعد وہ ہماری یونیورسٹی کی تعلیم میں ٹھیک اُسی شان اور اسی طاقت کے ساتھ شریک کیا گیا ہے جس کے ساتھ وہ ان یونیورسٹیوں میں ہے اور ہونا چاہئے جو مغربی کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ یہاں مغربی علوم و فنون کی تعلیم اس طور پر دی جاتی ہے کہ ان کے تمام اصول اور نظریات مسلمان لڑکوں کی صاف اور سادہ لوح دل پر ایمان بن کر ثبت ہو جاتے ہیں اور ان کی ذہنیت کلیتہً مغربی سانچے میں ڈھل جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ مغربی نقطہ سے دیکھنے اور مغربی دماغ سے سوچنے لگتے ہیں اور یہ اعتقاد ان پر مسلط ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی چیز محض اور با وقعت ہے تو وہی ہے جو مغربی علم و حکمت کے اصول و مبادی سے مطابقت رکھتی ہو پھر ان تاثرات کو مغربی تقویت اُس تربیت پہنچتی ہے جو ہماری یونیورسٹی میں عملاً دی جا رہی ہے۔ لباس، معاشرت، آداب اطوار، رفتار و گفتار، کھیل کود، غرض کوئی چیز ہے جس پر مغربی تہذیب، تمدن اور مغربی رجحانات کا غلبہ نہیں ہے۔ یونیورسٹی کا ماحول اگر پورا نہیں تو ۹۵ فی صدی یقیناً مغربی ہے اور ایسے ماحول کے جو اثرات ہو سکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں۔ ان کو ہر صاحب نظر خود سمجھ سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی عنصر نہایت کمزور ہے۔ اول تو وہ اپنی تمدنی و سیاسی طاقت کھو کر ویسے ہی کمزور ہو چکا ہے۔ پھر ہماری یونیورسٹی میں اس کی تعلیم جن کتابوں کے ذریعہ سے دی جاتی ہے وہ موجودہ زمانے سے صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں ان کی زبان اور ترتیب تدوین ایسی نہیں جو عصری ماحول کو اپیل کر سکے۔ ان میں اسلام کے ابدی اصول کو جن حالات اور جن علمی مسائل پر منطبق کیا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر اب دہشتیں نہیں ہیں اور جو مسائل اب پیش ہیں ان پر ان اصولوں کو منطبق کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ مزید برآں اس تعلیم کی پشت پر کوئی تربیت، کوئی زندہ ماحول، کوئی عملی برتاؤ اور چلن بھی نہیں۔ اس طرح مغربی تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم کی آمیزش اور بھی زیادہ بے اثر ہو جاتی ہے۔ ایسی نامساوی آمیزش کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کے دل

دماغ پر مغربی عنصر پوری طرح غالب آجائے اور اسلامی عنصر محض ایک سامان مضحکہ بننے کے لئے رہ جائے، یا زیادہ سے زیادہ اس لئے کہ زمانہ ماضی کے آثار باقیہ کی طرح اس کا احترام کیا جائے۔

میں اپنی صاف گوئی پر معافی کا خواستگار ہوں مگر جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس کو بے کم و کاست بیان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میری نظر میں مسلم یونیورسٹی کی دینی و دنیاوی تعلیم بحیثیت مجموعی بالکل ایسی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سر تباہ یا غیر مسلم بناتے ہیں پھر اس کی قبل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دے دیتے ہیں تاکہ آپ پر اسے غیر مسلم بنانے کا الزام عائد نہ ہو اور اگر وہ اس بستہ کو اٹھا کر پھینک دے (جس کی وجہ دوسل آپ ہی کی تعلیم ہوگی) تو وہ خود ہی اس فعل کے لیے قابل الزام قرار پائے۔ اس طرز تعلیم سے آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ مسلمان پیدا کرے گا تو یوں سمجھنا چاہئے کہ آپ مجھ سے اور خرق عادت کے متوقع ہیں۔ کیونکہ آپ نے جو اسباب ہتھیائے ہیں ان قانون طبعی کے تحت تو یہ نتیجہ کبھی برآمد نہیں ہو سکتا۔ فی ہدی ایک یا دو چار طالب علموں کا مسلمان (کامل اعتقادی و علی مسلمان) رہ جانا کوئی حجت نہیں۔ یہ آپ کی یونیورسٹی کے فیضان تربیت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت ہے کہ جو اس فیضان سے اپنے ایمان و اسلام کو بچا لیا وہ دوسل فطرت ابراہیمی پر پیدا ہوا تھا۔ ایسے مستثنیات جس طرح علی گڑھ کے فارغ التحصیل اصحاب میں پائے جاتے ہیں اسی طرح ہندوستان کی سرکاری یونیورسٹیوں بلکہ یورپ کی یونیورسٹیوں کے متحررین میں بھی مل سکتے ہیں جن کے نصاب میں سرے سے کوئی اسلامی عنصر ہے ہی نہیں۔

اب اگر آپ ان حالات اور اس طرز تعلیم کو بعینہ باقی رکھیں اور محض دینیات کے موجودہ نصاب کو بدل کر زیادہ طاقتور نصاب شریک کر دیں تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ فرنگیت اور اسلامیت کی کشمکش زیادہ شدید ہو جائے گی۔ ہر طالب علم کا دماغ ایک رزمگاہ بن جائے گا جس میں یہ دو طاقتیں پوری قوت کے ساتھ جنگ کر رہی گی، اور بالآخر آپ کے طلبہ تین مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گے۔

ایک وہ جن پر فرنگیت غالب ہوگی، عام اس سے کہ وہ انگریزیت کے رنگ میں ہو، یا ہندی

وطن پرستی کے رنگ میں یا محدود اشتراکیت کے رنگ میں۔

دوسرے وہ جن پر اسلامیت غالب ہوگی خواہ اس کا رنگ گہرا ہو یا زنگیت کے اثر سے پھیکا پڑ جائے۔

تیسرے وہ جو نہ پورے مسلمان ہوں گے نہ پورے فرنگی۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ نتیجہ بھی کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں۔ نہ خالص یہی نقطہ نظر سے اس اجتماع نقیضین کو مفید کہا جاسکتا ہے اور نہ قومی نقطہ نظر سے ایسی یونیورسٹی اپنے وجود کو حق بنانا ثابت کرسکتی ہے جس کے نتائج کا ۱/۳ حصہ قومی مفاد کے خلاف اور قومی تہذیب کے لیے نقصان کامل کا مترادف ہو۔ کم از کم مسلمانوں کی غریب قوم کے لیے تو یہ سودا بہت ہی مہنگا ہے کہ وہ لاکھوں روپے کے خرچ سے ایک ایسی کمالیہ جاری رکھے جس میں ۳۳ فی صدی کے تو مستقل طور پر کھوٹے نکلتے رہیں اور ۳۳ فی صدی ہمارے خرچ پر تیار ہو کر غیروں کی گود میں ڈال دئے جائیں، بلکہ بالآخر خود ہمارے خلاف استعمال ہوں۔

مذکورہ بالا بیان سے دو باتیں اچھی طرح واضح ہو جاتی ہیں:-

اولاً، تعلیم میں متضاد عناصر کی آمیزش اصولی حیثیت سے غلط ہے۔

ثانیاً، اسلامی مفاد کے لیے بھی ایسی آمیزش کسی طرح مفید نہیں خواہ وہ اس قسم کی غیر مساوی آمیزش ہو جیسی اب تک ہی ہے، یا مساوی کر دی جائے، جیسا کہ اب کہنے کا خیال کیا جا رہا ہے۔

ان امور کی توضیح کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسی اب کیا

ہونی چاہیے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہر یونیورسٹی کسی نہ کسی کلچر کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی محدود تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت خالی ہو، نہ آج تک دنیا کی کسی درگاہ میں دی گئی ہے نہ آج دی جا رہی ہے۔ ہر دوسرے گاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور خاص صورت میں ہوتی ہے اور اس رنگ و صورت کا انتخاب پورے غور و فکر کے بعد اس مخصوص کلچر کی مناسبت سے

کیا داتا ہے جس کی خدمت وہ کرتا چاہتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ کی یونیورسٹی کس کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی ہے؟ اگر وہ مغربی کلچر ہے تو اس کو مسلم یونیورسٹی نہ کہئے، نہ اس میں دینیات کا ایک نصاب لکھ کر خواہ فحشاء طلب علموں کی ہنسی شکش میں مبتلا کیجیے۔ اور اگر وہ اسلامی کلچر ہے تو آپ کو اپنی یونیورسٹی کی پوری ساخت بدلی بیٹھے گی اور اس کی سیٹنگ ترکیبی کو ایسے طرز پر ڈھالنا ہوگا کہ وہ بحیثیت مجموعی اس کلچر کے مزاج اور اس کی اسپرٹ کے مناسب ہو، اور نہ صرف اس کا تحفظ کہے، بلکہ اس کو آگے بڑھانے کے لیے ایک اچھی طاقت بن جائے۔

جیسا کہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں، موجودہ حالت میں تو آپ کی یونیورسٹی اسلامی کلچر کی نہیں بلکہ مغربی کلچر کی خادم بنی ہوئی ہے۔ اس حالت میں اگر صرف اتنا تغیر کیا جائے کہ دینیات کے موجودہ نصاب بدل کر زیادہ طاقت ور کر دیا جائے اور تعلیم و تربیت کے باقی تمام شعبوں میں پوری مغربیت برقرار رہے تو اس سے بھی یہ درسگاہ اسلامی کلچر کی خادم نہیں بن سکتی۔ اسلام کی حقیقت پر غور کرنے سے یہ بات خود بخود آپ کی ہنکشت ہو جائے گی کہ دنیوی تعلیم و تربیت اور دینی تعلیم کو الگ کرنا اور ایک دوسرے سے مختلف لکھ کر ان دونوں کو یکجا جمع کر دینا بالکل لاعمل ہے۔ اسلام، مسیحیت کی طرح کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جس کا دین دنیا سے الگ کوئی چیز ہو۔ وہ دنیا کو دنیا والوں کے لیے چھوڑ کر صرف اعتقادیات اور اخلاقیات کی تہ تک اپنے دائرے کو محدود نہیں رکھتا۔ اس لیے مسیحی دینیات کی طرح اسلام کے دینیات کو دنیویات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کا اصل مقصد ان کو دنیا میں رہنے اور دنیا کے معاملات انجام دینے کے لیے ایک ایسے طریقہ پر تیار کرنا ہے جو اس زندگی سے لے کر آخرت کی زندگی تک سلامتی عزت اور برتری کا طریقہ ہے۔ اس غرض کے لئے وہ سبکی نظر و فکر کو درست کرتا ہے۔ اس کے اخلاق کو سنوارتا ہے۔ اس کی سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس کے لیے حقوق و ذرائع معین کرتا ہے۔ اور اس کا اجتماعی زندگی کا ایک خاص نظام وضع کر کے دیتا ہے۔ افراد کی ذہنی و عملی تربیت، سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم اور زندگی

کے تمام شعبوں کی ترتیب تبدیل کے باب میں اس کے اصول و ضوابط سب سے الگ ہیں۔ انہی کی بدولت اسلامی تہذیب ایک جداگانہ تہذیب کی شکل اختیار کرتی ہے اور مسلمان قوم کا بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہنا انہی کی پابندی پر منحصر ہے۔ پس جب حال یہ ہے تو اسلامی دینیات کی اصطلاح ہی بے معنی ہو جاتی ہے اگر زندگی اور اس کے معاملات اس کا ربط باقی نہ رہے۔ اسلامی کلچر کے لیے وہ عالم دین بے کار ہے جو اسلام کے عقائد اور اصول سے واقف ہے مگر ان کو علم و عمل کے میدان میں بڑھنا اور زندگی کے دائم التغیر احوال و مسائل میں ان کو برتنا نہیں جانتا۔ اسی طرح اس کلچر کے لیے وہ عالم دنیا بھی بے کار ہے جو دل میں تو اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے مگر دماغ سے غیر اسلامی طریق پر سوچتا ہے معاملات کو غیر اسلامی نظر سے دیکھتا ہے اور زندگی کو غیر اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے زوال اور اسلامی نظام تمدن کی ابتری کا اصلی سبب یہی ہے کہ ایک مدت سے ہماری قوم میں صرف انہی دو قسموں کے عالم پیدا ہو رہے ہیں اور دنیوی علم و عمل سے علم دین کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلامی کلچر پھر جان بوجھے اور زمانہ کے پیچھے چلنے کے بجائے آگے چلنے لگے، تو اس ٹوٹے ہوئے ربط کو پھر قائم کیجیے۔ مگر اس کو قائم کرنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ دینیات کے نصاب کو تنہا تعلیمی کی گردن کا فلابدہ یا کمزور کا پشت بنا دیا جائے۔ نہیں۔ اس کو پورے نظام تعلیم و تربیت میں اس طرح اتار دیجیے کہ وہ اس کا دوران خون اس کی روح رواں اس کی بنیادی وساعت اس کا احساس اور اک اس کا شعور و فکر بن جائے۔ اور مغربی علوم و فنون کے تمام صلح اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا جز بنا چلا جائے۔ اس طرح آپ یہاں فلسفی مسلمان سائنس دان مسلمان ماہرین معاشیات مسلمان مقنن مسلمان مدبرین غرض تمام علوم و فنون کے مسلمان ماہر پیدا کر سکیں گے جو زندگی کے مسائل کو اسلامی نقطہ نظر سے حل کریں گے۔ تہذیب حاضر کے ترقی یافتہ اسباب و مسائل سے تہذیب اسلامی کی خدمت لیں گے، اور اسلام کے افکار و نظریات اور قوانین حیات کو روح عصری کے لحاظ سے از سر نو مرتب کریں گے۔ یہاں تک کہ اسلام از سر نو علم

عمل کے ہر میدان میں اسی امامت و رہنمائی کے مقام پر آجائے گا جس کے لیے وہ حقیقتِ نیا میں بھیجا گیا ہے۔

یہ ہے وہ تخیل جو مسلمانوں کی جدید تعلیمی پالیسی کا اساسی تخیل ہونا چاہئے۔ زمانہ اس مقام سے بہت آگے نکل چکا ہے جہاں سرسید ہم کو چھوڑ گئے تھے۔ اگر اب زیادہ عرصہ تک ہم اس پر قائم رہے تو بحیثیت ایک مسلم قوم کے ہمارا ترقی کرنا تو درکنار زندہ رہنا بھی مشکل ہے

(۲۱)

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اوپر جس تعلیمی پالیسی کا بیوٹی میں نے پیش کیا ہے اس کو صورت کا لباس کس طرح پہنایا جاسکتا ہے۔

۱۱) مسلم یونیورسٹی کے صُودوس "فرگیت" کا کئی ہتھیال کر دینا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم اپنی قومی تہذیب کو اپنے ہاتھوں قتل کرنا نہیں چاہتے، تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی نئی نسلوں میں "فرگیت" کے ان روزافزون رجحانات کا سدباب کریں۔ یہ رجحانات دراصل غلامانہ ذہنیت اور بھپی ہوئی ذنات Inferiority Complex کی پیداوار ہیں۔ پھر جب ان کا عملی طور لباس معاشرت، آداب اطوار اور بحیثیت

مجموعی دپے اجتماعی ماحول میں تہے تو یہ ظاہر اور باطن دونوں طرف سے نفس کا احاطہ کر لیتے ہیں، اور اس میں شرف قومی کا رتبہ برابر احساس بھی نہیں چھوڑتے۔ ایسے حالات میں اسلامی تہذیب کا زندہ رہنا قطعی ناممکن ہے۔ کوئی تہذیب محض اپنے اصولوں اور اپنے اساسی تصورات کے مجرد ذہنی وجود سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ عملی رہنما و سہارا ہوتی ہے اور اسی سے نشوونما پاتی ہے۔ اگر عملی رہنما و مقفود ہو جائے تو تہذیب اپنی طبعی موت مرتبہ گی، اور اس کا ذہنی وجود بھی برقرار نہ رہ سکے گا۔ پس سب سے مقدم اصلاح یہ ہے کہ یونیورسٹی میں ایک زندہ اسلامی ماحول پیدا کیا جائے۔ آپ کی تربیت ایسی ہونی چاہئے جو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی قومی تہذیب پر فخر کرنا سکھائے ان میں اپنی قومی خصوصیات کا احترام بلکہ عشق پیدا کرے، ان میں اسلامی اخلاق

اور اسلامی سیرت کی رُوح پھونک دے۔ ان کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے علم اور اپنی تربیت یافتہ ذہنی صلاحیتوں سے اپنے قومی تمدن کو شائستگی کے بلند مدارج کی طرف لے چلیں۔

(۲۱) اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کا انحصار بڑی حد تک متعلمین کے علم و عمل پر ہے جو معلم خود اس رُوح خالی میں، بلکہ خیال اور عمل دونوں میں اس کے مخالفت میں ان کے زیر اثر رہ کر متعلمین میں اسلامی اسپرٹ کیسے پیدا ہو سکتی ہے، آپ محض عمارت کا نقشہ بنا سکتے ہیں مگر اصلی عمارت آپ نہیں آپ کے تعلیمی اسٹاف کے ارکان ہیں۔ ”ذکیٰ مٹارو“ نے یہ امید رکھنا کہ وہ اسلامی طرز تعمیر عمارت بنا دیں گے کر لیے کی بیل سے خوشہ انگور کی امید کھنا۔ محض دینیات کے لیے چند نوٹوں کی رکھ لینا ایسی صورت میں بالکل فضول ہوگا جبکہ دوسرے تمام یا اکثر علوم کے چھٹا دلے غیر مسلم یا ایسے مسلمان ہوں جن کے خیالات غیر اسلامی ہوں۔ کیونکہ وہ زندگی اور اس کے مسائل اور معاملات کے متعلق طلبہ کے نظریات اور تصورات کو اسلام کے مرکز سے پھیر دیں گے اور اس زہر کا تریاق محض دینیات کے کورس فراہم نہ ہو سکے گا۔ لہذا خواہ کوئی فن، ہنر، فلسفہ، ہو یا سائنس، معاشیات ہو یا قانون، تاریخ ہو یا کوئی اور علم، مسلم یونیورسٹی میں اس کی پروفیسری کے لیے کسی شخص کا محض ماہر فن ہونا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پورا اور پکا مسلمان ہو۔ اگر مخصوص حالات میں کسی غیر مسلم ماہر فن کی خدمات حاصل کرنی پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن عام قاعدہ یہی ہونا چاہیے کہ ہماری یونیورسٹی کے پروفیسر وہ لوگ ہوں جن اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ یونیورسٹی کے اساسی مقصد یعنی اسلامی کچر کے لیے خیالات اور اعمال دونوں کے لحاظ سے مفید ہوں۔

(۳۱) یونیورسٹی کی تعلیم میں عربی زبان کو بطور ایک لازمی زبان کے شریک کیا جائے۔ یہ ہماری کلچر کی زبان ہے اسلام کے مآخذ اصیلہ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے جب تک مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ قرآن اور سنت تک بلا واسطہ و مترس حاصل نہ کر لیا اسلام کی رُوح کو نہ پاسکے گا، نہ اسلام میں بصیرت حاصل کر سکے گا۔ وہ ہمیشہ مترجموں اور شارحوں کا محتاج رہے گا، اور اس طرح آفتاب کی روشنی اس کو براہ راست آفتاب سے کبھی نہ مل سکے گی، بلکہ مختلف قسم کے رنگین آئینوں کے واسطے ہی سے ملتی رہے گی۔ آج ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اسلامی مسائل میں ایسی

ایسی غلطیاں کر رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی انجیز تک سے ناواقف ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ قرآن اور سنت سے استفادہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے۔ آگے چل کر پراونشل آٹانومی کے دور میں جب ہندوستان کی مجالس منفذہ کو قانون سازی کے زیادہ وسیع اختیارات حاصل ہو گئے اور سوشل ریفارم کے لیے نئے نئے قوانین بنائے جانے لگیں گے اس وقت اگر مسلمانوں کی نمائندگی ایسے لوگ کرتے رہے جو اسلام سے ناواقف ہوں اور اخلاق معاشرت اور قانون کے مغربی تصورات پر اعتقاد رکھتے ہوں تو جدید قانون سازی سے مسلمانوں میں سوشل ریفارم ہونے کے بجائے اٹلی سوشل ڈی فارم ہوگی اور مسلمانوں کا اجتماعی نظام اپنے اصولوں اور زیادہ دور ہوتا چلا جائے گا۔ پس عربی زبان کے مسئلہ کو محض ایک زبان مسئلہ نہ سمجھیے بلکہ یونٹس کی یہ آپ کی یونیورسٹی کے اساسی مقصد سے تعلق رکھتا ہے اور جو چیز اساسیات fundamentals سے تعلق رکھتی ہو اس کے لیے سہولت کا لحاظ نہیں کیا جاتا، بلکہ ہر حال میں اسکی جگہ نکالنی پڑتی ہے۔

(۴) اٹلی اسکول کی تعلیم میں طلبہ کو حسب ذیل مضامین کی ابتدائی معلومات حاصل ہونی چاہئیں :-

الف - عقائد - اس مضمون میں عفت مذکی خشک کلامی تفصیلات نہ ہونی چاہئیں بلکہ ایمانیات کو ذہن نشین کرنے کے لیے نہایت لطیف انداز بیان اختیار کرنا چاہیے جو فطری وجدان اور عقل کو اپیل کرنے والا ہو۔

طلبہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام ایمانیات و سہل کائنات کی بنیادی صدائیں ہیں اور یہ صدائیں ہماری زندگی سے ایک گہرا ربط رکھتی ہیں۔

ب - اسلامی اخلاق - اس مضمون میں مجرد اخلاقی تصورات نہ پیش کیے جائیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ایسے واقعات لے کر جمع کیے جائیں جن سے طلبہ کو معلوم ہو کہ ایک مسلمان کے کیرکٹر کی خصوصیات کیا ہیں اور مسلمان کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔

ج۔ احکام فقہ۔ اس مضمون میں حقوق اسرار و حقوق العباد اور شخصی کردار کے متعلق اسلامی قانون کے ابتدائی اور ضروری احکام بیان کیے جائیں جن سے واقف ہونا ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر اس قسم کے جزئیات اس میں نہ ہونے چاہئیں جیسے ہماری فقہ کی پُرانی کتابوں میں آتے ہیں کہ مثلاً کوئیں میں چوہا لگا جائے تو کتنے ڈول نکالے جائیں۔ ان چیزوں کے بجائے عبادات اور احکام کی معنویت ان کی رُوح اور ان کے مصالح طلبہ کے ذہن نشین کرنے چاہئیں۔ اُن کو یہ بتانا چاہیے کہ اسلام تمہارے لیے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کیا پروگرام بناتا ہے اور یہ پروگرام کس طرح ایک صالح سوسائٹی کی تخلیق کرتا ہے۔

د۔ اسلامی تاریخ۔ یہ مضمون صرف سیرت رسول اور دور صحابہ تک محدود ہے۔ اس کے پڑھانے کی غرض یہ ہونی چاہیے کہ طلبہ اپنے مذہب اور اپنی قومیت کی اصل سے واقف ہو جائیں اور ان کے دلوں میں اسلامی جمہیت کا صحیح احساس پیدا ہو۔

د۔ عربیت۔ عربی زبان کا محض ابتدائی علم جو ادب ایک حد تک مناسبت پیدا کرتے۔  
س۔ قرآن۔ صرف اتنی استعداد کہ لڑکے کتاب اللہ کو روانی کے ساتھ پڑھ سکیں سادہ آیتوں کو کبھی تک سمجھ سکیں اور چند سوزنیں بھی ان کو یاد ہوں۔

۱۵۔ کالج کی تعلیم میں ایک نصاب علم ہونا چاہیے جو تمام طلبہ کو پڑھایا جائے۔ اس نصاب میں حسب ذیل مضامین ہونے چاہئیں۔

الف۔ عربیت۔ انٹرمیڈیٹ میں عربی ادب کی متوسط تعلیم ہو۔ بی اے میں پہنچ کر اس مضمون کو تعلیم قرآن کے ساتھ ضم کر دیا جائے۔

ب۔ قرآن۔ انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کو فقہ قرآن کے لیے مستعد کیا جائے۔ اس مرحلہ میں صرف چند مقامات ذہن نشین کرانے چاہئیں۔ قرآن کا محفوظ اور تاریخی حیثیت سے معتبر ترین کتاب ہونا۔

کا دھی آتی ہوتا۔ تمام مذاہب کی اساسی کتابوں کے مقابلہ میں اسکی فضیلت، اسکی بے نظیر تعلیم، اسکی اثرات نہ صرف عرب پر بلکہ تمام دنیا کے افکار اور قوانین حیات پر اس کا انداز بیان طرز استدلال، اس کا حقیقی مدعا) Thesis

بی۔ اے میں مہل قرآن کی تعلیم دی جائے۔ یہاں طرز تعلیم یہ ہونا چاہئے کہ طلبہ خود قرآن کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کریں اور استاد ان کی مشکلات کو حل اور ان کے شبہات کو رفع کرتا جائے۔ اگر مفصل تفسیر اور جزئی بحثوں سے اجتناب ہو اور صرف مطالب کی توضیح پر اکتفا کیا جائے تو دو سال میں بآسانی پورا قرآن پڑھا جاسکتا ہے۔ حج۔ تعلیمات اسلامی۔ اس مضمون میں طلبہ کو پورے نظام اسلامی سے روشناس کرا دیا جائے۔ اسلام کی بنیاد کن اساسی تصورات پر قائم ہے، ان تصورات کی بنا پر وہ اخلاق اور سیرت کی تشکیل کس طرح کرتا ہے۔ پھر اس سوسائٹی کی زندگی کو وہ معاشرت معیشت سیاست اور بین الاقوامی تعلقات میں کن اصولوں پر منظم کرتا ہے۔ اس کے اجتماعی نظام میں فرد اور جماعت کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم کس ٹھونگ پر کی گئی ہے۔ حدود و اللہ کیا ہیں۔ ان حدود کے اندر مسلمان کو کس حد تک فکر و عمل کی آزادی حاصل ہے اور ان حدود کے باوجود ہم کھانے سے نظام اسلامی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ تمام امور معجزات کے ساتھ ایک نصاب میں لائے جائیں اور اس کو چار سال کے مابین تعلیمی پرایک سلسلہ کے ساتھ تقسیم کر دیا جائے۔

۶۱) نصاب عام کے بعد علوم اسلامیہ کو تقسیم کیے مختلف علوم و فنون کی اختصاصی تعلیم میں پھیلا دیجیے اور ہر فن میں اسی فن کی مناسبت سے اسلام کی تعلیمات کو پیوست کیجیے مغربی علوم و فنون بجائے خود سب مفید ہیں اور اسلام کو ان میں سے کسی کے ساتھ بھی دشمنی نہیں بلکہ ایجا بایں یہ کموں گا کہ جہاں

تک حقائق علیہ کا تعلق ہے اسلام ان کا دوست ہے اور وہ اسلام کے دوست ہیں۔ شہنشاہی دراصل علم اور اسلام میں نہیں بلکہ مغربیت اور اسلام میں ہے۔ اکثر علوم میں اہل مغرب اپنے چند مخصوص اساسی تصورات بنیادی مفہومات (Hypotheses) نقطہائے آغاز Starting points اور زوایائے نظر رکھتے ہیں جو سچے خود ثابت شدہ حقائق نہیں ہیں بلکہ محض ان کے اپنے وجدانیات ہیں۔ وہ حقائق علیہ کو اپنے ان وجدانیات کے سانچہ میں ڈھالتے ہیں اور اس سانچے کی مناسبت سے ان کو مرتب کر کے ایک مخصوص نظام بنالیتے ہیں اسلام کی دشمنی دراصل انہی وجدانیات سے ہے وہ حقائق کا دشمن نہیں بلکہ اس وجدانی سانچے کا دشمن ہے جس میں ان حقائق کو ڈھالا اور مرتب کیا جاتا ہے۔ وہ خود اپنا ایک مرکزی تصور ایک زاویہ نظر ایک نقطہ آغاز فکر ایک وجدانی سانچہ رکھتا ہے جو اپنی اصل اور فطر کے اعتبار سے مغربی سانچوں کی عین ضد واقع ہوا ہے۔ اب سمجھ لیجئے کہ اسلامی نقطہ نظر سے مملات کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ مغربی علوم و فنون سے حقائق لیتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ آپ مغرب ہی سے اس کا وجدانی سانچہ بھی لے لیتے ہیں فلسفہ سائنس، تاریخ، قانون، سیاست، معاشیات اور دوسرے علمی شعبوں میں آپ خود ہی تو اپنے نوجوان اور خالی الذہن طلبہ کے دماغوں میں مغرب کے اساسی تصورات بٹھاتے ہیں ان کی نظر کا فوکس مغربی زاویہ نظر کے مطابق جاتے ہیں مغربی مفروضات کے مسمات بنتے ہیں استدلال و استشاد اور تحقیق و تمحیص کے لیے صرف ہی ایک نقطہ آغاز ان کو دیتے ہیں جو اہل مغرب کے اختیار کیا ہے اور تمام علمی حقائق اور مسائل کو اسی طرز پر مرتب کر کے ان کے ذہن میں اتار دیتے ہیں جس طرز پر اہل مغرب ان کو مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد آپ چاہتے ہیں کہ تنہا و دنیا کا شبہ انہیں مسلمان بنائے۔ یکس طرح ممکن ہے؟ وہ شعبہ دنیا کی اسکتا ہے جس میں موجود تصورات ہوں، حقائق علیہ اور مسائل حیات پر ان تصورات کا انطباق نہ ہو بلکہ طلبہ کے ذہن میں عملی معلومات کی ترتیب ان تصورات کے بالکل برعکس ہو؟ یہی گمراہی کا سرچشمہ ہے۔ اگر آپ گمراہی کا سبب باب کرنا چاہتے ہیں تو اس سرچشمہ کے مصدر پر پہنچ کر اس کا رخنہ چھید دیجیے اور تمام علمی شعبوں کو وہ نقطہ آغاز، وہ زاویہ نظر، وہ اساسی

اصول دیکھیے جو قرآن نے آپ کو دیے ہیں۔ جب اس جدانی سانچہ میں معلومات مرتب ہوں گی اور اس نظر سے کائنات اور زندگی کے مسائل کو حل کیا جائیگا تب آپ کے طیبہ سلم طلبہ نہیں گے اور آپ یہ کہہ سکیں گے کہ ہم نے ان میں اسلامی اسپرٹ پیدا کی۔ درنہ ایک شعبہ میں سلام اور باقی تمام شعبوں میں غیر سلام رکھ دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ آپ کے فارغ التحصیل طلبہ فلسفہ میں غیر مسلم سائنس میں غیر مسلم قانون میں غیر مسلم سیاسیات میں غیر مسلم فلسفہ تاریخ میں غیر مسلم معاشیات میں غیر مسلم ہوں گے اور ان کا اسلام محض چند اعتقادات اور چند مذہبی مہرم کی حد تک محدود رہ جائے گا۔

(۷) بی بی ایچ اور ایم ٹی ایچ کے امتحانات کو بند کر دیجیے نہ ان کی کوئی ضرورت کوئی فائدہ۔ جہاں تک علم اسلامیہ کے مخصوص شعبوں کا تعلق ہے ان میں سے ہر ایک شعبہ کو اسی کے حامل علم کے مغربی شعبہ کے انتہائی کورس میں نفل کر دیجیے۔ مثلاً فلسفہ میں حکمت اسلامیہ اور اسلامی فلسفہ کی تاریخ اور فلسفیانہ افکار کے ارتقاء میں مسلمانوں کا حصہ۔ تاریخ میں تاریخ اسلام اور اسلامی فلسفہ تاریخ۔ قانون میں اسلامی قانون کے اصول اور فقہ کے وہ ابواب جو معاملات سے متعلق ہیں۔ معاشیات میں اسلامی معاشیات کے اصول اور فقہ کے وہ حصے جو معاشی مسائل سے متعلق ہیں۔ سیاسیات میں اسلام کے نظریات سیاسی اور اسلامی سیاسیات کے نشو و ارتقا کی تاریخ اور دنیا کے سیاسی افکار کی ترقی میں اسلام کا حصہ۔ وقس علی ہذا۔

(۸) اس کورس کے بعد علوم اسلامیہ میں لیسرچ کے لیے ایک مستقل شعبہ ہونا چاہیے۔ مغربی یونیورسٹیوں کی طرح اعلیٰ درجہ کی علمی تحقیق پر سند فیلڈیٹ Doctorate دیا جائے۔ اس شعبہ میں ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو مجتہدین و مفتیوں کی تربیت پا کر نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے تمام دنیا کی تعلیمی و فکری رہنمائی کے لیے مستعد ہوں۔

(۳)

حصہ دوم میں جس طرح تعلیم کا خاکہ پیش کیا ہے وہ بظاہر ناقابل عمل معلوم ہوتا ہے لیکن میں کافی غور و غوص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ توجہ اور محنت اور صرف مال سے اس کو تدریجاً عمل میں لایا جاسکتا ہے۔

حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ آپ کسی راہ میں پہلا قدم اٹھاتے ہی منزل کے آخری نشان پر نہیں پہنچ سکتے۔ کام کی ابتدا کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپ کی تکمیل کا پورا سامان پہلے سے آپ کے پاس موجود ہو۔ ابھی تو آپ کو صرف عمارت کی بنیاد دکھنی ہے اور اُس کا سامان اس وقت فراہم ہو سکتا ہے۔ موجودہ نسل میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس طرز تعمیر پر بنیادیں کھ سکتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت سے جو نسل اٹھے گی وہ دیواریں اٹھانے کے قابل ہوگی۔ پھر تیسری نسل ایسی نکلتے گی جس کے ہاتھوں یہ کام انشاء اللہ پایہ تکمیل کو پہنچے گا جو درجہ کمال کم از کم تین نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد حاصل ہو سکتا ہے اس کو آج ہی حاصل کر لینا ممکن نہیں لیکن تیسری نسل میں عمارت کی تکمیل تب ہی ہو سکیگی کہ آپ آج اسکی بنیاد رکھ دیں۔ ورنہ اگر اس کے درجہ کمال کو اپنے سے دُور پار کر آپ نے آج سے اسکی ابتدا ہی نہ کی۔ حالانکہ ابتدا کرنے کے سبب آپ کے پاس موجود ہیں۔ تو یہ کام کبھی بجا نہ پائے گا۔

چونکہ میں اس اصلاحی اقدام کا مشورہ دے رہا ہوں اس لیے یہ بھی مہمل ہی فرض ہے کہ اس کو عمل میں لانے کی تدابیر بھی پیش کروں۔ اپنے بیان کے اس حصہ میں، میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس طرز تعلیم کی ابتدا کس طرح کی جاسکتی ہے۔ اور اس کے لیے قابل عمل تدبیریں کیا ہیں۔

(۱) ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے عقائد اسلامی اخلاق اور احکام شریعت کا ایک جامع کورس حال ہی میں سرکار نظام کے محکمہ تعلیمات نے تیار کر لیا ہے۔ اس کو ضروری ترمیم و اصلاح سے بہت کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ عربی زبان کی تعلیم قدیم طرز کی جو جس قدر ہولناکیں منگنی تھی احمدیہ کی کیفیت باقی نہیں رہی۔ اس کے یوحنا طریقیہ مصر شام اور خود ہندوستان میں ایسی نکل آئے ہیں جن سے باآسانی یہ زبان کھائی جاسکتی ہے ایک خاص کٹی ان لوگوں کی مقرر کی جائے جو عربی تعلیم کے جدید طریقوں میں علمی و عملی مہارت رکھتے ہیں اور ان کے مشورہ سے ایسا کورس تجویز کیا جائے جس میں زیادہ تر قرآن ہی کو عربی کی تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا ہو۔ اس طرح تعلیم قرآن کیلئے اگلی وقت نکالنے کی بھی ضرورت نہیں ہے گی اور ابتدا ہی سے طلبہ کو قرآن کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جائے گی۔

اسلامی تاریخ کے بکثرت رسلے اردو زبان میں لکھے جا چکے ہیں۔ ان کو جمع کر کے بنظر غور دیکھا جائے اور جو رسالے مفید پڑتے جائیں ان کو ابتدائی جماعتوں کے کورس میں داخل کر لیا جائے۔

مقدمہ لکھ دو نوں مضامین کے لیے روزانہ صرف ایک گھنٹہ کافی ہوگا۔ یہی اسلامی تاریخ تو یہ مضمون کوئی الگ وقت نہیں چاہتا۔ تاریخ کے عمومی نصاب میں اس قسم کیا جاسکتا ہے اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہائی سکول کی تعلیم کے موجودہ نظم میں کوئی زیادہ تغیر کرنے کی ضرورت پیش آئے گی بغیر کی ضرورت جو کچھ بھی ہے نصاب تعلیم، طرز تعلیم، تعلیمی سٹاف میں ہے۔ دینیات کی تدریس اور اس کے مدرس کا جو تصور آپ کے ذہن میں اب تک رہا ہے اس کو نکال دیجیے اس کے دو حصے رکھیں اور ان کے لیے ذہنیت اور ایسے نفسیات کو سمجھنے والے مدرس رکھیں، ان کو ایک نئی یا قاعدہ نصاب تعلیم دیجیے اور اس کے ساتھ ایسا ماحول پیدا کیجیے جس میں "اسلامیت" کے پیچ کو بالیدگی نصیب ہو سکے۔

(۲) کالج کے لیے نصاب عام کی جو تجویز میں نے پیش کی ہے اس کے تین اجزاء ہیں :-

الف۔ عربیت۔ (ب)۔ قرآن۔ (ج)۔ تعلیمات اسلامی۔

ان میں سے عربیت کو آپ ثانوی لازمی زبان کی حیثیت دیجیے۔ دوسری زبانوں میں کسی کی تعلیم اگر طلبہ حاصل کرنا چاہیں تو بیٹریس کے ذریعے سے حاصل کر سکتے ہیں بلکہ کالج میں جو زبان ذریعہ تعلیم ہے اس کے بعد صرف عربی زبان ہی لازمی ہونی چاہئے۔ اگر نصاب اچھا ہو اور پڑھانے والے آزمودہ کار ہوں تو انٹرمیڈیٹ کے دو سالوں میں طلبہ کے اندر اتنی استعداد پیدا کی جاسکتی ہے کہ وہ بی اے میں پہنچ کر قرآن کریم کی تعلیم خود قرآن کی زبان میں حاصل کر سکیں۔

قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرز جدید پر قرآن پڑھانے کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ وہ اپنے کچھ دیکھ کر انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کرے گا۔ پھر بی اے میں ان کو پورا قرآن اس طرح پڑھا دیا کہ وہ عربیت میں بھی کافی ترقی کر جائیں گے اور اسلام کی روح سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں گے۔

تعلیمات اسلامی کے لیے ایک جدید کتاب لکھوانے کی ضرورت ہے جو ان مقاصد پر حاوی ہو جن کی طرف میں نے حصہ دوم کے نمبر ۱۸ میں اشارہ کیا ہے کچھ عرصہ ہو کہ میں نے خود ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ایک کتاب اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کے عنوان سے لکھنی شروع کی تھی جس کے ابتدائی تین باب ”زجران لہستان“ میں محرم ۱۴۲۲ھ سے شعبان ۱۴۲۳ھ تک کے پرچوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اگر اس کو مفید سمجھا جائے تو میں اس کی تکمیل کر کے یونیورسٹی کی نذر کر دوں گا۔

ان مضامین کے لیے کالج کی تعلیم کے موجودہ نظم میں کسی تغیر کی ضرورت پیش آنے لگی ہو رعیت کے لیے وہی وقت کافی ہے جو آپ کے ہاں ثانوی زبان کے لیے ہے۔ قرآن اور تعلیمات اسلامیہ دونوں کے لیے باری باری سے وہی وقت کافی ہو سکتا ہے جو آپ کے ہاں نیابت کے لیے مقرر ہے۔

(۳) زیادہ تر شکل اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں پیش آنے لگی جسے میں نے حصہ دوم کے نمبر ۶ و ۷ میں پیش کیا ہے۔ اس کے حل کی تین صورتیں ہیں جن کو بتدریج اختیار کیا جاسکتا ہے۔

الف۔ ایسے پروفیسر تلاش کیے جائیں (اور وہ ناپید نہیں ہیں) جو علوم جدیدہ کے ماہر ہوں گے ساتھ قرآن اور سنت میں بھی بصیرت رکھتے ہوں جن میں اتنی اہلیت ہو کہ مغربی علوم کے حقائق کو ان کے نظریات اور ان کی وجدانی اساس سے الگ کر کے اسلامی اصول و نظریات کے مطابق مرتب کر سکیں۔

ب۔ اسلامی فلسفہ، قانون، اصول، قانون، فلسفہ، تشریح، سیاسیات، عمرانیات، معاشیات، تاریخ و فلسفہ، تاریخ وغیرہ کے متعلق عربی، اردو، انگریزی، جرمن اور فرنچ زبانوں میں جس قدر لٹریچر موجود ہے اسکی چھان بین کی جائے۔ جو کتابیں بعینہ لینے کے قابل ہوں ان کا انتخاب کر لیا جائے، اور جن کو اقتباس یا حذف و ترمیم کے ساتھ کارآمد بنایا جاسکتا ہو ان کو اسی طریق پر کام میں لایا جائے۔ اس شخص کے لیے اہل علم کی ایک خاص جمعیت مقرر کرنی ہوگی۔

ج۔ چند ایسے فضلاء کی خدمات حاصل کی جائیں جو مذکورہ بالا علوم پر جدید کتابیں تالیف کریں۔

خصوصیت کے ساتھ اصول فقہ، احکام فقہ، اسلامی معاشیات، اسلام کے اصول عمران اور حکمت قرآن پر جدید کتابیں لکھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ قدیم کتابیں اب درس و تدریس کے لیے کارآمد نہیں ہیں۔ ارباب اجتہاد کے لیے تو بلاشبہ ان میں بہت اچھا مواد مل سکتا ہے مگر ان کو جوں کا توں لے کر موجودہ زمانے کے طلبہ کو پڑھانا بالکل بے سود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سرمدت ان تینوں تدریسوں کو مقصد بدرجہ کمال حاصل نہ ہوگا جو ہمارے پیش نظر ہے۔ بلاشبہ اس تدریس جدید میں بہت کچھ نقصان پائے جائیں گے لیکن اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں یہ صحیح راستہ پر پہلا قدم ہوگا۔ اس میں جو کوتاہیاں رہ جائیں گی ان کو بعد کی نسلیں پورا کریں گی یہاں تک کہ ان کے تکمیلی ثمرات کم از کم پچاس برس بعد ظاہر ہوں گے۔

۴۱۔ اسلامی ریسرچ کا شعبہ قائم کرنے کا بھی موقع نہیں۔ اس کی نوبت چند سال بعد آئے گی اس لیے اس کے متعلق تجاویز پیش کرنا قبل از وقت ہے۔

۵۱۔ میری تجاویز میں ذوقی اختلافات کی گنجائش بہت کم ہے۔ تاہم اس باب میں علمائے شیعہ سے استصواب کر لیا جائے کہ وہ کس حد تک اس طرز تعلیم میں شیعہ طلبہ کو سنی طلبہ کے ساتھ رکھنا پسند کریں گے؟ اگر وہ چاہیں تو شیعہ طلبہ کے لیے خود کوئی اسکیم مرتب کریں مگر مناسب یہ ہوگا کہ جہاں تک ہو سکے تعلیم میں ذوقی اختلافات کو کم سے کم جگہ دی جائے اور مختلف فرقوں کی آئندہ نسلوں کو اسلام کے مشترک اصول و مبادی کے تحت تربیت کیا جائے۔

۶۱۔ سر محمد یعقوب کے اس خیال سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ وقتاً فوقتاً علماء و فضلا کو اہم مسائل پر بحث کرنے کے لیے دعوت دی جاتی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ علی گڑھ کو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام دنیا کے اسلام کا دماغی مرکز بنا دیا جائے۔ آپ کا برہندوستان کے علاوہ مصر، شام، ایران، ترکی اور یورپ کے مسلمان فضلا کو دعوت دیکھ کر وہ یہاں آکر اپنے خیالات، تجربات اور نتائج تحقیق سے ہمارے طلبہ میں روشنی فکرو روح حیات پیدا

کریں۔ اس قسم کے خطبات کافی معاوضہ دے کر کھولے جانے چاہئیں تاکہ وہ کافی وقت محنت اور غور و فکر کے ساتھ سمجھ سکیں اور ان کی اشاعت صرف یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے بلکہ عام تعلیم یافتہ پبلک ایجوکیشن فیلڈ (۱) اسلامی تعلیم کے لیے کسی ایکے بان کو مخصوص کرنا درست نہیں۔ اردو عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں کسی ایکے بان میں بھی اس وقت نصاب کے لیے کافی سامان موجود نہیں ہے۔ لہذا درست ان میں سے جس زبان میں بھی جو مفید چیز چلے اس کو اسی بان میں پڑھانا چاہئے۔ دینیات اور علوم اسلامیہ کے متعلمین کے لیے ہونے چاہئیں جو انگریزی اور عربی دونوں بان میں چلتے ہوں۔ ایک ہی ایک خاص آدمی صحیح معنوں میں دینیات نہیں پڑھ سکتا۔

میں اپنے بیان کی اس طوالت پر غور خواہ ہوں مگر اتنی تطویل تفصیل میرے لیے ناگزیر تھی کیونکہ میں بالکل ایک نئے راستہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں جس کے نشانات کو پہچاننے میں خود مجھے غور و فکر کے کئی سال صرف کئے پڑے ہیں۔ میں تمہارا اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ مسلمانوں کے مستقبل قومی وجود اور ان کی تہذیب کے زندہ رہنے کی ایک نئی صورت بحر اس کے نہیں ہے کہ ان کے طرز تعلیم و تربیت میں انقلاب پیدا کیا جائے اور وہ انقلاب ان خطوط پر مجموعی طور سے اس کے سامنے پیش کیے ہیں۔ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ ایک نئی جماعت ایسے لوگوں کی موجود ہے اور خود علی گڑھ میں ان کی کمی نہیں جو میرے ان خیالات کو ایک یونے کا خواب کہیں گے۔ اگر ایسا ہو تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔ پیچھے دیکھنے والوں نے آگے دیکھنے والوں کو اکثر دیوانہ ہی سمجھا ہے اور ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن جو کچھ میں آج دیکھ رہا ہوں چند سال بعد — شاید میری زندگی ہی میں — وہ اس کو چشم سر دیکھیں گے اور ان کو اس وقت اصلاح حال کی ضرورت محسوس ہوگی طبعاً خان سرور ہوگا اور تلافی مافات کے مواقع کم تر رہ جائیں گے۔

( ترجمان ہفت آں، جمادی الاخریٰ ۱۳۵۵ھ ستمبر ۱۹۳۶ء )

# مرض اور اس کا علاج

اسلام محض ایک عقیدہ نہیں ہے نہ وہ محض چند مذہبی اعمال اور رسوم کا مجموعہ ہے بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کے لیے ایک مفصل اسکیم ہے۔ اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے اصول و قواعد الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک ناقابل تقسیم مجموعہ بناتے ہیں جس کے اجزاء کا باہمی ربط بالکل ایسا ہی ہے جیسا ایک زندہ جسم کے اعضاء میں ہوتا ہے۔

آپ کسی زندہ آدمی کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیں آنکھیں اور کان اور زبان جدا کر دیں معدہ اور جگر نکالیں پھیپھڑے اور گرتے الگ کر دیں دماغ بھی پورا یا کچھ کم دبیش کا نہ سر سے خارج کر دیں اور بس ایک نل اس کے سینے میں رہنے دیں کیا یہ باقی ماندہ حصہ جسم زندہ رہ سکے گا؟ اور اگر زندہ بھی رہے تو کیا وہ کسی کام کا ہوگا؟

ایسا ہی حال اسلام کا بھی ہے عقائد اس کا قلب ہیں۔ وہ طریق فکر Attitude of mind

نظریات (View of life) مقصد زندگی اور معیارِ قدر (Standard of values) جو ان عقائد سے پیدا ہوتا ہے اس کا دماغ ہے۔ عبادات اس کے جوارح اور قوانم ہیں جن کے بل پر وہ کھڑا ہوتا ہے اور کام کرنا، معیشت، معاشرت، سیاست اور نظم اجتماعی کے تمام وہ اصول جو زندگی کے لیے اسلام نے پیش کیے ہیں وہ اس کے لیے معدے اور جگر اور دوسرے اعضاء سے رہیہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کو صحیح و سالم آنکھوں اور بے عیب کانوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ زمانے کے احوال و ظروف کی ٹھیک ٹھیک پورٹین دماغ نہ کی پہچان اور دماغ اس کے متعلق صحیح حکم لگائے اس کو اپنے قابو کی زبان درکار ہے تاکہ وہ اپنی خودی کا کام حق اٹھا کر رہے

اس کو پاک صاف فضا کی حاجت ہے جس میں وہ سانس لے سکے۔ اس کو طیب طاهر غذا مطلوب ہے جو اس کے معدے سے مناسبت کھتی ہو اور اچھا خون بنا سکے۔

اس پورے نظام میں اگرچہ قلب اپنی عقیدہ بہت اہمیت رکھتا ہے مگر اس کی اہمیت اسی لیے تو ہے کہ وہ تمام اعضاء و جوارح کو زندگی کی طاقت بخشتا ہے جب اکثر و بیشتر اعضا کٹ جائیں جسم سے خارج کر دیئے جائیں یا خراب ہو جائیں۔ تو اکیلا قلب تھوڑے بہت نپکے کچھ خستہ و بیمار اعضا کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟ اور اگر زندہ بھی ہے تو اس زندگی کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟

اب آپ غور فرمائیں کہ اس وقت آپ اپنی اسی ہندوستان کی دنیا میں اسلام کو کس حال میں دیکھ رہے ہیں قوانین اسلامی قریب فریبطل ہیں اخلاق میں معاشرت میں معیشت میں اور زندگی کے سارے معاملات میں اصول اسلامی کا نفاذ پانچ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے غیر اسلامی ماحول غیر اسلامی تربیت اور غیر اسلامی تعلیم نے دماغ کو کمیں بالکل اور کمیں کچھ کم و بیش غیر مسلم بنا دیا ہے۔ آنکھیں کھلتی ہیں مگر ان کا زاویہ نظر بدل گیا ہے کان سنتے ہیں مگر ان کے پردے متغیر ہو چکے ہیں زبان بولتی ہے مگر اس کی گویائی میں فرق آگیا ہے پھیپھڑوں کو صاف ہوا میسر نہیں کہ ایک ہر ہلی فضا چاروں طرف محیط ہے۔ معدہ کو پاک غذا یا ملتی کہ رزق کے خزانے مسموم ہو چکے عبادات جو اس جسم کے جوارح اور قوا میں قریب قریب ۶۰ فی صدی تو مفلوج ہیں اور چالیس فی صدی جو باقی ہیں بھی کوئی اثر نہیں کھا رہے ہیں۔ کیونکہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے ان کا تعلق باقی نہیں رہا۔ اسی لیے فالج کا مادہ ان میں پھیلنا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پورا اسلام ہے جو آپ کے سامنے ہے؟ کہتے ہی اعضا کٹ گئے۔ کہتے مفلوج ہو گئے۔ کہتے موجود ہیں مگر بیمار ہیں اور ٹھیک کام ہی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک قلب باقی ہے اور وہ خود بیمار ہو رہا ہے کیونکہ جس طرح وہ ان اعضا کو زندگی کی طاقت بخشتا تھا اسی طرح خود بھی تو ان سے طاقت حاصل کرتا تھا جب دماغ اور پھیپھڑوں اور معدہ و جگر سب کا فعل خراب ہو گیا تو قلب کیسے صحیح و سالم رہ سکتا

ہے؟ یہ محض اس زبردست قلب کی غیر معمولی طاقت ہے کہ نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ بچے کچھے اعضا کو بھی کئی کسی طرح چلاتا جا رہا ہے مگر کیا اس اعضاء پریدہ اسلام میں کوئی کشش ہو سکتی ہے کہ یہ اپنی طرف لوگوں کو کھینچے؟ کیا اس میں یہ طاقت ہے کہ ہندوستان کی زندگی میں اپنا کوئی اثر قائم کر سکے؟ بلکہ خاتم بن میں تو یہ پوچھوں گا کہ اس نوبت پر کیا یہ ان حوادث کے مقابلہ میں جن کا سیلاب روز افزوں تیزی کے ساتھ آ رہا ہے اپنے بقیۃ اعضاء کو مزید قطع و برید سے اور خود اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہے؟

اسی کا نتیجہ ہے کہ **يَنْحُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَقْوَامًا** کے برعکس اب خود مسلمانوں کے گروہ میں اسلام سے بغاوت و انحراف کی وبا پھیل رہی ہے۔ مسلمان ہندوستان میں اور اس کے اطراف و اکناف میں کہیں بھی نظام اسلامی اپنی پوری مشینری کے ساتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا کہ لوگ اس کے جمال و کمال کو دیکھیں اور درخت کو اس کے پھلوں سے بچا نہیں۔ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں وہ یہی اعضاء پریدہ اسلام ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ بس اسلام ہی ہے۔ اس کو دیکھ کر بعض تو علانیۃ کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمان نہیں بنیں۔ سے ایسے ہیں جو مسلمان محض سے بس انکار نہیں کئے باقی تمام باتیں ایسی کہتے ہیں کہ ان میں اور منکرین اسلام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ بہت سوکے دل پھر گئے ہیں مگر چونکہ ابھی صریح بغاوت برپا نہیں ہوئی ہے اس لیے وہ منافقت کے ساتھ مسلمانوں میں شامل ہیں اور بغاوت کے جرائم پھیلا رہے ہیں تاکہ جب عام بلوی شروع ہوجائے تب خود بھی اپنا جھنڈا لے کر کھڑے ہوں۔ کچھ لوگ صاف نہیں کہتے مگر ذہنی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ نئی قومیت اور نئی تہذیب میں جذب ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ کیونکہ یہ تو مجھ سے تم بے بیٹھے ہوئے خود تمہیں کوئی فائدہ پہنچا تا ہے اور نہ ان فوائد ہی سے متمتع ہونے دیتا ہے جو دوسروں میں مذہب نے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک اب مسئلہ کا صحیح حل یہ ہے کہ اسلام کا یا ضابطہ مثلاً کر ڈالا جائے وہ کہتے ہیں کہ صرف مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت و عمل کی حد تک مسلمان رہنا چاہئے باقی زندگی کا سارا پروگرام دی اختیار کر لینا چاہئے جو غیر مسلموں نے سکھایا ہے اور جس کو غیر مسلم اختیار کر رہے ہیں معلوم نہیں کہ یہ لوگ تو

دھوکے میں ہیں یا دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ یہ لوگ بھول گئے ہیں یا بھلائے ہیں کہ تمام معاملات زندگی میں غیر اسلامی نظریات اختیار کرنے اور غیر اسلامی اصول پر عمل موجد ہی عقائد اور نہ ہی حرکت و عمل قطعاً بے معنی ہو جاتے ہیں۔ نہ ان پر زیادہ مدت تک ایمان باقی رہ سکتا ہے اور نہ عمل جاری ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ عقائد اور عبادات تو وہ بنیادیں ہیں جن کو اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ زندگی کی پوری عمارت ان کتبیر ہو جب عمارت دوسری بنیادوں پر تعمیر ہو گئی تو ان آثار قدیمہ سے بے فائدہ و بے ضرورت و بچی کب تک باقی رہ سکیگی؟ نئے نظام زندگی میں جو بچہ پرورش پا کر جوان ہو گا وہ پوچھ کا کہ چند اہل عقیدوں اور چند بے تجربہ کموں کا یہ قادمہ کیوں سیکر گئے ہیں؟ ال رکھا ہے؟ میں کیوں اس قرآن کو پڑھوں اور کیوں اس ایمان رکھوں جس کے سارے احکام اسے کار ہو چکے ہیں؟ ہمارے تیرے سویرے چوائیک انسان گذر چکا ہے آج اس کو میں کس لیے خدا کا رسول مانوں؟ جب اس زندگی میں وہ میری رہنمائی ہی نہیں کرتا تو محض اسکی رسالت تسلیم کر لینے سے فائدہ کیا اور نہ تسلیم کرنے سے نقصان کیا؟ یہ نظام جیتا جن میں عمل کر رہا ہوں اس میں غا پرٹھنے اور نہ پڑھنے، روزہ رکھنے اور نہ رکھنے سے کیا فرق واقع ہو جاتا ہے؟ کیا رابطہ ہے ان اعمال اور اس زندگی کے درمیان؟ یہ بے حور پیوند میری زندگی میں آخر کیوں لگا ہے؟

یہ منطقی نتیجہ ہے دین اور دنیا کی علیحدگی کا اور جب یہ علیحدگی اصولاً اور عملاً مکمل ہو جائے گی تو نتیجہ رونما ہو کر رہے گا جس طرح نظام جسمانی سے الگ ہونے کے بعد قلب کا کار موجد ہے اسی طرح زندگی سے بے تعلق ہونے کے بعد عقائد اور عبادات کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی عقائد اور عبادات اسلامی زندگی کو قوت حیات دیتے ہیں اور اسلامی زندگی عقائد اور عبادات کو طاقت بہم پہنچاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ان دونوں میں ایک نہ نظام جسمانی کے اعضا کا ساتھ ملتا ہے جسے منقطع کر دینے کا لازمی نتیجہ دونوں کی موت ہے غیر اسلامی زندگی میں اسلامی عقائد اور عبادات کا پیوند بالکل ایسا ہی ہو گا جیسے گوریلہ کے جسم میں ان فی دماغ اور انسانی دست چپا۔

یہ نہ سمجھیے کہ اسلام کی موجودہ حالت کا یہ اثر صرف نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے ایک مختصر گروہ پر ہی مرتب ہو رہا ہے۔ نہیں آج جو لوگ سچے دل سے مسلمان ہیں جن کے دلوں میں اس مذہب کی محبت اور عزت موجود ہے خوا

نئے گروہ کے لوگ ہوں یا پرانے گروہ کے ان سب پر کم و بیش ان حالات کا اثر پڑ رہا ہے۔ اسلامی نظام زندگی کا درہم برہم ہو جانا ایک عام مصیبت ہے جس کے طبی نتائج سے کوئی مسلمان بھی محفوظ نہیں ہے اور نہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہم سب کو اس میں سے حصہ مل رہا ہے۔ اور عامے علما و مشائخ بھی اس میں اتنے ہی حصہ دار ہیں جتنے مدرسوں اور کالجوں سے نکلے ہوئے لوگ۔

لیکن سب سے زیادہ خطرہ میں ہمارے وہ عوام ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں ۱۶ لاکھ مربع میل کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس صرف اسلام کا نام باقی ہے جس سے ان کو غیر معمولی بھرت ہے۔ یہ حقیقت سے بغیر سبب چیز ہے واقف ہیں جس پر یہ اس طرح جان لے رہے ہیں اور نہ علمی حیثیت سے کوئی ایسا نظام زندگی موجود ہے جو انہیں غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ ان کی جہالت سے قائد اٹھا کر گراد کرنے والا ان کے عقائد کو اور ان کی زندگی کو اسلام کی صراطِ مستقیم سے ہٹا سکتا ہے بس انہیں اطمینان لا دینا کافی ہے کہ یہ فضائل جو ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے یہی عین ہدایت ہے یا کم از کم اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ جس راستے پر چاہیں انہیں بھٹکائے جاسکتے ہیں خواہ وہ قادیانیت کا رستہ ہو یا اشتراکیت کا یا فسطائیت کا ان کے رد و افزوں افلاس اور ان کی ہولناک معاشی خستہ حالی نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں ان کو موجودہ تعلیمی کی حالت میں اصول اسلام کے مطابق حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ مسلمانوں میں کوئی منظم جماعت ایسی موجود نہیں جو اشتراکیت کے مقابلہ میں اسلام کے معاشی و تمدنی اصول کو لے کر اٹھے اور ان مسائل کو حل کر کے دکھائے جو عام لوگوں کے لیے فی الواقع بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کروڑوں مفلس فاقہ کش مسلمانوں کی یہ بھیڑ اشتراک کی مبلغین کے لیے نہایت سہل الحصول شکار بن گئی ہے۔ بورژوا طبقہ کے جن لوگوں میں حوصلہ مندی اور اقتدار کی حرص ذرا اعتدال سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے وہ ہمیشہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے نئی نئی تدبیریں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب ویسی انقلاب نے اس طبقہ کے ایک گروہ کو ایک اور تدبیر دکھا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسان اور مزدور کے حامی بن کر فز

عوام کو اپنے ہاتھ میں لیں، ان کے اندر خود غرضی حرص اور حسد کی آگ بھڑکائیں، ان کے جائز حقوق سے بڑھ کر انہیں دولت میں حصہ دلانے کا لالچ دلائیں، خوشحال طبقوں کی جائز دولت تک چھین کر ان میں تقسیم کر دینے کا وعدہ کریں، اور اس طرح ملک کے سوا دِ عظیم کو اپنی مٹھی میں لے کر وہ اقتدار حاصل کریں جو سرمایہ داری نظام کے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور کرورٹیٹیوں کو حاصل ہے۔ یہ لوگ غیر مسلم عوام سے بڑھ کر مسلم عوام سے توقعات رکھتے ہیں کیونکہ معاشی حیثیت سے مسلمان زیادہ فستہ حال ہیں۔ یہ ان کے دلوں پر قبضہ کرنے کے لیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں جس سے امیری اور غریبی مرقی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے۔ پھر جب بیچارہ بھوکا مسلمان دور دوٹیوں کی امید پر ان کی طرف دوڑتا ہے تو یہ اُسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں اور یہ جذبہ اس کے دل میں پیدا کرتے ہیں کہ دین اور ایمان کو فی چیز نہیں اصل چیز روٹی ہے، وہ جس طریقہ سے ملے وہی دین ہے اور اسی میں نجات ہے :-

”غریبوں و مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پڑا نانہہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان اس موجدہ افلاس اور رنگت سے چھٹکارا پالینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لئے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور فلاحی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب نہیں۔“

یہ ابتدائی سبق ہے مذہب، شکرانیت کا اور جس آن یہ سبق بیچا ہے جاہل و مفلس مسلمانوں کو دیا جاتا ہے اسی آن انہیں اس امر کا اطمینان بھی دلایا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مذہب کو ہاتھ نہیں لگاتے :-

”مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے زندہ تابدہ اور پائندہ ہی رہا ہے۔“

یہ دونوں فقر جو یہاں نقل کی گئی ہیں ایک مسلمان حصہ کے مفروضے یا خود ہیں ایک کثیر الاشاعت مسلم اخبار کے کالموں میں شائع ہوا ہے

گذشتہ ۲۰ سال کے اندر روسی اکثریت کے جو اثرات مسلمانانِ روس کی نوخیز نسلوں پر مترتب ہوئے ہیں وہ جاننے والوں کو پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہی مستقبل مسلمانانِ ہند کے سامنے بھی دکھایا دیتا ہوا آ رہا ہے۔ پیٹ کی آگ متاعِ ایمان کو خاکستر کرنے کے لئے بڑھ رہی ہے۔ ابھی تک سرچشمہ اٹنا چھوٹا ہے کہ اسے ایک سلامتی سے بند کیا جاسکتا ہے لیکن اگر غفلت کے چند سال یوں ہی گزاریے گئے تو یہ اتنا بڑا سیلاب بن جائے گا کہ اس کے مقابلے میں ہاتھیوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔

ان حالات میں محض عیسائی مشنریوں کے ڈھنگ پر اسلام کی تبلیغ کر دینا لا حاصل ہے۔ عقائد کی اصلاح کے لیے ایک سالہ نہیں ہزاروں سالے اگر لاکھوں کی تعداد میں بھی شائع کر دیتے جائیں تو یہ حالات روبرو نہیں آسکتے محض زبانِ اقدس سے اسلام کی خوبیوں کو بیان کرنے سے کیا فائدہ؟ ضرورت تو یہ ہے کہ ان خوبیوں کو واقعات کی دنیا میں سامنے لایا جائے۔ محض یہ کہہ دینے سے کہ اسلام کے اصولوں میں زندگی کے مسائل کا حل موجود ہے سارے مسائل خود بخود حل نہیں ہو جائیں گے۔ اسلام میں بالقوۃ جو کچھ موجود ہے اس کو بالفعل بنانے کی ضرورت ہے یہ دنیا کشمکش اور جدوجہد کی دنیا ہے۔ سبکی رفتار محض باتوں سے نہیں بدلی جاسکتی۔ اس کو بدلنے کے لیے انقلابِ دیگر جہاد کی ضرورت ہے، اگر اکثر کی اپنے غلط اصولوں کو لے کر نصف صدی کے اندر دنیا کے ایک بڑے حصہ میں اپنا اثر و اقتدار قائم کر سکتی ہیں اگر فاشیت اپنے غیر معتدل طریقوں کو لے کر دنیا پر اپنی دھاک بٹھا سکتی ہے اگر گاندھی کی ہما ایک غیر فطری چیز بننے کے باوجود محض جدوجہد کے بل پر فروغ پا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان جن کے پاس حق اور عدل کے غیر فانی اصول ہیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں اپنا سکھ نہ جما سکیں مگر یہ سکھ سے غلط و تلبیز سے نہیں جم سکتا۔ اس کے لیے سعی و عمل کی ضرورت ہے اور انہی طریقوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے جن سے سنتِ امد کے مطابق دنیا میں سکھ جاکر رہا ہے۔

انقلابِ دیگر جدوجہد ایک ہم لفظ جو اس کی علی صورتیں بہت سی ہیں اور بہت سی ہو سکتی ہیں جن میں تمام انقلابِ برپا کرنا مقصود ہو اس کے لیے وہی صورت اختیار کرنی پڑے گی جو اس انقلاب کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہو۔

ہم جو انقلاب چاہتے ہیں اس کے لیے ہمیں کوئی نئی صورت تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ انقلاب اس سے پہلے برپا ہو چکا ہے جس پاک انسان نے صلی اللہ علیہ وسلم پہلی مرتبہ انقلاب برپا کیا تھا، وہی اہل فطرت کو خوب جانتا تھا، اور اسی کے اقتدار کیے ہوئے طریقہ کی پیروی کہے آج بھی یہ انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ اُس پاک نبی کی سیرت ایک لحاظ سے مجروح ہے مگر دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے۔ وہ اخلاق، وہ تقویٰ، وہ حکمت، وہ عدالت، وہ طاقت و شخصیت، وہ انسانیت، کبریٰ کی غلیظ لاش ان خصوصیات ایک کوئی انسان کما لاسکتا ہے؟ اس لیے ایک کوئی انسان اتنا کمال درجہ کا انقلاب بھی کما ل برپا کر سکتا ہے؟ اس لحاظ سے وہ مجسم ہے اور قیامت تک کیے مجروح ہے لیکن اُس انسان کہنے جو نمونہ چھوڑا ہے اس کا طبعی فائدہ ہی انقلاب انگیزی ہے جس کی تعمیر سارٹھ تیرہ سو برس پہلے دنیا کے سامنے آچکی ہے، اس نمونہ کی جتنی زیادہ پیروی کی جائے گی اور جس قدر زیادہ اس سے مماثلت پیدا کی جائے گی اسی قدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج بھی ظاہر ہوں گے اور وہ اُس پہلے انقلاب اتنے ہی زیادہ اقرب ہوں گے جو اصل نمونہ کی طاقت سے برپا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسوہ ہے اور قیامت تک کے لیے اسوہ ہے۔ بیسویں صدی ہو یا چالیسویں صدی، ہندوستان ہو یا امریکی یاروس، جہاں اور جس وقت چاہیں آپ اپنی نوعیت کا انقلاب برپا کر سکتے ہیں بشرطیکہ اسی اسوہ حسنہ کو سامنے رکھ کر کام کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ سے سارٹھ تیرہ سو برس پہلے کی دنیا میں انقلاب برپا کیا تھا اسکی تفصیلات یہاں بیان کرتے کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ادارہ ”الاسلام“ کا تخیل اسی اسوہ پاک کے غائر مطالعہ سے پیدا ہوا ہے۔

آنحضرت جب مبعوث ہوئے تو دفعتاً زمین پر ایک شخص بھی مسلم نہ تھا۔ آپ نے اپنی دعوت دنیا کے سامنے پیش کی اور آہستہ آہستہ متفرق طور پر ایک ایک دو چار چار آدمی مسلمان ہوتے چلے گئے۔ یہ لوگ اگرچہ ہمارے زیادہ مضبوط ایمان رکھتے تھے اور ایسی فدویت ان کو اسلام کے ساتھ تھی کہ دنیا ان کی نظر پیش کرنے سے عاجز رہے مگر چونکہ متفرق تھے کفار کے درمیان گھرے ہوئے تھے بے بس اور کمزور تھے اس لیے اپنے ماحول کو ٹٹرتے رٹتے ان کے بارو

نہل ہو جاتے تھے اور پھر بھی وہ ان حالات کو نہ بدل سکتے تھے جن کو بدلنے کے لیے وہ اور ان کے ہادی مُرشد فداہ اتی واپی کوشش فرما رہے تھے۔ ۱۳ سال تک حضور اسی طرح جدوجہد کرتے رہے اور اس مدت میں سرفروش آل ایمان کی ایک نئی بھر جماعت اپنے ذہم کر لی۔ اس کے بعد امر نے دوسری تدبیر کی طرف آپ کی ہدایت فرمائی اور وہ تھی کہ ان سرفروشوں کو لیکر کفر کے ماحول سے نکل جائیں ایک جگہ ان کو جمع کر کے اسلامی ماحول پیدا کر لیں اسلام کا ایک گہ بنا لیں جہاں اسلامی زندگی کو پورا پروگرام نافذ ہو۔ ایک مرکز بنائیں جہاں مسلمانوں میں اجتماعی طاقت پیدا ہو۔

ایک ایسا پاور ہاؤس بنادیں جس میں تمام برقی طاقت ایک جگہ جمع ہو جائے اور پھر ایک مضبوط طریقہ سے وہ پنی شروع ہو یہاں تک کہ زمین کا گوشہ گوشہ اس سے منور ہو جائے۔ مدینہ طیبہ کی جانب آپ کی ہجرت اسی غرض کے لیے تھی۔ تمام مسلمان جو عرب کے مختلف قبیلوں میں منتشر تھے ان سب کو حکم دیا گیا کہ سب کو اس مرکز پر جمع ہو جائیں یہاں اسلام کو عمل کی صورت میں نافذ کر کے بنایا گیا۔ اس پاک ماحول میں پوری جماعت کو اسلامی زندگی کی ایسی تربیت دی گئی کہ ان جماعت کا ہر شخص ایک چلتا پھرتا اسلام بن گیا جسے دیکھ لینا ہی یہ معلوم کرنے کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور کس لیے آیا ہے۔ ان پر امر کا رنگ (صِبْغَةَ اللہِ وَمِنْ أَحْسَنُ مِنَ اللہِ صِبْغَةً) اتنا گہرا چڑھایا گیا کہ وہ جدوجہد میں دوسروں کا رنگ قبول کرنے کے بجائے اپنا رنگ دوسروں پر چڑھا دیں ان میں کیر کڑی اتنی طاقت پیدا کی گئی کہ وہ کسی سے مغلوب نہ ہوں اور حوان کے مقابلے میں آئے ان سے مغلوب ہو کر رہ جائے ان کی رگ رگ میں اسلامی زندگی کا نصب العین اس طرح پیوست کر دیا گیا کہ زندگی کے ہر عمل میں مقدم ہو اور باقی تمام دنیوی اغراض ثانوی درجہ میں ہوں۔ ان کو تعلیم اور تربیت دونوں کے ذریعہ سے اس قابل بنادیا گیا کہ جہاں جائیں زندگی کے اسی پروگرام کو نافذ کر کے چھوڑیں جو قرآن و سنت سے انہیں دیا ہے اور ہر قسم کے بگڑے ہوئے حالات کو منقلب کر کے اسی کے مطابق ڈھال لیں۔

یہ حیرت انگیز تنظیم تھی جس کا ایک ایک جز گہرے مطالعہ اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ اس تنظیم میں کام کو چار بڑے شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا:۔

۱۱) ایک گروہ ایسے لوگوں کا تیار کیا جائے جو دین میں تقصیر حاصل کریں اور جن میں یہ ہمت پیدا ہو کہ لوگوں کو دین اور اس کے احکام بہترین طریقہ پر سمجھا سکیں۔ فَلَوْلَا فَدَرَسَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لَتَتَقَقَّطُوا فِي الْمَدِينِ وَلَيَذَنَّ رُؤَاؤُاهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ (التوبہ: ۱۵)

۱۲) کچھ لوگ ایسے تیار کیے جائیں جن کی زندگیاں اسلام کے نظام العمل کو قائم کرنے اور پھیلانے کی سعی و جدید کے لیے وقف ہوں۔ جماعت کا فرض ہے کہ ان کو سب معیشت سے بے نیاز کرے لیکن خود انہیں اس کی پروا نہ ہو۔ چاہے معیشت کا کوئی انتظام ہو یا نہ ہو بہر حال وہ اپنے دل کی لگن سے میسر ہوں اور ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کر کے اس کام میں لگے رہیں جو ان کی زندگی کا واحد نصیب العین ہے۔ وَلَتَكُنْ مِمَّنْ أَقْلًا يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱)

۱۳) پوری جماعت میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ ہر شخص اعلیٰ کلمہ اللہ کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھے وہ اپنے دنیا کے کاروبار چھوڑ دے مگر ہر کام میں یہ مقصد اس کے سامنے ہوتا۔ اجاڑی تجارت میں کسان اپنی زراعت میں صنایع اپنی پیشی کے کام میں ملازم اپنی ملازمت میں اس مقصد کو کبھی نہ بھولے۔ وہ ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھے کہ یہ سب کام صیغے کے لیے ہیں اور جتنا اس ایک کام کے لیے ہے۔ وہ زندگی کے جس دائرے میں بھی کام کرے اپنے اقوال و افعال اور اپنے اخلاق اور معاملات میں اسلام کے اصول کی پابندی کیسے اور جہاں نوبی فوائد میں اور اصول اسلام میں نقیض واقع ہو جائے وہاں فوائد پر لات مارے اور اصول کو ہاتھ سے دیکھ کر اسلام کی عزت کو بٹہ نہ لگائے۔ پھر وہ جتنا مال اور جتنا وقت اپنی ذاتی ضروریات سے بچا سکتا ہو اس کو اسلام کی خدمت میں صرف کرے اور ان لوگوں کا ہاتھ بٹاے جنہوں نے اپنی زندگیاں اس کام کے لیے وقف کی ہیں۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَكُنْتُمْ مَوَدَّةً لِلَّهِ (آل مؤمنین: ۱۱)

۱۴) باہر کے لوگوں کو موقع دیا جائے کہ دارالاسلام میں آئیں اور اس ماحول میں وہ کلام اللہ کا مطالعہ کریں۔ جہاں کی ساری زندگی اس کلام پاک کی عملی تفسیر ہے۔ کفر کے ماحول کی نسبت اسلام کے ماحول میں قرآن کو زیادہ

بہتر تھیں گے اور زیادہ گہرا اثر لے کر واپس جائیں گے۔ **وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ**  
**حَتَّىٰ يَمْلِكَ كَلَامَ اللَّهِ تَعَزَّ أَبْلَغُهُ مَا مَدَّهُ (التوبة: ۱)**

اس طرح صرف آٹھ برس کی قلیل مدت میں نیک کے اس سب سے بڑے ہادی بہتر کے مدینہ کے پاور ہاؤس  
 میں اتنی زبردست طاقت بھری کہ اس نے دیکھتے دیکھتے سائے عرب کو منور کر دیا اور پھر عرب سے نکل کر اس کی روشنی  
 پورے زمین پھیل گئی تھی کہ آج سائے تیرہ سو برس گئے ہیں مگر وہ پاور ہاؤس اب بھی طاقت خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔  
 خلافت راشدہ کے بعد جب نظام اسلامی میں بہت کچھ برمی پیدا ہو گئی تو صوفیائے اسلام نے بھی اسی طریقہ  
 کی پیروی میں جگہ جگہ خانقاہیں قائم کی تھیں۔ آج خانقاہ کا مفہوم اس قدر گر گیا ہے کہ یہ لفظ سنتے ہی انسان کے ذہن  
 میں ایک ایسی جگہ کا تصور آ جاتا ہے جہاں اور روشنی کا گزرنہ ہوا اور صدیوں تک جستی کا ورق نہ پلے بلکہ اصل میں یہ  
 خانقاہ بھی اسی نمونہ کی ایک نقل تھی جسے سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قائم کیا تھا صوفیائے کرام میں  
 یہ لہجہ ہی متعدد پاتے تھے ان کو بیرونی دنیا کے گندے احوال سے نکال کر کچھ مدت تک خانقاہ میں رکھتے تھے اور وہاں اعلیٰ درجہ  
 کی تربیت دیکر انہیں اسی کام کے لیے تیار کرتے تھے جس کے لیے مرشد اعظم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تیار کیا کرتے تھے۔  
 اب لوگ اسلامی طرز کا انقلاب پا کر ناچاہتے ہیں انکو پھر اسی طریقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے مگر ہم ہندوستان  
 سے نکل کر کہیں ایسی آزلو فضا نہیں پاسکتے جہاں مدینہ طیبہ کی طرح دارالاسلام بنایا جاسکے تو کم از کم ہم کو ایسی ملک  
 میں ایسی تربیت کا ہیں بنانی چاہئیں جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جاسے جہاں اخلاق اسلامی ہوں محاسن  
 اسلامی ہو اعلیٰ زندگی مسلمانوں کی ہو مگر دو پیش بر طرف اسلام اپنی نوج اور اپنی صورت کے ساتھ نمایاں ہو۔  
 جہاں کسی چیز کے صحیح ہونے کے لیے صرف یہ دلیل کافی ہو کہ خدا اور رسول نے اس کی اجازت دی ہے یا اس کا حکم دیا  
 ہے اور کسی چیز کا غلط ہونا صرف اس میں سے تسلیم کیا جائے کہ خدا اور رسول نے اس سے منع کیا ہے یا اسے نا پسند  
 کیا ہے جہاں بیناوت اور سرکشی کا ماحول، بغیر اسلامی فضا نہ ہو جس نے ہر طرف سے ہمارا احاطہ کر رکھا ہے جہاں  
 ہم کو کم از کم اتنا اختیار تو ہو کہ بیرونی اثرات میں سے جن کو ہم نوج اسلامی کے موافق پائیں صرف انہی کو داخل

ہفتے دیں اور جن کو منافی یا پس انداز کی زندگی پر مسلط ہونے اور اپنے دل و دماغ میں نفوذ کرنے سے روک سکیں۔ جہاں ہم کو ایسی فضا میسر کر کے کوسمان کی طرح سوچ سکیں مسلمان کی سی نظر اپنے اندر پیدا کر سکیں ان اسلامی صفات کو نشوونما دے سکیں جو اس راہِ کفر کی مسموم آبِ ہوا میں فنا ہوتی چلی جا رہی ہیں ان گندگیوں کو آلائشوں سے اپنی زندگی کو پاک کر سکیں جو غیر اسلامی ماحول میں نکلیں کھوٹے اور نشوونما پانے کی وجہ سے ہمارے افکار اور اعمال میں گھس گئی ہیں جن کا شعور تک بسا اوقات ہمیں نہیں ہوتا اور جن کو اگر ہم محسوس بھی کر لیتے ہیں تو ماحول کی طاقت اتنی جا بڑا قابض ثابت ہوتی ہے کہ باوجود کوشش کرنے کے ہم اپنے آپ کو ان سے نہیں بچا سکتے۔ اس قسم کی تربیت گاہوں میں ایسے لوگوں کو جمع کیا جائے جو سچے دل سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہوں اور وہاں ان کو صحیح تہذیب و تربیت دیکر اس خدمت کے لیے تیار کیا جائے وہاں کے کام کا نقشہ وہی ہو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کا نقشہ تھا۔ اسی طرح کام کو چار شعبوں پر تقسیم کیا جائے اور اسی طرح ہر شعبہ میں آدمیت کو اسلامیت کے سانچے میں ڈھانسنے کی تدبیر کی جائے۔

۱۱۔ ایک شعبہ ایسا ہو کہ جس میں علمی و درجہ کی علمی استعداد کے لوگ شامل ہوں ان میں سے جو لوگ علوم و دینیات میں سہ سگاہ رکھتے ہوں انہیں مغربی زبانوں سے اور علوم جدیدہ سے روشناس کیا جائے۔ اور جن حضرات نے علوم جدید کی تحصیل کی ہو انہیں عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جائے پھر یہ لوگ قرآن اور سنت کا گہرا مطالعہ کر کے دین میں تفقہ اور بصیرت حاصل کریں۔ اسکے بعد ان کے مختلف گروپ بنائے جائیں۔ ہر گروپ ایک ایک شعبہ علم کو میسر اس میں اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز پر مرتب کر کے زندگی کے جدید مسائل کو سمجھنے اور اصول اسلام کے مطابق ان کا حل تلاش کر کے علوم کی بنیاد میں جو منہوی نقطہ نظر ہو مست ہو گیا ہے اس کو نکال کر اسلام کے نقطہ نظر سے علوم کو از سر نو تدوین کرنے اور اپنی تحقیقات سے ایسا علاج شریعہ پر مبنی کر کے جو اسلام کی موافقت میں ایک ذہنی انقلاب پانے کے لیے طاقت رکھتا ہو۔

(۲) دوسرا شعبہ ایسا ہو جس میں خدمتِ اسلام کے لیے چھ کارکن تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ پاکیزہ خلاق

مضبوط سیرت و عین کے پتے اور اپنے نعلین کے لیے سب کچھ زبان کر دینے والے لوگ جو ایک بردست انقلابی پارٹی کی صورت میں نظم ہوں، جنکی زندگی سادہ و سادہ بن جائے، جو جن میں انضباط و نظم پایا جائے اور جنکی علی سیرت ٹیچہ مسلمان کی ہو یہ پارٹی اسلام کے اصولوں، ایک نئے اجتماعی نظام Social order اور ایک نئی تہذیب (Civilization) کی ترقی کا پرگرام لکھ لکھے اور عامہ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی نشین پر قابض ہو جائے تاکہ ظلم و جور کی حکومت کو عدل کی حکومت میں تبدیل کیا جاسکے۔

(۳۱) تیسرے شعبہ میں ایسے لوگ ہوں جو صرف تھوڑی مدت کے لیے تربیت گاہ میں نہ کر دیں، یا پابستے ہوں انہیں صحیح علم اور اخلاقی تربیت دیکر چھوڑ دیا جائے کہ جہاں چاہیں، میں مگر مسلمان کی طرح رہیں، جو سروس متاثر ہونے کے بجائے ان پر اپنا اثر ڈالیں۔ اپنے اصولوں میں سخت ہوں، اپنے عقائد میں مضبوط ہوں، بے مقصد زندگی نہ بسر کریں، ایک نعلین پر حال میں ان کے سامنے ہو، پاک طریقوں سے روزی کما لیں اور ان لوگوں کو ہر ممکن طریقہ سے مدد دے کیے تیار رہیں جو شعبہ خیرات کے تحت کام کر رہے ہوں۔ یہ ان کو مالی مدد بھی دیں، ان کے کاموں میں عملاً بھی شریک ہوں اور جہاں رہیں وہاں کی فضا کو انقلابی پارٹی کی موافقت میں تیار بھی کرتے رہیں۔

(۳۲) چوتھا شعبہ ایسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ہو جو محض عارضی طور پر تربیت گاہ میں آکر کچھ علمی استفادہ کرتا چاہیں یا وہاں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں۔ ان لوگوں کو ہر قسم کی سہولتیں ہم پہنچانی جائیں تاکہ وہ اسلام اور اسکی تعلیم کا گہرا نقش بن سکے اور پسند لائیں۔

یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے اس نظام کا جو ہمارے نزدیک اسلامی انقلاب بنانے کے لیے ایک ضروری مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے اس نظام کی کامیابی کا انحصار تمام تر اس پر ہے کہ یہ اپنی روح اور اپنے جوہر میں مدینہ طیبہ کے اس مثل نظام کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مماثلت پیدا کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مقدمہ کینیڈا تک پہنچا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور بنیادی قوت تمدن کی جس مرتبہ پر اسے توجہ دیتے ہیں اس مرتبہ پر وہ پس چلنے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں سارا

تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباع رسول و صحابہ سول کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہی اور اکثر دیندار لوگ غلطی میں اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک صرف صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ جیسا لباس پہنتے تھے ویسا ہی ہم پہنیں جو قسم کے کھانے وہ کھاتے تھے اسی قسم کے کھانے ہم بھی کھا میں، جیسا طرز معاشرت ان گھروں میں تھا بعینہ وہی طرز معاشرت ہمارا گھروں میں بھی ہو۔ تمدنی مہضات کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحرک و fossilised صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہوئے ہیں ان سب کو بھیجیر بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے ارد گرد ایک حصار کھینچ لیں جہی سر میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل نہ ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دو راخطاط کی کئی صدیوں دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر تسلط رہا ہو، حقیقت روح اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثار قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈراما بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں ہیما نیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد نہ یہاں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں ہے جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی ہے بلکہ اس کا بالکل برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے بھیر کر صحیح راستہ پر چلانے کی کوشش کرے وہ ہم کو غالب نہیں دیتا بلکہ روح دینا ہے اور چاہتا ہے کہ زمانہ ممکن کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں ان سب میں ہی روح بھرتے چلے جائیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے ہم کو ”خِیَاقَاتُہ“ جو بتایا گیا ہے تو یہ اس لیے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر Rear guard کی حیثیت سے لگے رہیں بلکہ ہمارا کام امامت زمانہ کی ہے ہم مقدمہ الجیش بننے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور ہمارا خِیَاقَاتُہ مومن کا راز اخْرُجْتَ لِلنَّاسِ میں پوشیدہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں کنی چاہی ہو یہ کہ انہوں نے قوانین طبی کو تو شرعی کے تحت تھم لے کر زمین میں صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزیوں کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قاب میں اسلامی تہذیب کی روح بچو کی اس وقت قہنی طبی تو قوتوں انسان کو دوسرے معاملہ ہو چکی تھی ان سب کو انہوں نے



# سید ترجمان القرآن ماحولہ

مترجمہ

## سید ابوالاعلیٰ مودودی

تمام ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی ماہوار رسالہ ہے۔ اس کا مقصد وحید اعلیٰ کلمۃ اللہ اور دعوت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ دُنیا میں جو افکار و تخیلات اور اصول تہذیب و تمدن پھیل رہے ہیں اُن پر قرآنی نقطہ نظر سے تنقید کرنا اور فلسفہ و سائنس، سیاست و معیشت، تمدن و معاشرت ہر چیز میں قرآن و سنت کے پیش کردہ اصولوں کی تشریح کرنا اور زمانہ جدید کے حالات پر ان اصولوں کو منطبق کرنا اس رسالہ کا خاص موضوع ہے۔

یہ رسالہ امت مسلمہ کو ایک نئی زندگی کی دعوت دیتا ہے اور اس کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ: ”اپنے دل اور دماغ کو مسلمان بناؤ۔ جاہلیت کے طریقے چھوڑ کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر چلو۔ قرآن کو لے کر اٹھو اور دُنیا میں غالب بن کر رہو۔“

یہ رسالہ ۱۹۳۳ء سے باقاعدہ نکل رہا ہے اور ملک کے مشہور رسالوں کی صفِ اول میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ پانچ روپے۔ نمونے کا پرچہ م۔

## یہ بخر رسالہ ترجمان القرآن لاہور

# الجهاد في الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خارا شگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب مروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلی میں اسوقت روح پہونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار نگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اڑھیا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈسنا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد حرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلہ کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کر لیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو ”الجهاد في الاسلام“ کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ مکتبہ لٹری

دفتر سہ ترجمان القرآن - لاہور









